محبتیں ادھوری سی

محمد ظہیر بدر

مقامِ دوست۔ مصطفےٰ ٹاؤن، لاہور

سن اشاعت: جولائی ۔ ۲۰۰۷ء

باراول: ایک ہزار

مقام اشاعت: مقام دوست، مصطفیٰ ٹاؤن، لاہور۔

مطبع: شبتاز، سکیننگ سروسز، شمع، لاہور۔

سرورق: نصیر احمد بلوچ

لے آؤٹ: ندیم اشرف

قیمت: ۳۰۔ درہم۔ (۳۰۰۔ روپے)

۲۵۔ درہم۔ (۲۰۰۔ روپے)

استحسان: پرویز اے خاں (قطر)

آصف چودھری (دبئی)

چند ادھوری باتیں

محمد حمید شاہد۔ اسلام آباد

اسرائیلی ادیب اے بی یہوشوا اور لبنانی ادیب الیاس خوری کے ایک ساتھ لئے گئے انٹرویو میں الیاس خوری نے ایک دلچسپ بات کہی تھی۔ کہ وہ جب اپنے نئے ناول کا اختتامی حصہ لکھ رہا تھا تو اس کے ناول کے کردار اس سے بضد تھے کہ تم انہیں اکیلے چھوڑ کر جنگ کی طرف نہیں جا سکتے۔ الیاس خوری کے مطابق اس نے بھی اپنا نیا ناول کو مکمل کر لیا تھا۔ تاہم وہ اپنے ناول کو لکھتے ہوئے اس کرداروں کی طرف اس طرح نہیں جا سکتا تھا جس طرح یہوشوا چلا گیا تھا۔ وہ اپنے مرکزی کرداروں کو اپنے ساتھ جنگ کے میدان میں لے گیا تھا کہ وہ خود جنگ کی مصیبت اور تباہی کو دیکھ سکیں۔ ظہیر بدر کے ساتھ بھی لگ بھگ الیاس خوری والا حادثہ ہوا ہے۔ اس نے ان ادھوری محبتوں کی کہانی لکھنا کا قصد باندھا تھا جنہیں وہ اپنے تئیں زندگی کا تلذذ سمجھتا رہا مگر اسے اپنی کہانی کے کرداروں کو قومی انتشار کے میدان کارزار میں لے جانا پڑا۔

ظہیر بدر کی اس کہانی میں ہر واقعہ بولتا ہوا آتا ہے بالکل یوں جیسے بندوق سے چلائی گئی گولی بولتی ہے یا پھر جیسے خبر بولتی ہے...... اپنے سارے حوالوں کے ساتھ...... فکشن کو یوں لکھنا کہ فیکٹس لکھنے والے کے اعصاب پر حاوی رہیں اور ان کے بیچ سے کہانی کے کرداروں کو اپنی شباہت اور قد کاٹھ کے ساتھ آگے بڑھائے چلے جانا بہت حوصلے کی بات ہوتی ہے۔ یہ حوصلہ ظہیر بدر کے پاس ہے لہذا اس کی کہانی میں پنجاب یونیورسٹی سے لے کر قومی سطح تک کی سیاست اور ہنگامے بہ سہولت سما گئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ناول کا ماحول تعمیر کرنے کے لیے جن سیاسی، ثقافتی، سماجی اور قومی شخصیات کو حوالے کے طور پر چنا گیا ہے ان کے نام ہماری تاریخ کے ماضی قریب کے باب کا حصہ ہیں۔ مجھے اس مقام پر یہ تسلیم کرنے میں کوئی تردد نہیں ہے کہ اس روش کو اپنانے میں ایک خدشہ تو یہ ہے فکشن پر تاریخ کا گمان ہونے لگتا ہے یا پھر کہانی کو خبر بننا پڑتا ہے۔ اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ یوں متن کی سطح پر تو واقعات کی خوب چہل پہل ہوتی ہے مگر جملوں میں دبازت

آتی ہے نہ کوئی ایسا باطنی نظام بن پاتا ہے جو معنی کی ایک اور سطح کو اجالتا چلا جائے۔ ظہیر بدر تخلیقی عمل کے اس بھید کو جانتا ہے لہذا اس نے قومی، ثقافتی اور ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ ادھوری محبتوں سے خوب خوب کام لے کر اپنے پڑھنے والوں کے دلوں کو گداز بنالیا ہے۔

صاحب، یہیں ایک قصہ یاد آتا ہے۔ یہ قصہ میں نے مایا کافسکی کے حوالے سے کہیں پڑھا تھا۔ کہتے ہیں وہ ماسکو کے ایک ایسے ہال میں اپنی شاعری سنا رہا تھا جو لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مایا کافسکی نے میلے کچیلے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن رکھے تھے لہذا اپنا کلام سناتے ہوئے اسے بار بار اپنی نیچے کو کھسک جانے والی پتلون بار بار اوپر کھینچنا پڑتی۔ سارا مجمع مایا کافسکی کے کلام میں محو تھا مگر ایک لڑکی کو اس کے بار بار پتلون اوپر کھینچنے پر الجھن ہو رہی تھی۔ اس کا دھیان کلام پر نہ رہا لہذا مایا کافسکی کو پکار کر کہا "تم اپنی پتلون بار بار اوپر کیوں کھینچتے ہو؟ مایا کافسکی نے اپنا کلام سناتے سناتے اسے جواب دیا "تو کیا تم چاہتی ہو کہ یہ نیچے گر پڑے؟" تو یوں ہے کہ وہ کردار جو اصلی ہیں، وہ اگر قارئین کے ایسے گروہ کو جس کا مزاج اسی لڑکی جیسا ہے، الجھانے لگیں تو اس طبقے کو جان لینا چاہیے کہ ان کرداروں کا وجود ہماری قومی زندگی کا ایسا میلا لبادہ ہے، جسے سہولت سے گرایا جاسکتا ہے نہ ڈھنگ سے قومی کمر پر جمایا جاسکتا ہے۔ ظہیر بدر نے مایا کافسکی کی طرح قومی زندگی کے میلے لبادے کو دھو کر اور اسے اپنی مرضی کا نیل اور کلف دے کر پہننے کی بجائے اسی طرح لیا ہے جیسا کہ وہ تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے فنکارانہ احتیاط سے اپنے موضوع کی تمام باریکیوں کو اجالنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔

جی، ظہیر کے جس قرینے کی میں بات کر رہا ہوں اس کا اندازہ وہاں بخوبی لگایا جاسکتا ہے، جہاں اس نے اپنے کرداروں کو اپنی مرضی اور سہولت سے تراشا ہے۔ کہانی کا آغاز نوازش اور نیلسن کے بھرپور کرداروں سے ہوتا ہے۔ یہ دونوں کردار آخر تک چلتے ہیں اور قاری کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اپنے اپنے مقام پر کئی دوسرے کردار اس بخت کے ساتھ آئے چلے جاتے ہیں جو ناول نگار نے ان کے لیے اپنے قلم سے لکھ دیا ہے۔ میڈم اولگا، وہ کہ جس نے زندگی بھر شادی نہیں کی تھی۔ نوازش کی بے نیازی سے گھائل ہونے والی بیورو کریٹ کی شوخ وشنگ لڑکی شاہدہ۔ یہ تو بعد میں کھلتا ہے کہ وہ کسی بیوروکریٹ کی بیٹی نہیں، ایک لو میرج کے بعد دو جسموں کے اتصال کا نتیجہ تھی۔ شدید محبت کرنے والے مگر بعد میں ایک دوسرے سے تنگ آ کر خودکشی کرنے والے۔ یونیورسٹی سے رسوا ہو کر نکل جانے والی بازار حسن کی نازاں، جسے بعدازاں نوازش نے

پڑھایا اور جس کی رانوں نے اسے اور طرح کی لذت پڑھائی ۔ وہ رابعہ جو نوازش کی زندگی میں داخل ہو کر بھی الگ رہی تھی یا پھر نصر اور سمیعہ کی وہ جوڑی جس کے اندر نیلسن سما گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ بعد ازاں سمیعہ کے مقدر میں مصنف نے موت لکھ کر کسی حد تک ادھوری رہ جانے والی محبتوں کے چلن کو بدلنا چاہا تھا۔ نائل اور سوشیل کے کردار ہوں یا غلام حسن کا وہ کردار جسے شراب نہ مار سکی مگر جسے نصیحتوں نے مار دیا تھا۔ پھر کہانی کے اندر ستاروں کی طرح یہاں وہاں جگمگ جگمگ کرنے والے چھوٹے چھوٹے کردار۔ تو یوں ہے کہ انہی کرداروں سے کہانی توانائی پاتی ہے اور کامیابی سے آگے بڑھتی ہے۔

یہاں نیلسن کے کردار کا الگ سے ذکر کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے کہ ایسے زندہ کردار سہولت سے نہیں تراشے جا سکتے ۔ جی میں اسی نیلسن کی بات کر رہا ہوں جس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس سے نوازش کو محبت ہو گئی تھی ۔ سانولی سلونی سی قاتلہ مگر جس کی محبت کو نوازش نے قتل کر دینا چاہا تھا۔ جب اس ناول کا ہیرو نیلسن سے اسلام قبول کر لینے کا مطالبہ کر رہا تھا تو منٹو کے افسانے ''دو قومیں'' کے دو کردار مختار اور شاردا میرے ذہن میں پوری طرح روشن ہو گئے تھے۔ منٹو کا مختار بھی ظہیر کے نوازش کی طرح اپنے گھر والوں کو راضی کرنے کے بعد اپنی محبوبہ کو اسلام قبول کرنے کا مشورہ دینے پہنچ گیا تھا۔ ظہیر کی نیلسن منٹو کی شاردا سے مذہب کے باب میں کہیں باوقار نکلی ۔ منٹو کی کہانی میں جب مختار نے شاردا سے مسلمان ہونے کا کہا تو اس نے ترت حساب چکا دیا تھا ''تم ہندو ہو جاؤ نا'' اور اسی بات پر دونوں کو اپنی اپنی محبت کے ساتھ الگ ہو جانا پڑا تھا۔ ظہیر کی کہانی یہیں سے مختلف ہو جاتی ہے۔ نیلسن کی محبت شاردا کے مقابلے میں بہت اعلیٰ درجے کی ہے۔ اعلیٰ، پختہ اور زیادہ بالغ نظر۔ تب ہی تو مذہب کا الجھیڑا نیلسن کے لیے تعجب ضرور بنا مگر اسے جھٹک دینا اس کے لیے مشکل نہ رہا تھا۔ وہ اس کے لیے مذہب تبدیل کرنے پر راضی ہو گئی تھی۔ ظہیر نے کہانی کے بہاؤ میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ اگر یہ کچھ نوازش کو کرنا پڑتا تو اس کا رویہ منٹو کے مختار جیسا ہی ہوتا۔

تو یوں ہے کہ منٹو کی کہانی جس نقطے پر ختم ہوئی تھی اور شاید اسی جذباتی خاتمے کی وجہ سے ایک کامیاب کہانی کا تاثر نہ چھوڑ سکی تھی وہیں سے ظہیر کی کہانی دامن بچا کر آگے بڑھ گئی۔ ظہیر بدر اس معاملے میں بہت کائیاں نکلا فوری فیصلے کی بجائے اس نے نوازش کو اس باب میں سوچنے کا وقت دیا یہاں تک کے اس کے دل میں کئی خدشوں نے سر اٹھا لیا۔ اس نے ایک لڑکی کو مسلمان کیا

تھا مگر یہ تفاخر اس کے اندر اطمینان نہ پیدا کرسکا تھا۔ وہ اندر سے ملول تھا۔ نیلسن نے اس کی بات مان لی تھی مگر جاتے جاتے اس کی چپ کے اندر سرسراتی سرد آہ نوازش تڑپا گئی۔ کئی روز تک رات کی تنہائیوں میں نیلسن کا چپ چہرہ اسے اس کے کئے پر، کہے پر خون کے آنسو رلاتا رہا۔ نیلسن کے اس غیر متوقع اور غیر معمولی ردعمل نے اس کی روح کو کئی ماہ تک اضطراب اور احساس گناہ میں مبتلا رکھا تھا۔ کہانی کا جبر دیکھئے کہ نوازش ابھی تک یہ سمجھ ہی نہ سکا تھا کہ نیلسن اسے جسمانی سطح پر چاہتی تھی یا روحانی سطح پر لہٰذا اسے یہ وسوسے ستائے جاتے تھے کہ جو لڑکی ایک جسمانی تلذذ کے لئے اپنے روحانی رشتوں کو ترک کر رہی تھی وہ کل کو کسی اور کے لئے اسے بھی ترک کرسکتی تھی۔

ماننا پڑے گا کہ ظہیر نے اس باب میں منٹو کی شاردا سے کہیں اعلیٰ کردار تراشا ہے اور کیا خوب محبت سے تراشا ہے۔ نیلسن کی محبت اور قربانی دونوں کی قدر نہ ہوئی مگر جب وقت آیا تو اس نے کلمہ پڑھ کر اپنا گردہ نوازش کو دان کر دیا کہ اس کے گردے کو اب ایک مسلمان کے جسم کا حصہ ہونا تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس کے بعد وہ کوئی احساس جتلائے بغیر، اور اپنی قربانی کی کوئی تختی لگائے بغیر اس کی زندگی سے الگ رہتی ہے۔ اس میں اپنے جذبوں کو تھامے رکھنے کا کتنا حوصلہ تھا اس کا اندازہ لگانا ہو تو کہانی کے آخری حصے میں پہنچئے وہاں جہاں نوازش اپنی زندگی کو ایک پورے انسان کی زندگی ہوتے ہوئے بھی ادھوری قرار دے رہا ہے اور اعتراف کر رہا ہے وہ نیلسن کے ہالۂ خیال سے نکل نہیں پایا جب کہ نیلسن کمال ضبط سے اپنے راستے کو الگ رکھتی ہے۔ اس کے اس طرز عمل نے میرے دل میں نیلسن کی توقیر بڑھا دی ہے۔

آخر میں مجھے کہنے دیجئے کہ یہ ادھوری محبتوں کی کہانی ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری قومی زندگی کے زوال کا نوحہ بھی ہے۔ ایسے اسلوب میں لکھا گیا نوحہ جس میں متعین مطالب کہیں بھی سطروں سے بے وفائی نہیں کرتے۔ کردار اپنی اپنی الگ سے شباہت بناتے اور پوری قامت پاتے ہیں۔ واقعات میں بہاؤ ہے، یہ بولتے ہوئے ہیں اور ان میں کہیں اکھاڑ پچھاڑ نہیں ہوتی۔ زمانی ترتیب آخر تک اپنی متعین دھج پر رہتی ہے۔ ہماری زندگیوں میں اندر تک دخیل ہونے والی محبت اور سیاست کو اس ناول میں بڑی ہوشیاری سے برتا گیا ہے۔ اسی تجزیاتی برتے پر مجھے اپنے اس یقین کا اظہار بھی کر لینے دیجئے کہ صاحب! ظہیر بدر کے اس ناول کو بہت قاری میسر آئیں گے۔

بیشک انسان کو احسن تقویم کے ساتھ پیدا کیا گیا۔۔۔۔۔۔۔(القرآن)

معلوم سے نامعلوم کا سفر

یہ پریوں کے پریوار کی کہانی نہیں۔ یہ اسی معاشرے کی کہانی ہے۔ جو۔۔ میں آپ اور وہ۔۔ سے عبارت ہے۔ چنانچہ اگر کہیں کوئی مطابقت پائی جائے تو کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ کہانی اور انسان کا معاملہ۔۔ من تو شدم تو من شدی۔۔ والا ہے۔

مرحبا شانِ حسنِ یکتائی
خود تماشا و خود تماشائی

اس کائنات کی پہلی کہانی آدم حوا کی کہانی تھی۔ جس طرح انسان سے انسان کے جنم کا سلسلہ چلا بعینہٖ کہانی سے کہانی جنم لیتی ہے۔ جو واقعات کے نئے نئے لباس پہن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ایک کہانی کے انجام سے دوسری کہانی آغاز ہوتی ہے۔

سرشتِ آدم اس ادھورے پن کی کہانی سناتی ہے۔ یہی زندگی کا تلذذ ہے۔ یہی وہ کشش ہے جو اسے جینے کا جواز فراہم کرتی ہے۔۔ یہی وہ تجسس اسے پیش دیوار دیکھنے کے بجائے پس دیوار دیکھنے پر اکساتا ہے۔ اسے معلوم سے نامعلوم کے سفر پر روانہ کرتا ہے۔ وہ لمحۂ موجود کے بجائے لمحۂ آئندہ میں رعنائیاں تلاش کرتا ہے۔۔۔۔۔ وہ حسن رسا کے بجائے کربِ نارسائی میں آسودگی تلاش کرتا ہے۔۔۔۔ انسان کی ہر سوچ اور ہر رشتہ۔۔۔۔ ہر جذبہ ادھورا ہے۔ کیونکہ وہ جزو ہے کل نہیں۔

محبت! ادھورے پن سے پورے پن کی طرف سفر کی محرک ہے جب یہ سفر پورا ہو جاتا ہے تو محبت کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے۔

اس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے
جیسے پانا ہی اسے اصل میں مر جانا ہے

رشتوں کا لباس پہن کر محبت کا دم گھٹ جاتا ہے۔ محبت مر جاتی ہے۔۔ اسی لئے وہ جینے کا جواز ادھورے پن میں ڈھونڈتا ہے۔ پوری محبت اس کی سرشت ہی میں نہیں۔ پوری محبت کا بوجھ وہ اٹھا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ رنگ تغیر سے نمو پانے والا یہ زمیں زادہ جانتا ہے کہ محبت پوری ہو کر اکتاہٹ بن جاتی ہے۔ پوری محبت پانے کے لئے اس پیکرِ خاکی کو پیراہن خاکی ترک کرنا پڑے گا۔۔۔ جزو کو اپنی ہستی کو تیاگ کر کل میں فنا ہونا پڑے گا۔

اس ناول میں اسی حقیقت کے اظہار کے لئے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بحث لایا گیا ہے۔ کیونکہ ناول معاشرے کا عکس ہوتا ہے۔

پیارے دوست۔۔ عہد جدید کے ثقہ نقاد اور ممتاز افسانہ نگار۔۔ محمد حمید شاہد کی مسلسل ترغیب اور ''خبر گیری'' نے مجھے ناول نگاری پر آمادہ کیا۔ مکرمی ڈاکٹر عبدالکریم خالد اور محترم احمد عقیل روبی کے اخلاص اور حوصلہ افزائی نے مجھے اعتبار اور اعتماد کی دولت سے نوازا۔

وہ سارا وقت جو تحریر و ترتیب پر صرف ہوا اس پر یقیناً پہلا حق میری نصف بہتر، سلمیٰ اور میری بیٹیوں۔۔ ڈاکٹر مدیحہ ظہیر، سیدہ نورلس ظہیر اور سیدہ رشنا ظہیر۔۔ کا تھا۔ شکریہ نہیں کہوں گا کہ میں اپنوں کی محبتوں کا مقروض رہ کر جینا پسند کرتا ہوں۔

آپ کی آراء اہم ہیں۔ ضرور دیجئے۔۔۔۔۔ آئندہ ایڈیشن میں شامل کی جائیں گی۔

محمد ظہیر بدر
جولائی۔ ۲۰۰۷ء
مقام دوست، ۱۱۲۔ ممدوٹ بلاک، مصطفیٰ ٹاؤن، لاہور۔
mzaheerbadar@hotmail.com

سلمیٰ

کے نام

جو

......شریکِ زندگی ہے

......رفیقِ سفر ہے

......اور سفر کا قرینہ بھی!!

دے دعا مجھ کو تشنہ کام رہوں
خواہشوں کی طرح دوام رہوں
میں کسی جسم پر بھی راج کروں
پر ترے لمس کا غلام رہوں

آشنا غم سے کسی طور تو ہونا تھا ہمیں
تم نہ ملتے تو کسی اور سے بچھڑے ہوتے

بی کام کا امتحان دینے کے بعد فراغت ہی فراغت تھی۔ نوازش کے والد نے اسے مشورہ دیا کہ وہ وائی ایم سی اے۔ میں شارٹ ہینڈ کا کورس کر لے۔ فارغ بیٹھنے سے تو بہر حال بہتر ہے۔ مگر نوازش کا خیال تھا کہ اسے لیکچرار بننا ہے کلرک یا سٹینو نہیں۔ اس لئے وہ معترض رہا مگر جب ابا نے کہا کہ یہ تو ہنر ہے۔ کلرک کی کوالیفکیشن نہیں ہے تو اسے قائل ہونا پڑا۔ چنانچہ اس نے YMCA میں شارٹ ہینڈ سیکھنے کے لئے داخلہ لے لیا۔

نیلسن سے اسکی دوستی یہیں ہوئی تھی۔ سانولی سلونی، تیکھے نینوں والی۔ نیلسن نے بھی گریجوایشن کا امتحان دے رکھا تھا اور فراغت کے ایام میں شارٹ ہینڈ سیکھنے آتی تھی۔ وہ انسٹرکٹر کی بیٹی تھی مگر۔ شارٹ ہینڈ کی کلاس میں اپنے پاپا کو سر کہہ کر سوال کیا کرتی۔ اور سر بھی اسے دوسرے طلبہ وطالبات کی طرح بات کرتے۔ اسی لئے اکثر طلبہ کی طرح نوازش کو بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ انسٹرکٹر کی بیٹی ہے۔ کیونکہ وہ دیگر کلاس فیلوز سے زیادہ طاق تھی اس لئے بعض اوقات وہ ایسے ایڈوانس سوال کرتی کہ سب بور ہو جاتے ایسے میں انسٹرکٹر صاحب کو ہلکی سی تنبیہ کر کے اسے چپ کروانا دیتے اور وہ معصومیت سے منہ بسور کر ناراض نظروں سے باپ کی طرف دیکھتی اور وہ مسکرا کر اس کے رد عمل کو نظر انداز کر کے پڑھانے لگتے۔

سانولی سلونی تیکھے نینوں والی یہ دل صدقے تیرے
تجھ بن سونی دل کی دنیا سونے سانجھ سویرے

ایک دن وہ انارکلی سے گزر رہا تھا کہ کسی ریکارڈنگ سنٹر پر یہ گانا بج رہا تھا۔ جانے کیوں اس کی نظروں کے سامنے نیلسن کا چہرہ مسکرانے لگا۔ اس نے بلا سوچے وہ کیسٹ خرید لیا۔۔۔ اب وہ صبح شام یہ گانا سنتا رہتا۔ یہ گانا سن کر اسے ایک نامعلوم طرح کی آسودگی سی محسوس ہوتی تھی۔ اب اس کا جی چاہتا کہ یہ گانا وہ خود بھی گنگنائے۔ وہ گائیکی کی الف بے سے بھی واقف

نہ تھا مگر اس گانے کو سن کر اسے موسیقی سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور گانے کا شوق ہوا اسے الحمرا آرٹس کونسل میں لے گیا۔ جہاں رقص و موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مہاراج کتھک غلام حسین رقص کی تعلیم پر جبکہ استاد چھوٹے غلام علی خاں نو آموز شائقین کو ہلکی پھلکی موسیقی کی تعلیم دینے پر مامور تھے۔ ہفتے کے جن تین دنوں میں یہاں کلاس ہوتی تھی وہ تین دن شارٹ ہینڈ کی کلاس نہیں ہوتی تھی۔ سرکاری ادارہ اور سرکاری سرپرستی کے باعث فیس بھی معمولی سی تھی۔ چنانچہ نوازش نے یہاں داخلہ لے لیا۔

پہلے دن جب وہ میوزک کلاس روم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک قالین پر پندرہ سولہ لڑکے لڑکیاں الگ الگ ٹکڑیوں میں بیٹھے ہوئے تھے سامنے ایک سال خوردہ گریس فل بوڑھا ہارمونیم لئے بیٹھا کسی گانے کی استھائی اور انتھائی کے بارے میں گفتگو کے انداز میں لیکچر دے رہا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کی سانس رکتی تھی اور وہ بار بار کھنگار کر گلہ صاف کرتا تھا۔ سلام کر کے وہ بھی انہی لوگوں میں بیٹھ گیا۔ دل میں آئی کہ یہ بڈھا کیا گاتا ہوگا اور کیا سکھاتا ہوگا۔۔۔ پھر اس نے سلسلۂ کلام روک کر نوازش سے بڑی سادگی اور اپنائیت کے ساتھ بات کی اور رسمی طور پر خوش آمدید کہا۔ اس کے لہجے میں عاجزی نے نوازش کے دل میں اس کے بارے میں پہلے تاثر کو زائل کرنا شروع کر دیا۔ پھر جب اس کی انگلیاں ہارمونیم پر تھرکنا شروع ہوئیں اور بوڑھے گلے سے سر پھوٹے اور لڑکے لڑکیاں کورس میں اس کے ساتھ گانے لگے تو کمرے میں ایک دلنواز موسیقی گونجنے لگی۔۔۔۔۔۔

گھونگھٹ اوہلے نہ لک سوہنیا میں مشتاق دیدار دی آں
ایتھے اوتھے دونویں جہانے میں باندی سرکار دی آں
جانی باجھ دیوانی ہوئی ٹوکاں کردے لوگ سبھوئی
جے کر یار کرے دلجوئی، تاں فریاد پکار دی آں

غیر ارادی طور پر اس کی آواز بھی اس کورس میں شامل ہوگئی۔ دو تین بار کی مشق کے بعد اس پر طاری مغائرت کا احساس فرو ہو گیا چنانچہ دوسرے روز سے اس نے دلجمعی کے ساتھ آرٹس کونسل میں آنا شروع کر دیا۔ اب شارٹ ہینڈ میں اس کا دل نہ لگتا بلکہ وہ وہاں بھی گنگناتا رہتا۔ اب اسے اپنی آواز میں کچھ کچھ بھلا پن محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک دن کہ معراج شریف کی وجہ سے کلاس کی حاضری کم تھی۔ اس روز کلاس کچھ پڑھے بغیر ہی ختم ہوگئی وہ کلاس سے نکل کر چائے پینے کے لئے

چھوٹے سے ٹی شاپ میں آ گیا۔ چائے کا آرڈر دے کر وہ آ کر میز پر بیٹھ گیا اس وقت روم میں کوئی نہ تھا۔ وہ میز بجاتے بجاتے دبے دبے سروں میں گنگنانے لگا۔

سانولی سلونی۔۔۔۔۔۔

وہ گنگنانے میں اتنا مگن تھا کہ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ نیلسن کب کی بیٹھی ہوئی اس کو سن رہی تھی۔ معاً اس کی نظر نیلسن پر پڑی۔

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے

وہ گاتے گاتے چپ ہو گیا اور اسکی طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کیا کہے گی۔ کیسے، لہجہ کیسا ہو گا ہو سکتا ہے کہے، شرم نہیں آتی لڑکیوں کو چھیڑتے ہوئے۔ میں کہوں گا میں نے کب چھیڑا ہے۔ وہ کہے گی تو تم یہ گانا۔۔۔"میں کہوں گا تو کیا یہ گانا آپ پر پکچرائز ہوا ہے یا گیا آپ کیلئے لکھا گیا؟ کوئی اور نہیں گنگنا سکتا۔؟؟ یہ سن کر چپ ہو جائے گی۔ یا پھر اور برانگیختہ ہو کر پاؤں پٹختی ہوئی چلی جائے گی۔۔۔ ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔۔ یہ بھی ممکن ہے۔ نیلسن اس سے بات ہی نہ کرے آئے اور چائے یا بسکٹ یا دونوں چیزیں لے اور چلی جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ۔۔

"گڈ ایوننگ!!"۔۔۔ بے باک نیلسن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ نوازش نے گڈ ایوننگ سن کر غیر ارادی طور پر وقت کا تعین کرنے کے لئے باہر کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی پر لٹکے پتلے سے پردے میں سے سرمئی شام جھانک رہی تھی۔

"گ گ۔۔ گڈ ایوننگ گ گ!!!" نوازش کے لئے یہ جملہ غیر متوقع حملے کے مترادف تھا اس لئے وہ ذرا گھگھیایا، گھبرایا۔ مگر پھر سنبھل کر اٹھا اور اسے بیٹھنے کی دعوت دی۔ نیلسن شکریہ کہہ کر بیٹھ گئی اس کے بیٹھنے اور دیکھنے میں ایک ادائے سادگی جھلکتی تھی۔

"جی!" نوازش اس کی طرف متوجہ ہوا۔ نوازش اب نئی سچوایشن کے لئے تیار تھا۔

نیلسن نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ "آپ یہ گانا کیوں گاتے رہتے ہیں۔"

"اگر آپ برا مانتی ہیں تو آئندہ کم از کم وائی ایم سی اے، کی حدود میں۔۔"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں اس لئے۔۔۔"

نوازش نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا لیں گی؟

"چائے!"

"ok its ----- "ایک چائے!!" اس نے ویٹر کو آرڈر دیا اور ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا ---------- !!!

معاً اسے بی کام کے زمانے میں یونیورسٹی ٹرپ اور دور طالب علمی کے مخلوط لمحے اور شامیں یاد آ گئیں۔ خواجہ اور نورین کی رقعہ بازی --- اعجاز کی منگیتر --- خالہ زاد ----- جو سال سوم کی طالبہ تھی خواجہ قیوم کے پاس کیونکہ کار تھی اس لئے وہ خواجہ کو ساتھ ڈیٹ پر لے جایا کرتا تھا۔ مگر وہ جب اپنی منگیتر کے ساتھ پچھلی سیٹ پر "تبادلۂ خیال" کرتا تو خواجہ اکیلا ہونے کی وجہ سے بور ہوتا تھا اس لئے اس کی منگیتر اپنی ایک کلاس فیلو، نورین کو بھی ساتھ لے آتی جو کہ خواجہ کو کمپنی دیتی تھی۔ مگر ان کے درمیان کوئی ایسا تعلق نہیں تھا۔ محض ہنسی مذاق اور علیک سلیک تھی مگر خواجہ چپکے چپکے اس کی محبت میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ دوست اس محبت کو جلد سے جلد منطقی انجام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان میں نوازش سرفہرست تھا اس نے ثاقب سے مل کر اعجاز کو اعتماد میں لیا اور اس کے ذریعے نوازش نے نورین بنکر خواجہ کے نام پہلا محبت نامہ لکھا۔ وہ اسے نورین بن کر خط لکھا کرتا تھا اور نورین کے نام سے خواجہ کے لکھے ہوئے جذبات بھرے خط بھی خود وصولا کرتا۔ خواجہ نے جو پہلا خط نوازش عرف نورین کے خط کے جواب میں لکھا۔ اس کا پہلا جملہ --- "چھے جون کا سورج میرے لئے نئی زندگی کا پیغام لے کر طلوع ہوا" --- خواجہ کی چھیڑ بن گیا تھا۔ ہر آتا جاتا موقع ملتے ہی اسے چھے جون کہہ کر بھاگ جاتا۔ دوستوں نے اس کا وہ تو الگایا تھا کہ وہ نورین کا خواب بھی دیکھنا بھول گیا تھا۔ اور جس روز لاہور کے لارنس گارڈن میں اس داستان خط و کتابت کا انجام ہوا تھا اس روز خواجہ کی کیا حالت تھی؟ اسے دیکھ کر نوازش کو اسی دن سے عشق سے وحشت سی ہو گئی تھی کیونکہ نہ تو وہ کسی کی یاد میں برے حال میں رہنا چاہتا تھا اور نہ ہی لوگوں میں اپنا تمسخر اڑتے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ لڑکیوں میں کافی اکھڑ اور بد دماغ مشہور تھا، صرف رخشی ایسی تھی جو کہ اس کے ساتھ کوئی بات کرتی تھی۔ اس لئے بعض قریبی دوست کبھی کبھار اسے نوازش کی لو سٹوری کہہ کر چھیڑا کرتے تھے --- اس نے خواجہ کی اس حرکت پر نوازش سے بڑی معصومیت سے گلہ کیا تھا "آپ کے دوست نے یہ کیا کیا۔ عشق ایسے ہی تھوڑی ہوتا ہے۔" یہ جملہ نوازش کو آج تک یاد تھا وہ اس روز اس سے عشق کرنے کا طریقہ پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر ---" اور یہ جملہ کئی مرتبہ اس کے کانوں میں کسی پرانے ریکارڈ کی طرح بجتا "ایسے تھوڑی کیا جاتا ہے عشق۔" پھر کیسے؟ وہ اس بارے میں سوچنے سے بھی جھجکتا تھا۔ اس کے سامنے خواجہ آ جاتا۔ اور وہ کسی لڑکی کے التفات پر خوش فہمی کا

شکار ہونے سے بچ جاتا۔ وہ ہمیشہ اسی انتظار میں رہا کہ کوئی خود اسے آ کر کہے I love you۔ اسی احتیاط میں اس نے نجانے کتنوں کے دل توڑے تھے۔ خاص طور پر love story تو بقول دوستوں کے اس پر فریفتہ تھی ------ مگر وہ ہمیشہ شرماتا اور جھجکتا ہی رہا۔ یہی باعث تھا یونیورسٹی سے نکلتے وقت ہر کسی کے credit میں ایک آدھ عشق ضرور تھا مگر اس کا عشق کھاتہ بالکل blank تھا۔ اس تمام تر احتیاط کے باوجود اب نیلسن کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ کیوں؟' یہ سوال اکثر اسے بے تاب کرتا۔ مگر وہ اس کی طرف کھنچتا ہی چلا جا رہا تھا۔

باتوں سے باتیں اور ہنسی، قہقہے!! بس چند دنوں، ہفتوں میں آپ نے تم اور تم نے تو کا چولا بدلا۔ ادھوری ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ایک دن الحمرا ہال نمبر ایک کی لابی میں بیٹھے بیٹھے نوازش نے اسے مشورہ دیا۔ "نیلی! یار تم بھی آرٹس کونسل میں میوزک کی کلاس میں داخلہ لے لو۔"

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں، تم اکیلے ہی کافی ہو گانے کے لئے ----- میں سوچ رہی ہوں کہ میں کتھک مہاراج کے پاس کے رقص کی کلاس میں داخلہ لے لوں۔"

نیلسن کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ نوازش نے چونکتے ہوئے دیکھا۔ نیلسن کے چہرے پر جواباً ایک شوخی لہرا گئی۔ اور وہ بھی مسکرا پڑا۔ نیلسن نے اسی انداز میں کہا۔ "نیلسن و نوازش اور رقص و نغمہ! --- کیسا ہے؟" نوازش کا دل ایک دم زور سے دھڑکا، نیلسن کے لئے۔ اس نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایک بات بتاؤں؟" ایک دن باغ جناح میں بیٹھے بیٹھے نیلسن نے کہا۔

"بتاؤ۔ ایک نہیں دو۔"

"مذاق نہیں بابا سیریس"

"ہاں کہو!"

"میری ایک فرینڈ نے بتایا تھا کہ تو سانولی سلونی ہے اور تیرے نین نقش تیکھے ہیں۔ پھر جب تم گانا گاتے تھے تو مجھے بہت اچھا لگتا اور میں چاہا کرتی کہ تم گاتے رہو۔ مگر تم رک جاتے تو میں بڑی بد مزہ ہوتی۔ میرا جی چاہتا تمہیں کہوں، بلکہ حکم دوں کہ گانا جاری رکھو!!! مگر سوچتی کہ یہ میرا حق نہیں ہے۔

"مگر اب تو ہے نا؟ اب حکم کرو! ویسے میں نے کبھی فرمائش پر گانا نہیں گایا یہ میرا عشق ہے اور عشق

کسی فرمائش پر نہیں کیا جاتا مگر تمہاری بات اور ہے۔تم کہو تو میں۔۔۔۔‘‘نوازش نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

نیلسن نے کہا۔’’نہیں اب نہیں جب موڈ ہو گا خود بخود سنا دینا۔ I do agree فرمائش کا واقعی وہ مزا نہیں۔۔۔۔‘‘

’’خودروئیدگی اور بے ساختگی میں ایک قدرتی حسن اور کشش پائی جاتی ہے۔‘‘نوازش نے اس کی بات کی تائید کی۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
کہ دیکھو خوبصورت لگ رہا ہے چاند بن گہنے

نوازش نے شوخی سے چاند کہہ کر نیلسن کی طرف اشارہ کیا اور وہ شرما گئی۔۔’’اچھی لگتی ہو۔بہت اچھی،اس حیا کے آنچل میں‘‘۔۔نوازش نے اس کے چہرے پر بھرپور نظریں جمائے ہوئے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک انگلی جما کر اسے کا جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔اور دیکھتا رہ گیا۔جھیل سمان آنکھوں میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور پلکوں پر اشکوں کے ستارے چمک رہے تھے۔گالوں پر لج کی لالی۔۔۔اسنے انگلی کے پورے پلکوں کے کنارے صاف کئے۔ may I kiss ! ۔وہ کھی کھی ہنس پڑی جیسے کہ جھرنا پھوٹ پڑا ہو۔اس پر طاری سارا رومان پریشان ہو گیا۔نوازش نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔وہ ذرا نروس سا تھا۔’’ارے۔۔،‘‘ وہ تھوڑی دیر ہنسی روک کر بولی۔

’’سارے موڈ کا بیڑہ۔۔۔۔!!‘‘وہ بھی تو یہی سوچ رہا تھا۔جبکہ نیلسن اسے ذمہ دار گردان رہی تھی۔

وہ کیوں ہنس رہی ہے۔ہمت کر کے اس نے پوچھا’’کیا ہوا؟‘‘

وہ ذرا رکی پھر اس نے نشیلی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا’’۔۔۔۔۔۔۔۔۔ may I kiss you ۔۔!۔ارے یہ کام کوئی پوچھ کے کرتا ہے۔

اچانک وہ سنجیدہ ہو گئی۔یہ تو بس ہو جاتا ہے۔بوسہ کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔‘‘

’’اوہ،اچھا تو یہ بات۔۔۔!‘‘نوازش نے پیش دستی کرنے کی کوشش کی مگر نیلسن پھسل گئی’’اب نہیں!‘‘

’’پھر کب؟‘‘نوازش نے بر قراری سے پوچھا۔

’’یہ تو مجھے بھی نہیں پتہ۔مگر میں نے کہیں پڑھا ہے۔لمحہ جو ایک ہاتھ سے نکل جاتا ہے صدیوں کے پھیر کے بعد لوٹتا ہے۔صدی کون جیتا ہے۔اور جیے بھی تو جوان کہاں رہتا ہے۔‘‘

نوازش نے کہا۔ ''مگر عشق تو صدا جوان رہتا ہے۔''
نیلسن نے گردن اپنے دائیں کندھے پر جھکا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دعویٰ داخل کیا۔
''ہاں اگر اپنی اصل شکل میں رہے تو۔ شادی کے حصار میں محبوس نہ ہو جائے، گھٹ کر مر نہ جائے تو۔''
نوازش نے کہا۔ ''ٹھیک کہتی ہو تم۔ کسی نے یوں ہی تو نہیں کہا۔''

نہ تمہارا حسن جواں رہا، نہ ہمارا عشق جواں رہا
نہ وہ تم رہے نہ وہ ہم رہے جو رہا تو غم کا سماں رہا

نیلسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''شاعر نے شادی کر لی ہو گی۔'' نوازش قہقہ بھری ہنسی ہنس پڑا۔
وہ شام یادگار تھی۔ اس رات وہ دیر تک نیلسن کی باتیں یاد کرتا رہا اسکے ساتھ گزرا لمحہ لمحہ روشنی کی کرنوں میں نہایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر نیلسن نے ٹھیک کہا تھا لمحہ صدیوں۔۔۔! نہ ہی وہ لمحہ ہاتھ آیا اور نہ ہی وہ شام لوٹی۔
جب تک شارٹ ہینڈ کی کلاسیں جاری رہیں۔ ان کا معمول تھا کہ وائی ڈبلیو سی اے نکل کر پیدل چلتے چلتے الحمرا آرٹس کونسل تک آتے۔ نوازش موسیقی میں اب سنجیدگی سے رچ گیا تھا۔ وہ بڑی باقاعدگی سے استاد چھوٹے غلام علی خاں کی کلاس میں شریک ہوتا تھا۔ یک دن نیلسن نے کہا۔
''یار تم تو واقعی موسیقی میں سنجیدہ ہو گئے ہو۔'' نوازش نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس موسیقی نے مجھے تم سے ملایا ہے، زندگی میں کچھ جہات کا تعین ہوتا جا رہا ہے اس لئے میں یہ سفر جاری رکھنا چاہتا ہوں۔''
''اور میں اس سفر میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔۔ keep it up'' نیلسن نے پر عزم لہجے میں کہا۔ مگر اس سے پہلے کہ نوازش اس پر کوئی رومانی ردعمل ظاہر کرتا۔ وہ ہنس پڑی۔
نوازش نے چڑتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ہنستے کے علاوہ کوئی اور کام بھی ہے۔''
نیلسن نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔
جب بی۔ اے کا ریزلٹ آیا تو دونوں نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا؛ نیلسن نے ایم اے انگلش میں اور نوازش نے ایم اے اقتصادیات میں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایک دفتر میں سٹینو گرافر کی جز وقتی ملازمت اختیار کر لی۔ انگریزی ڈیپارٹمنٹ اولڈ کیمپس جبکہ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ نیو کیمپس میں تھا۔ مگر یونیورسٹی کی نیلی بس سروس نے ان کی ملاقاتوں کا

تسلسل برقرار رکھا۔ کبھی نوازش اولڈ کیمپس کبھی وہ نیو کیمپس آجاتی۔ ایک دن نوازش نے کہا۔ ''یار جی چاہتا ہے کہ پہروں یونہی نہر کے کنارے بیٹھے پاؤں پانی میں ڈالے بیٹھا کریں۔''

''تو بیٹھا کرو، کون روکتا ہے۔''

''اکیلے نہیں۔۔۔ تمہارے ساتھ'' نوازش نے رومانٹک موڈ میں کہا۔

''کیا؟۔۔۔ میرے ساتھ!!''

ہاں تمہارے ساتھ!!''

''تو بیٹھو۔'' نیلسن کے لہجے میں شرارت اور بے نیازی تھی۔ جبکہ نوازش پوری طرح رومانوی موڈ میں تھا۔ مگر حسب سابق وہ سنجیدہ نہ ہوکر اس کے لئے مشکل پیدا کر رہی تھی۔۔۔ وہ اکثر ایسا ہی کرتی تھی اور نوازش اکثر شرمندہ ہوکر زچ ہو رہتا۔ مگر آج وہ چپ نہ رہا۔ ''نیلی کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔''

''کیا کروں۔ جب سنجیدہ ہوتی ہوں تم پیش دستی پر اتر آتے ہو۔'' نیلسن نے مسکراتے ہوئے مصنوعی بیزاری اور ناراضی سے کہا۔ اوراب واقعی نوازش کے لئے شرمندہ ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ نیلسن نے اسکے چہرے پر سنجیدگی اور شرمندگی دیکھ کر شوخی سے سر اس کے قریب لے جا کر ایک آنکھ میچ کر آہستہ سے کہا۔ ''ویسے آپس کی بات ہے میرا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ:

ہم تم یونہی چلتے رہیں صبح شام

دن رات ڈھلتے رہیں

موسم بدلتے رہیں ہر گام

صبح شام، صبح شام

نوازش کے چہرے پر پھر پہلی سی شگفتگی لوٹ آئی۔ نیلسن نے اس کے چہرے پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یوں ہنستے کھلتے ہوئے اچھے لگتے ہو۔ ہنستے رہا کرو۔'' مگر اس سے پہلے کہ نوازش کچھ کہتا۔ نیلسن نے بدلے لہجے میں کہا۔ ''مگر یہ ظالم سماج۔۔۔ تمہیں پتہ ہے نا یونین والوں کا۔ یہ تو یوں لگتا ہے جیسے ہماری ماں کے گھر پیدا ہوئے ہوں۔۔۔ اس لئے احتیاط ہی مناسب ہے۔۔۔ ویسے بھی ہم نے کون سی رنگ رلیاں منانی ہیں۔ جو ہمیں ان کی روک ٹوک رکاوٹ محسوس ہو۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہے۔ ورنہ کوئی حد سے گزرتے ہوئے یہ کہاں سوچتا ہے کہ وہ کس شریف باپ کی اولاد ہے۔ ان کی روک ٹوک بہتر ہے۔۔۔''

نوازش پھر بدکتے بدکتے رہ گیا۔"یہ لڑکی کیا چیز ہے۔ کبھی محبوبہ، کبھی کھلنڈری، شریر اور شوخ سی اور کبھی ناصح دوست!! یہ سانولی سلونی سی قاتلہ۔۔۔" وہ نیلسن کے جانے کے بعد بھی دیر تک یہی سوچتا رہا۔

دنوں نے ہفتوں، مہینوں اور مہینوں نے سالوں کا لباس پہنا۔ ان کے تعلقات افواہوں کی زد میں آئے اور افواہوں سے نکل کر تذکروں میں آ گئے بلکہ سٹاف روم میں بھی پہنچ گئے۔

ایک دن لیکچر ختم کرنے کے بعد میڈم اولگا نے اسے ایک طرف لے جا کر پوچھا۔"تمہارے بارے میں ایک افواہ ہے......افواہ؟"

"جی نہیں حقیقت ہے میں اور نیلسن......میرا مطلب ہے......"

"سمجھ گئی! تم دونوں ...... serious ہو"

"یس میم۔۔۔مگر میں اپنی تعلیم تو مکمل۔۔۔۔۔"

"دیکھو نوازش! تمہارے لئے تو یہ بات اتنی بڑی نہیں لیکن جب لڑکی کا نام کسی کے ساتھ لیا جانے لگے تو وہ ریت کی دیوار بن جاتی ہے۔ اسے لوگوں کی چبھتی نظروں اور معنی خیز مسکراہٹوں اور طنزیہ جملوں کے سامنے اپنا وجود سرکتا محسوس ہوتا ہے۔"

"مگر میم نیلسن ایسی کمزور نہیں!"

میڈم نے کہا:" no, my son you can't understand عورت کی یہی tragedy ہے۔ وہ مرد کو اعتماد اور اعتبار کی دولت سے نوازتی رہتی ہے مگر اپنے اندر وہ نہایت کمزور اور بے یقین ہوتی ہے۔ دراصل عورت کے اندر جو اعتماد ہوتا ہے نا! وہ اسے کام میں لانے کا قرینہ نہیں جانتی اسی لئے وہ اپنا سارا اعتماد مرد کو بخش کر اس سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اس اعتماد کے سہارے عورت کو تحفظ فراہم کرے۔"

"میڈم! ایک بات پوچھوں۔" نوازش کو اچانک خیال آیا جو سوال بن کر غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔"کہیں نیلسن نے تو آپ سے کچھ بات نہیں کی؟"

میڈم اس کے اس متوقع سوال پر مسکرائی"مجھے پتہ تھا تم یہی پوچھو گے۔ میری اس گفتگو کے بعد تمہارا یہی سوال بنتا تھا مگر my son ! نہ تو نیلسن سے میری ملاقات ہوئی ہے اور نہ ہی اس نے مجھ سے کسی قسم کا رابطہ کیا Ok"

نوازش مطمئن ہو گیا بلکہ وہ اپنے سوال پر ذرا سا شرمندہ بھی ہو گیا۔

''میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے ماما پاپا کو engagement کے لئے insist کرو۔ پھر شادی آرام سے کرتے رہنا۔ فی الحال اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔'' میڈم اس کا کندھا تھپتھپا کر my lecture کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ اس وقت راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ وہ کافی دیر تک کھڑا میڈم کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ اس کا رویہ ہر سٹوڈنٹ کے ساتھ دوستانہ تھا مگر وہ اس قدر باخبر ہوگی اس کا نوازش کو اندازہ نہ تھا۔ اس نے سوچا میڈم ٹھیک ہی کہتی ہے واقعی نسبت طے ہو جائے تو وہ مکمل توجہ کے ساتھ اپنی پڑھائی پر دھیان دے سکے گا۔۔۔۔ جب سے میڈم کو نوازش اور نیلسن کی محبت کا پتہ چلا تھا۔ وہ نوازش کو بڑی ممتائیت سے دیکھتی تھی۔ نوازش کو اس کی اس دُکھ سے ایک گونہ آسودگی سی ملتی تھی۔ وقتاً فوقتاً آتے جاتے پوچھتی رہتی۔ ''کیسی چل رہی ہے۔۔۔ کیا حال ہے۔۔۔ تمہارا نہیں۔۔۔ اس کا!۔۔۔'' اور نوازش شرما کر مسکرا دیتا مگر میڈم اسے شرمندہ چھوڑ کر آگے بڑھ جایا کرتی۔ کبھی وہ اسے دیکھ کر ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے کہتی آج بہت خوب لگ رہے ہو۔ آج نیلی سے ضرور ملنا۔ اسے بھلا لگے گا۔ تب بے اختیار اس کا جی نیلسن سے ملنے کو مچل جاتا ایک دن نوازش نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''میم میں نیلسن کو آپ سے ملانا چاہتا ہوں۔ اسے بھی آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق۔۔۔''

''کیا۔۔'' میڈم نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ نوازش کو فوراً احساس ہو گیا کہ وہ اینگلو پاکستانی کرسچن لیڈی کے ساتھ مخاطب ہے۔ جس کی اردو واجبی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ وضاحت کرتا۔ میڈم نے مسکرا کر اسے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"O man easy Urdu!"

" Oh I am sorry ma'm ۔ دراصل نیلسن آپ سے ملنے کا شوق رکھتی ہے۔"

" sure , sure کسی دن call her ، کسی دن سٹاف روم میں۔۔"

''مگر میم، یہاں نہیں، سٹاف روم میں نہیں۔ any other place, "

" where "

"out of campus"

" bye the way... کدھر!'' اولگا میڈم نے ملائمت سے پوچھا۔ اب ان کے لہجے میں سوالیہ الجھن نہیں تھی۔ مگر نوازش کے لہجے میں ابھی تک کسی قدر جھجک برقرار تھی۔ آخر اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''میم اگر آپ اجازت دیں تو۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' اس نے نہایت بے تکلفانہ انداز میں ہامی بھر کر نوازش کی جھجک اور اندیشے کو بیک جنبش دور کر دیا۔ ''just tell me'' میڈم نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا اور نوازش کے چہرے پر ممنونیت کی سرخی دوڑ گئی۔ اس کا دل نیلسن کے لئے یوں بے طرح دھڑکا۔ وہ ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر بس کے لئے نہر کی طرف چل پڑا مگر اسے یاد آیا کہ آج اسے ڈیپارٹمنٹ نہیں آنا تھا۔ کیونکہ اس کے going out boss کی الوداعی پارٹی تھی۔ اسے فون کرنے کے لئے ایس ٹی سی ہال کی طرف چل پڑا۔

فون سے شاہدہ چمٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''فون کرنا ہے۔''

''ہوں!'' نوازش نے سر کو جنبش دی۔

''مجھے پتہ ہے کہاں کرنا ہے۔ ابھی ملا دیتی ہوں۔'' شاہدہ اس کی کلاس فیلو تھی اور اکثر لڑکوں کو لڑکیوں کے ساتھ منسوب کرنا اور ہنسی مذاق کرتے رہنا اس کی عادت تھی۔ مگر خود کسی کے ہاتھ نہ آتی تھی بیوروکریٹ کی لڑکی تھی۔ تعلق اسلام آباد سے تھا۔ مگر ہاسٹل میں رہنے کے بجائے یہاں اپنے چچا کے پاس رہتی تھی جو بی سی سی آئی میں وائس پریذیڈنٹ تھے۔ لانے لے جانے کے لئے ڈرائیور موجود تھا۔ شروع شروع میں لڑکوں نے اسے سفارشی قرار دے کر اس کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بلا کی بے باک تھی۔ ایک دن کسی کو کہتے سن لیا کہ ''سفارشی ہے'' فوراً پلٹی اور بولی ''ہاں۔ اس میں کیا شک میں اپنے انکل کی سفارش سے admit ہوئی ہوں اور دیکھنا جاب بھی اپنی مرضی سے اسلام آباد بلکہ اپنے گھر کے سامنے بلیو ایریا میں کروں گی اور اس batch میں ٹاپ بھی میں ہی کروں گی، بس! یا اور کچھ؟''

مخاطب لاجواب اور دیگر لڑکیاں لڑکے تماشائی -- کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ کچھ کہتا۔ بس اس روز کے بعد ہر کسی کی خواہش ہوتی کہ شاہدہ اس سے بات کرے مگر وہ ہر کسی سے اوپر والی منزل پر کھڑے ہو کر بات کرتی تھی۔ نواز‌ش اس سے بے نیاز سا رہتا کیونکہ نیلسن کے علاوہ اس کا دل کسی سے نہ بہلتا تھا۔ نواز‌ش کی اسی بے نیازی میں شاہدہ کے لئے کشش تھی۔ بعض اوقات وہ اسے کار میں لفٹ کے لئے بھی آفر کرتی مگر وہ کوئی بہانہ کر دیتا۔ اب بھی جب شاہدہ نے اسے فون ملا کر دینے کی پیشکش کی تو اس نے نہایت شوخی سے کہا ''تمہاری موجودگی میں بات کیا خاک ہوگی۔ میں گھر جا کر کر لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے پاس سے گزرنے لگا تو شاہدہ نے نہایت بے تکلفی سے فون

اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''لو خود ہی کر لو میں جاتی ہو۔ کبھی ہمیں نہ enjoy کرنے دینا کنجوس۔''
نوازش نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے فون لے لیا اور وہ ایک باوقار مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی ٹپ ٹپ سیڑھیاں اتر گئی۔ اسے شاہدہ کا یہ انداز بھلا بھلا سا لگا نیلسن سے فون ملا کر وہ دوسری طرف سے فون اٹھانے کا انتظار کرنے لگا اس کے دل کی دھڑکن ایک دم غیر معمولی ہو گئی۔ کافی دیر تک بیل بجتی رہی' اللہ کرے نیلسن ہی فون اٹھائے' اس کا دل دعا کر رہا تھا۔ دعا قبول ہوئی۔ دوسری طرف سے نیلسن کی لرزتی ہوئی ہیلو سنائی دی اور ادھر سے لرزتا ہوا ہیلو! نوازش کے منہ سے نکلا۔
''تم کہاں تھیں؟۔۔۔ اتنی دیر تک بیل......''
نیلسن نے دوسری طرف سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''جب پہلی بیل بجی تو ہماری کاؤنٹٹ نے پتہ کیا کہا؟''
''کیا؟''
''کہتا ہے نیلسن! یقیناً یہ نوازش کا فون ہوگا کیونکہ بیل کی آواز میں بے قراری اور فریاد کا تاثر ہے۔ اب بھی باہر سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔''
نوازش نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا پروگرام ہے باس کی پارٹی کے بعد!'' نوازش نے نیلسن کو اولگا میڈم کے ساتھ ہونے والی گفتگو کا ملخص بتایا۔ چنانچہ آج کا پروگرام طے پا گیا اور اس نے ڈیپارٹمنٹ ہی میں میڈم کو اپنے آنے کا پروگرام بھی بتا دیا۔
نیو کیمپس کی حدود کا جو حصہ وحدت روڈ سے متصل ہے اس میں اساتذہ کی رہائش گاہیں تعمیر کی گئی ہیں۔ یہیں اولگا میڈم اپنی دیرینہ خادمہ کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ زندگی بھر شادی نہیں کی تھی۔ جوانی میں جس سے پیار کیا وہی آج بھی ہمسفر تھا۔ مگر وہ دونوں متوازی خطوط کی طرح تھے جو ساتھ ساتھ تو چلتے ہیں مگر ملنا ان کے مقدر میں نہیں تھا۔ ایسا کیوں ہوا۔ کیسے ہوا یہ سب ایک راز تھا جس سے انہوں نے کبھی پردہ نہ اٹھایا۔ بلکہ اس نے کبھی کسی کو موقع ہی نہ دیا تھا کہ پوچھے کیونکہ وہ حلیم الطبع ہونے کے باوجود ہر کسی سے ایک فاصلے سے ملتی تھی۔ ہمدرد تھی، ملنسار نہ تھی۔ تدریس کے بعد کا سارا وقت اس کا اپنا تھا وہ اسے اپنی مرضی سے صرف کرتی تھی۔ مطالعے میں، اپنے رفیق کے ساتھ یا چہل قدمی میں۔۔۔ اپنی مرضی سے۔۔۔ نہ وہ کسی کو اپنے ہاں بلاتی نہ جاتی۔ مگر بقول اس کے نیلسن اور نوازش کے اپنے گھر بلانا، اس کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا۔ ورنہ ہر کسی کو وہ صاف منع کر دیتی۔ کئی بار طلبہ و طالبات نے ان کے ہاں آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر اس نے یہ کہ کر معذرت کر لی

کہ گھر میں بھی اس کے سوا اور کوئی نہیں اس لئے وہاں آنے کے بجائے ڈیپارٹمنٹ ہی میں مل لیں۔ مگر نوازش نے جب اس کے ہاں آنے کی خواہش کا اظہار کیا تو نجانے وہ کیوں انکار نہ کر سکی۔ اور اب جب وہ دونوں اس کے ہاں آئے تو وہ کمال خندہ پیشانی سے ملی اور خود اپنے ہاتھ سے کافی تیار کر کے لائی۔ خدامہ کہتی رہی کہ وہ بنا کر لاتی ہے مگر اولگا میڈم نے کہا۔ ''ارے نہیں یہ خاص مہمان ہیں ان کے لئے میں خود اپنے ہاتھوں سے کافی بناؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ جاتے جاتے نیلسن کی طرف دیکھ کر اس اپنائیت کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بور نہ ہونا ابھی میں آتی ہوں، تم نوازی کے ساتھ باتیں کرو۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

جب وہ میڈم کے ہاں سے نکلے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ آج کی شام چند خوبصورت شاموں میں سے ایک تھی۔ میڈم نے جاتے ہوئے انہیں دوبارہ بھی آنے کے لئے کہا تھا۔

''اب کدھر چلیں؟'' نوازش نے پوچھا۔ وہ چلتے چلتے باتیں کرتے نہر کنارے آ گئے تھے۔

''کہاں چلیں۔۔۔۔'' کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے نیلسن نے کہا۔ ''رات ہونے کو ہے۔ اب بندے بن کر سیدھے گھر چلیں۔''

''سیدھے گھر! کس کے؟'' نوازش نے شوخی سے پوچھا۔

''ماں کے گھر۔'' نیلسن نے بھی شوخی سے کہا۔

نوازش نے کہا۔ ''تم نے یہ شعر سنا ہے۔''

''کونسا؟''

نوازش نے خوشگوار لہجے میں شعر پڑھا۔

وہ چلی جائے گی ڈگری لے کر اپنی ماں کے گھر
اور تو کیمپس کے پل سے دیکھتا رہ جائے گا

نیلسن نے ہنستے ہوئے کہا یہ شعر تو مجھے کہنا چاہئے یوں:

میں چلی جاؤں گی ڈگری لے کے اپنی ماں کے گھر
اور تو کیمپس کے پل سے دیکھتا رہ جائے گا

''واہ! ہماری صحبت نے تمہیں اہل ذوق بنا دیا۔'' نوازش نے شوخی سے کہا۔

نیلسن نے کہا۔ ''اب اس موقعے پر شاعر نے کیا کہا ہے۔ مجھے نہیں پتہ!!''

میں بتاتا ہوں اس موقع پر شاعر نے کہا ہے کہ ''جی چاہتا ہے تمہارا منہ چوم لوں۔''
نیلسن نے ''بدتمیز' بے شرم'' ۔ کہہ کر گزرتے ہوئے رکشے کو ہاتھ دیا اور چشم زدن میں سوار ہو کر شرارتاً بائے بائے کہتی ہوئی چلی گئی۔ نواز ش کے چہرے پر ایک شریری مسکراہٹ پھیل گئی۔

رات بھر وہ بستر پر کروٹوں میں الجھا رہا۔ اس لئے صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ چنانچہ ڈیپارٹمنٹ دیر سے پہنچا۔ اس وقت اس کی طبیعت میں ایک خوشگوار بے چینی تھی۔ نہ کلاس روم میں اس کا من پرچ سکتا تھا' نہ ہی لائبریری میں اس کا جی ٹھہرا۔ پہلے اس نے سوچا گھر چلا جائے مگر کرے گا کیا؟ لائبریری سے نکل سیڑھیاں اترتا ہوا وہ نیچے چلا آیا۔ چیونگ گم چباتی ہوئی شاہدہ سامنے کھڑی تھی اسے دیکھ کر چند قدم اس کی طرف بڑھی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ وہ بے باکی سے اس کے سامنے آ گئی۔ اس کی یہی بیباکی نواز ش کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس نے لمبی سانس کھینچ کر خارج کرتے ہوئے اپنی بیزاری اور ناگواری کا تاثر دیا۔ شاہدہ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا ''ٹھنڈی آہیں نہ بھرا کرو کام ہو جائے گا۔'' نواز ش کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ایک دم، بادل نخواستہ ہنس پڑا۔ جواباً شاہدہ بھی ہنس پڑی۔ اور ایک ادا سے بولی ''ٹھنڈ پڑ گئی' آؤ اب تمہیں گرم گرم کافی پلاؤں۔ نارمل ہو جاؤ گے۔'' اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ لڑکی جس سے بات کرنے کے لئے ڈیپارٹمنٹ کے دوسرے لڑکے ہمہ وقت دل میں لئے گوش برآواز اور چشم براہ رہتے ہیں وہ اسے کافی کی پیشکش کر رہی تھی۔ وہ اس کی غیر متوقع پیشکش سے بوکھلا سا گیا۔

''کدھر؟'' نواز ش نے بے تاثر سے لہجے میں پوچھا۔

''کینٹین میں۔''

''نہیں! اولڈ کیمپس ۔۔ باہر ۔۔۔ انار کلی یا مال پر ۔۔۔ کسی کیفے میں۔'' اب نواز ش نے پیش قدمی کی۔ مگر شاہدہ کے باہر کی طرف اٹھتے ہوئے قدموں نے اس کا حملہ پسپا کر دیا بلکہ اس کا حملہ اس پر الٹ دیا۔ بادل نخواستہ نواز ش کو بھی اس کو فالو کرنا پڑا۔ ''کاش اس وقت نیلسن اس کے ساتھ ہوتی!'' اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ ابھی بھاگ جائے یا شاہدہ سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ اس کے ساتھ ہوٹل میں نہیں بیٹھ سکتا مگر پھر اس کے اندر کے مرد نے اسے لعن طعن کی ''وہ عورت ہو کر تمہارے ساتھ چل رہی ہے اور تم مرد ہو کر بزدل بنے جا رہے ہو۔ کوئی قیامت نہیں آ جائے گی اگر تم شاہدہ کے ساتھ چند گھڑیاں بیٹھ لو گے' نجانے اس کا دل کیونکر شاہدہ کے بارے میں نرم ہوتا جا

رہا تھا۔ اندر ہی اندر سے کوئی سمجھا رہا تھا کہ شاہدہ ایسی نہیں ہے جیسی تم سمجھ رہے ہو مگر پھر یہ مجھے زبردستی ہوٹل میں کیوں گھسیٹے لے جا رہی ہے۔ اور یہ کیا کہ میں نے کہا اور اس نے فوراً ہامی بھر لی۔" نیلی بس پر بیٹھ کر وہ اولڈ کیمپس پہنچے اور پھر اولڈ کیمپس کی پشت میں اورینٹل کالج کی طرف سے نکل کر وہ بانو بازار کے اندر سے نکل کر انارکلی میں نو تعمیر شدہ دکانوں کے آخر کونے پر واقع ایک چھوٹے سے کیفے میں چلے گئے۔ کیفے کے فیملی کمپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے نوازش کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔

"ڈر رہے ہو نا؟ کوئی دیکھ نہ لے اور نیلسن کو نہ بتا دے!" بیرے کو کافی کا آرڈر دینے کے بعد اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں!"

"دیکھو! جھوٹ مت بولو!" اس نے نوازش کو بچے کی طرح پیار سے ڈانٹتے ہوئے ایک دم سنجیدگی اختیار کر لی۔

"کیسا لگ رہا ہے؟"

"کچھ عجیب عجیب سا!"

"مس شاہدہ! ایک بات پوچھوں؟" نوازش نے آخر کار ہمت کی۔

"یہ مس کا سابقہ ہٹا کر پوچھو!"

"تم اتنی بے باک اور مغرور کیوں ہو۔"

"تو تم بھی میرے بارے میں یہی سوچتے ہو۔"

"نہیں میں نہیں بلکہ دیگر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تم مغرور ہو بے باک ہو۔"

"تم تو یہ نہیں سوچتے نا۔"

"نہیں مجھے نیلسن کے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔" نوازش نے نہایت بے باکی سے اپنا موقف کا اظہار کر دیا۔ یہ کہہ کر وہ شاہدہ کا چہرہ دیکھنے لگا مگر اس نے نوازش کی اس صاف گوئی کا کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا" گڈ! وری گڈ! بس ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

"اچھا!"

"ہاں۔ اور سن لو میں باک ضرور ہوں مگر یہ بے باکی میری حیا کا حصار ہے جب کوئی میری طرف

شہوت بھری اور غلط انداز نظروں سے دیکھتا ہے تو میں چھوئی موئی ہونے کی بجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سامنے آ جاتی ہوں جب کسی کی نظریں میرے جسم کے ابھرے ہوئے نقوش ٹٹولتی ہیں تو میں سینہ تان کر کہتی ہوں کیا دیکھ رہے ہو کوئی نئی چیز نہیں یہ تو تمہیں گھر میں ہی مل جائے گی......'' وہ آہستگی سے بلا جھجک نواز ش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جو منہ میں آ رہا تھا کہے جا رہی تھی۔ اس کی بعض باتوں پر تو وہ بھی جھینپ سا گیا تھا۔ مگر وہ بلا کی بے جھجک اور بے حجاب تھی۔

''اور جہاں تک میرے مغرور ہونے کا تعلق ہے تو تم خود ہی سوچو جو لڑکی تمہارے ساتھ کیفے میں چلی آئی ہے وہ مغرور کیسے ہو سکتی ہے جبکہ میرا تمہارا عشق معاملہ بھی نہیں اور نہ ہی میں تم میں interested ہوں کہ تمہیں پٹانے کے لئے چلی آئی ہوں اور نہ ہی تم میرے بارے میں کوئی ایسا خیال رکھتے ہو۔ پھر میں مغرور کیسے ہو سکتی ہوں--مگر پیارے یہ دنیا ہے۔ بے باکی' غرور' جوڈو کراٹے یا پھر چھوٹا موٹا اسلحہ چلانے کا فن--جہاد زندگانی میں یہ عورت کی شمشیریں ہیں۔'' اس نے مسکرا کر اپنی تقریر ختم کر دی۔ نواز ش اب بالکل نارمل ہو چکا تھا اور وہ کیفیت جو کیفے کی سیڑھیاں چڑھنے تک بری طرح اسے جکڑے ہوئے تھی ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ دوستوں' دیرینہ دوستوں کی طرح آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ساری اجنبیت ایک نشست میں دور ہو گئی تھی۔ شاہدہ کے لہجے میں سچائی اور اخلاص نے اس کے سارے اندیشے دور کر دیئے تھے۔ وہ آج جو باتیں نیلسن کے ساتھ کرنے کے لئے بے چین تھا وہ باتیں شاہدہ سے کر رہا تھا۔ اور وہ بڑی دلچسپی اور انہماک سے سن رہی تھی۔ نیلسن کی باتیں کرتے کرتے نواز ش نے اچانک پہلو بدلتے ہوئے شاہدہ سے پوچھا ''اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم مجھے اس قدر لفٹ کیوں دیتی تھی۔''

''بھئی دیتی' کیا میں اب بھی تمہیں لفٹ دے رہی ہوں۔'' اس نے شوخی سے کہا اور پھر سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی ''دراصل مجھے تم سے کوئی خطرہ نہیں' میرا جی چاہتا ہے دوسروں کی طرح ہنسوں' بولوں' دوستیاں کروں مگر equal level پر--مگر جس لڑکے سے ذرا ہنس کر بات کی وہ اگلے روز تحفہ لے کر سر پر آن سوار ہوا۔ گھن آتی ہے مجھے ایسے تعلقات سے' تمہارے بارے میں مجھے پتہ تھا کہ تم کسی اور کے ساتھ بک ہو اگر میں تمہارے ساتھ دوستی کروں گی تو تم مجھ سے اظہار محبت کرنے کی بجائے اپنی عشق کہانیاں سناتے رہو گے میرا ہاتھ پکڑ کر یہ نہیں کہو گے شاہدہ! جان تمنا مجھے رات رات بھر تمہارے فراق میں نیند نہیں آتی۔ اور ایک بات اور تمہیں بتاؤں۔ تم بہت بھولے بھالے ہو میرا تجربہ اور تجزیہ کہتا ہے کہ عشق بھولے بھالے لوگوں کا کام ہے شاطر اور

چالاک لوگ عشق نہیں کرتے بلکہ کاروبار کرتے ہیں جذبوں کا' چہروں کا' نظروں کا --کیا سمجھے!''
''اچھا شاہدہ ایک بات اور...... بہت ذاتی سی۔''
''ارشاد!''
''مردوں کے بارے میں تمہارے خیالات سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ تم محبت اور انسانی جذبوں سے یکسر منکر ہو اور یہ کہ شاید تم کبھی محبت نہ کر سکو یا پھر تمہیں محبت کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ کیا تمہارا یہ رویہ کچھ عجیب اور ابنارمل نہیں؟'' نوازش نے جواب طلب نظروں سے شاہدہ کی طرف دیکھا۔
''میرے دوست میں نے اپنی گفتگو میں کہیں بھی محبت پر تنقید نہیں کی بلکہ میں نے تو محبت کرنے کے بھونڈے طریقوں اور جنس مخالف کے چھچھورے رویوں سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ میں یہ بات بڑی دیانتداری سے کہہ رہی ہوں کہ جس دن محبت کا دیوتا مجھ پر مہربان ہوا اس دن یا اس لمحے میں بغیر کسی مزاحمت کے اس دریا میں اتر جاؤں گی مجھے کسی کے چھچھورے پن پر وارفتگی کا گمان ہونے لگے گا میرا انداز نظر بالکل بدل جائے گا یہ اس لمحے کا سچ ہوگا۔ فی الحال سچائی یہ ہے کہ ڈیپارٹمنٹ میں کسی نہ کسی چڑیا کو پھانسنے کے ہر 'شکاری' نے پنجرہ خرید رکھا ہے۔''
''میرا خیال ہے باقی باتیں پھر......'' نوازش نے گھڑی میں وقت دیکھا دو بج چکے تھے' شاہدہ نے ننھی سی رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور اچھل کر کھڑی ہو گئی' ''باپ رے! ڈرائیو انتظار کر رہا ہوگا۔'' میز پر پڑی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے بیرے کو بل دینا چاہا مگر شاہدہ نے دس کا نوٹ بیرے کی ٹرے میں ڈال دیا اور دونوں کیفے سے نیچے اتر آئے۔

میڈم اولگا آج ریٹائر ہو رہی تھی اور ان کے اعزاز میں سٹاف اور طلبہ و طالبات نے ضیافت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ میڈم اولگا کے رویوں میں ممتا جھلکتی تھی۔ عجیب مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ شاگردوں کی شرارتیں اسے کبھی زچ نہ کرتیں۔ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔ ہر کوئی ان کی ریٹائرمنٹ کو دل سے محسوس کر رہا تھا مگر یہ لمحہ تو ہر ملازمت کا مقدر ہے۔ سب نے آنسوؤں میں انہیں الوداع کہا۔ خاص طور پر نوازش آج بہت ملول تھا۔ میڈم نے اس بات کو خاص طور نوٹ کیا اور جب سب سے مل کر فارغ ہوئی تو ایک طرف بیٹھے ہوئے نوازش کے پاس آ کر اس کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے پوچھا۔ your are so sad today ''نوازش نے سر اٹھا کر میڈم کی طرف یکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میڈم نے اس کو چپ دیکھ کر کہا۔ ''why my son

اس وقت نوازش کو کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اسے ایسی صورت حال سے پہلی مرتبہ سابقہ پڑا تھا۔ جدائی کے کرب سے وہ پہلی مرتبہ آشنا ہو رہا تھا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ وقتِ رخصت کیا کہا جاتا ہے۔ وہ جو کہنا چاہتا تھا وہ کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔۔ کیا خبر کہنا چاہئے یا نہیں۔ میڈم نے اسے چپ دکھ کر کہا۔ ''ارے کچھ تو بولو!!''

نوازش نے کہا۔ ''میم I don't know۔۔ پتہ نہیں اس۔۔۔ دراصل میم مجھے کچھ۔۔۔۔ پتہ نہیں کیسے کہتے ہیں اور کہتے بھی ہیں کہ نہیں۔۔۔۔'' اس کے بے ربط الفاظ پر مبنی جملے سن کر میڈم اس کی ذہنی کیفیت سمجھتے ہوئے کہا۔ ''say what you want'' نوازش صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ''میم آپ جا رہی ہیں۔۔۔۔۔۔'' وہ چپ ہو گیا۔ میڈم نے اب کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور کندھا تھپتھپا کر چلی گئی۔ شاید وہ بھی جذباتی ہو گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ محبتیں بھی کیا ہوتی ہیں۔۔۔۔ محبت کیا کیا روپ بدلتی ہے کیا کیا سوانگ رچاتی ہے۔ زندگی اور محبتوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسان ایک محبت سے مکت ہوتا ہے۔۔۔۔۔ مکت کہاں ہوتا ہے تھوڑی دیر کو ادھر ادھر ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ تو دوسری محبت اسے آن لیتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو محبت کی دیوی انسان پر اس قدر مہربان ہوتی ہے کہ بیک وقت کئی کئی محبتیں اپنا دامن پھیلائے اس کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ اور انسان فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کس کا انتخاب کرے۔ کس کے دامن میں سمائے کس کو اپنائے۔ اور کس کو کہاں جگہ دے۔ ایک چھوٹا سا تو دل ہے کس کس محبت کا بوجھ اٹھائے۔ کس کس کو اپنے من میں سمائے۔ میڈم کے جانے کے بعد کئی دنوں تک اس کی کمی محسوس کی گئی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی ممتا کی پناہوں میں تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کئی دنوں تک خود کو خالی خالی اور تنہا تنہا سا محسوس کرتا رہا۔ ادھر شاہدہ تھی۔ اس سے بھی دل لگتا گیا۔ نیلسن کے بعد وہ شاہدہ ہی سے اپنا من پرچاتا تھا۔

میڈم نے کہا تھا کہ منگنی کر لو مگر شاہدہ کا استدلال بڑا عجیب وغریب تھا۔ نوازش اور وہ آج مال روڈ پر کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہدہ کی گفتگو میں اس گرو کی طرح ٹھہراؤ اور اعتماد تھا جو کہ اپنے چیلے کو پریم تپسیا پر بھاشن دے رہا ہو۔ وہ کہہ رہی تھی ''......رشتے اعتبار کے ہوتے ہیں یہ منگنی ونگنی سے کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ منگنی کے بعد لڑکا لڑکی دور بیٹھے ہی ایک دوسرے کو خیالوں ہی خیالوں میں میاں بیوی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ کھونے کے اندیشوں اور پانے کی کوششوں اور خواہشوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں تو پھر نئے نئے گلے شکوے اور

توقعات سر اٹھاتی ہیں اور ازدواجی زندگی کی بے رنگ یکسانیت میں اکتاہٹ سی ہونے لگتی ہے۔"
"تو گویا تمہارا خیال ہے یونہی چلتا رہے۔" نواز ش نے اس کا خیال دریافت کیا۔
"Sure!" شاہدہ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تو اس کے ہاتھ میں کافی کی پیالی چھلک پڑی اور گرم گرم کافی نوازش کے ہاتھ پر گرگئی۔ وہ غیر ارادی طور پر اچھلا اور شاہدہ نے بھی غیر ارادی طور پر اپنے بائیں ہاتھ سے اس کا کافی سے جلا ہاتھ سہلایا...... اس نے فوراً اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔' sorry!" وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔ دونوں کی نظریں ایک لمحے کے لئے ٹکرائیں اور پھر ...... دیر تک وہ دونوں چپ چاپ۔ شاید ایک دوسرے کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے رہے۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا کہ دونوں کو کچھ بجھائی نہیں دیا۔ اس چھوٹے سے غیر معمولی واقعے کی ذمہ داری کسی ایک پر نہیں ڈالی جاسکتی تھی۔ مگر وہ ابھی تک شاہدہ کے ہاتھ کے لمس کا ذائقہ ایک خوشگوار اور خفیف احساس کی صورت میں اپنے پورے وجود میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ بھی شاید ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ آخر شاہدہ نے چپ توڑی اور پھر سلسلہ کلام چل پڑا مگر اب اس کے لہجے میں پریم گرو کے ٹھہراؤ کی بجائے پریمی کی سی نرمی در آئی تھی۔ اس کی باتوں میں اپنائیت کا نیا رنگ جھلک رہا تھا جو پہلے تمام رنگوں سے مختلف تھا۔ بالآخر اس نے اپنی گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا "میری مانو اس منگنی ونگنی کے چکر میں نہ پڑو اور اسی طرح محبت کرتے رہو۔ دوسرے شادی کے لئے تو ساری زندگی پڑی ہے۔ ہو ہی جائے گی نیلسن سے نہ سہی کسی اور سے سہی مگر......!"
"پلیز! پلیز شاہدہ!' نوازش نے س کی بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے تمہاری یہ آخری بات کچھ اچھی نہیں لگی۔"
"ارے ہاں تم نے بتایا تھا کہ وہ ترکِ مذہب پر تیار ہے۔" اس نے نوازش کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔
نوازش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔"
اب شاہدہ کے لہجے میں سابقہ بے باکی لوٹ آئی تھی اور وہ اسے بڑے مدلل انداز میں سنجیدگی کے ساتھ تاکیداً کہا۔ "ذرا اپنے دماغ سے رومان کی پردہ اٹھا کر تمام حالات کا بالغ نظری سے مطالعہ کرو۔"
"میرا خیال ہے کہ ہم اس موضوع کو یہیں چھوڑیں۔۔ میں اس پر سوچوں گا!"
"تو چلیں!" شاہدہ نے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے کہا اور نوازش کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہدہ نے

کہا ''میں کل اسلام آباد اور پھر کچھ دنوں کے لئے امریکہ جا رہی ہوں اس میں ایک ڈیڑھ ماہ تو لگ ہی جائے گا اور پھر امتحانات شیڈیولڈ ہو جائیں گے۔ شاید آخری ملاقات ہے۔''

''چنانچہ آج ہم رسمی طور پر رخصت ہو جائیں گے۔'' نوازش نے اس روایت شکن لڑکی سے کہا۔ شاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا ''تو پھر شروع ہو جاؤ اور مجھے کہو شاہدہ! تمہارے ساتھ یہ مختصر سا عرصہ بہت اچھا بلکہ سہانا گزرا۔ اور میں اس سہانے وقت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اور یہ بھی کہو کہ اس دوران اگر مجھ سے کوئی غلطی دانستہ و نادانستہ طور پر سرزد ہوئی ہو تو اس کے لیے مجھے معاف کر دو اور جواب میں میں بھی یہی کہوں گی'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور وہ لاجواب چپ چاپ مسکرا کر رہ گیا۔ چنانچہ یہ الوداعی ملاقات غیر رسمی کلمات پر ختم ہوئی۔

شاہدہ نے چلتے ہوئے بڑے یقین سے کہا ''مجھے یقین ہے کہ پھر ملیں گے۔ شاید پھر ملنے کے لئے۔''

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟'' نوازش نے معترض لہجے میں پوچھا۔

''میں نہیں یہ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم پھر ملیں گے!!'' شاہدہ کے لہجے میں یقین کی جھلک تھی۔

نوازش چپ رہا اور شاہدہ اسے اللہ حافظ کہے بغیر اس کا پتہ لئے اور اپنا پتہ دیئے بغیر چلی گئی۔۔ شاہدہ کے جانے کے بعد وہ گھر روانہ ہو گیا۔ راستہ بھر وہ نیلسن کے بجائے شاہدہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے وجود میں شاہدہ کے ہاتھ کا لمس پھر سے جاگا جو تلذذ اس لمس میں تھا اسے نیلسن کے قرب میں کبھی محسوس نہ ہوا تھا بلکہ پہلی دفعہ جب اس نے نیلسن کے گالوں کو تھپتھپایا تھا اسے آغوش میں لے کر اس کے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھے تھے اس وقت بھی اسے کچھ ایسا غیر معمولی احساس نہ ہوا تھا۔ اسے بالکل خیال نہ ہوا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی لڑکی کو اتنے قریب سے دیکھا ہے' چھوا ہے اور اپنے بازوؤں میں سمیٹا ہے۔ مگر اس کے برعکس شاہدہ...... یہ بے باک و بے جہت لڑکی تو لمس بن کر اس کے پورے وجود میں اتر گئی تھی۔ وہ اس صورت حال سے زندگی میں پہلی دفعہ دوچار ہوا تھا۔

محبت کا ابتدائی نصاب اس نے شاہدہ سے پڑھا تھا۔ ابھی تک تو وہ نیلسن سے محبت اس روز اس نے نیلسن اور اپنے درمیان مذہبی خلیج کے بارے میں بھی سوچنا شروع کر دیا۔ جب اس نے اپنے گھر والوں کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا تو ذرا سی بحث و تمحیص اور اس کے اصرار کے بعد اسلام قبول کرنے کی شرط پر نیلسن کو قبول کرنے پر راضی ہو گئے۔ اسکے دل میں جذبہ تبلیغ نے دم

مارا اور وہ تفاخر سے تن گیا۔ اگلے ہی روز اس نے بڑی لمبی اور مدلل تمہید کے بعد نیلسن کو تبدیلیٔ مذہب کے لئے کہا۔ نیلسن نے جواباً اسے بڑی مجبور، بے چارا اور بے سہارا سی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نجانے کیا خیال تھا، کیا سوال تھے مگر وہ کچھ نہ بولی بلکہ اس نے لمحہ بھر کے یا شاید اس سے بھی کم توقف سے اثبات میں سر ہلا دیا۔۔۔ وہ اتنی آسانی سے، بغیر کچھ کہے، وہ اسکے لئے اپنا مذہب تبدیل کرنے پر راضی ہوگئی۔ نواز ش ایک احساس تفاخر سے اور فرط نشاط سے جھوم اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ نیلسن کو گلے لگا لے۔ اس نے ایسا کیا بھی۔ مگر یکطرفہ۔۔ نیلسن میں کوئی ایسی تحریک نہ ہوئی۔ وہ خوشی خوشی گھر پہنچا پہلے بڑی بہن اور پھر ماں کو اور ماں نے بابا کو بتایا۔

اچانک اسے خیال آیا وہ یہ بھی تو کہہ سکتی تھی کہ 'تم میرے لئے اپنا مذہب تبدیل کرلو، یا وہ یہ بھی پوچھ سکتی تھی کہ 'کیا تم میرے لئے اپنا مذہب تبدیل کرلو گے؟' اگر ایسا ہوتا تو نوازش کے پاس اس کا کیا جواب ہوتا۔۔؟ مگر اس نے نوازش کو ہر آزمائش اور الجھن یا شرمندگی سے بچالیا تھا صرف ایک "چپ"۔۔۔۔ جان لیوا چپ سے۔!!

وہ ایک لڑکی کو مسلمان کرنے جارہا ہے۔ مگر یہ تفاخر اس کے اندر اطمینان نہ پیدا کرسکا تھا۔ اس کے لاشعور میں کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ضرور تھا جو اسے اندر ہی اندر ملول کئے ہوئے رکھتا۔ اور پھر شاہدہ سے نیلسن کے بارے میں گفتگو کر کے وہ مزید الجھ سا گیا تھا۔ شاہدہ کا خیال نوازش سے بالکل مختلف تھا۔ رات بھر وہ دل و دماغ کی دلائل کی کشمکش میں الجھا رہا۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ دن تو ادھر ادھر کی مصروفیات میں گزر جاتا تھا مگر رات کی فارغ تنہائی میں وہ اسی پہلو سوچتا رہتا۔ ایک دو عالموں سے بھی اس نے اس بابت پوچھا ان کا خیال بلکہ تاکید تھی کہ اس نیک کام میں دیر نہ کرے مگر اس کا دل اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ وہ کسی کی دل کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اسے مسلمان کرے۔ اس ضمن میں شاہدہ کا موقف اس کے دماغ کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ الجھ الجھ کر اپنے آپ کو سلجھانے کی کوشش میں مزید الجھتا جارہا تھا۔ آخر ایک رات اس نے استخارہ کر کے رہنمائی حاصل کرنے کی ٹھانی۔ اس نے نعرہ مارا۔۔ یا صاحب الزماں ادرکنی!!۔۔ اور لیٹے لیٹے سو گیا۔ پھر کیا ہوا۔۔۔ وہ کوئی خواب تھا یا الہام یا القا۔۔ یا اچانک کچھ اور۔۔۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ شاید اولگا میڈم، نیلسن سے مخاطب تھی۔۔ وہ سن رہا تھا۔ "نادان لڑکی! تمہارے شعور پر لاابالی جذبوں کی جھاگ چڑھی ہے وقت کی حدت اور معاشرتی اور سماجی حقیقتوں کی تلخ تمازت جب یہ جھاگ اڑا لے جائے گی تو تمہارے پاس پچھتاوے کے سوا کیا رہ جائے گا۔ محبت کے رائج تصور

کی انت انتہا شادی ہی تو ہے جو اولاً جسمانی لذائذ سے متصف ہے، نسل انسانی کے تسلسل اور منشائے قدرت کی تعمیل کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔۔۔۔۔۔۔اب اولگا میڈم کا تخاطب نوازش تھا۔۔۔۔۔اور پھر جولڑکی ایک جسمانی تلذذ کے لئے اپنے روحانی رشتوں کو ترک کر رہی ہے۔ وہ کل کو کسی اور کے لئے تمہیں ترک کر سکتی ہے۔۔۔'' اس کی آنکھ کھلی اتنی شستہ اور بڑھیا اردو، اولگا میڈم کی نہیں ہو سکتی۔تو پھر کون۔۔کون ہے جو اس کے اردگرد آواز بن کر طواف کر رہا تھا۔۔۔نیم خوابی کے عالم میں وہ بڑبڑایا۔۔۔تو کیا صرف جسمانی۔۔۔۔گویا محبت کی دیوی دو جسموں کی بیساکھیوں کے سہارے سے چلتی ہے۔یہ بیساکھیاں یا ان میں سے ایک ٹوٹ بھی سکتی ہے چھوٹ بھی سکتی ہے۔۔۔تو پھر محبت کا انجام کیا ہوگا۔محبت کہاں جائے گی۔۔۔!!!وہ سنتا رہا اور سوچوں میں الجھتا رہا۔پھر۔۔۔۔! کیا کرے۔۔ وہ کیا کرے۔۔۔؟ پھر وہ سو گیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے۔

اور اگلے دن۔۔۔۔جامعہ میں سیشن کا آخری دن تھا۔۔۔۔۔۔اس نے نیلسن کو تمہید طولانی کے بعد اپنا فیصلہ سنا دیا۔نیلسن نے کچھ نہ کہا وہ چپ چاپ کھڑی اسے، اس کے نظریں چراتے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور جب وہ بات ختم کر چکا تو نیلسن نے نرمی اور معصومیت سے پوچھا ''اب میں جاؤں؟''

"as you wish "۔نوازش نے اس کی طرف دیکھے بغیر۔۔۔۔بادل نخواستہ کہا۔

نیلسن سے یہ اس کی آخری بات تھی۔نیلسن نے دھیمے سے زیر لب دہرایا۔ !!wish '' اور ایک ہلکی سی سرد آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھا اور چلی گئی۔

نیلسن چلی گئی مگر اس کی یہ معصوم ادا۔۔۔۔اس کی چپ!۔۔۔اس کی سرد آہ۔۔۔!

نوازش تڑپ کر رہ گیا۔کئی روز تک رات کی تنہائیوں میں نیلسن کا چپ چہرہ اسے اس کے کیے پر، کہے پر خون کے آنسو رلاتا رہا۔نیلسن کے اس غیر متوقع اور غیر معمولی ردعمل نے اس کی روح کو کئی ماہ تک اضطراب اور احساس گناہ میں مبتلا رکھا۔جب بھی وہ تنہا ہوتا نیلسن کا خیال ایک آسیب کی طرح اسے آن لیتا۔کئی مرتبہ رات کی تنہائی میں اسے نیلسن سسکیاں لیتی محسوس ہوتی۔کبھی خواب میں اس کی خاموش آنکھیں اسے گھورتیں۔کبھی خلوت میں، کبھی جلوت میں۔اس کا خیال اسے جکڑ لیتا۔اور کبھی کبھار وہ یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا کہ کیا تقدیر نے اس کا دل توڑنے کے لئے اسے چنا تھا۔؟؟اس خیال کے آتے ہی اسے اپنی قسمت سے نفرت ہونے لگتی۔اسے یاد آتا کہ جو شعرائے

مقدر کا رونا رویا ہے اور قسمت کی خرابی کے مضامین باندھے ہیں ان کے پس منظر میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت بھی ہوئی کہ نیلسن کا خیال سلسلہ، کلام توڑ دیتا۔ اس نے سوچا کہ کسی ماہر نفسیات سے رابطہ کرے۔۔۔۔ کیا! مگر جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ اس طرح تو وہ مزید نفسیاتی مریض ہو جائے گا۔ پھر چلتے چلتے ایک دن اس کی بے چینی اسے تعویذ گنڈے والوں کے پاس لے گئی۔ مگر پیسے بٹورنے کے ہنر کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ قسمت کا حال بتانے والے اپنے حال سے بھی بے خبر تھے۔۔۔۔ پھر کسی نے پیروں فقیروں کی دس دی۔ چنانچہ اس بازار میں بھی سچا سودا دستیاب نہ ہوا۔ کوئی شیرینی کے نام پر تو کوئی صدقے کے نام پر پیسے وصول کرتا تھا۔ کسی کو اپنے مدرسے کے یتیم طلبہ اور غریب بچیوں کی شادیوں کے لئے دھن درکار ہوتا۔ کسی کو کالے بکرے کی سری پر عمل کر کے اس کالے عمل کا توڑ کرنا ہوتا جو بقول ان کے، نیلسن نے اس پر کروایا تھا۔ کسی کو عراق سے تریاق منگوانے کے لئے اور کسی کو نقش لکھنے کے لئے زعفران اور صندل کی لکڑی کا قلم درکار ہوتا۔ زعفران وہ جو ایران سے اور صندل وہ جو ہندوستان سے آئے گا۔ ظاہر ہے ان تمام کارروائیوں کے لئے روپیہ درکار تھا۔ مگر یہ روپیہ حصول مقصد کا ذریعہ نہیں بلکہ منتہائے مقصد تھا۔۔۔۔ کیا کرے؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا۔ کہاں جائے۔ نیلسن کیوں اسے تنگ کرتی ہے۔ کیا واقعی نیلسن نے اس پر کالا جادو کروایا ہے۔ نہیں! وہ ایسا نہیں کر سکتی۔۔۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی۔۔۔۔" وہ اپنے آپ کو سمجھاتا اپنے ذہن کو سلجھاتا۔ مگر مزید الجھ جاتا۔ اسی الجھاؤ نے اسے نئے نئے راستے دکھائے۔ انہی دنوں اس نے شہر بھر کے اولیاء کی قبروں پر زیارت کی راہ دیکھی۔ وہ کہیں سے بھی گزر رہا ہوتا۔ سرِ راہے جو بھی مزار آتا وہاں رکتا: نماز کا وقت ہوتا تو نماز پڑھتا، ورنہ فاتحہ پڑھ کر وہاں سے نکلتا۔ اس عمل سے اسے کچھ سکون ملتا تھا۔ خاص طور پر میانی صاحب کے قبرستان میں۔۔۔ اس زمین میں کتنے کتنے بلند آسماں، غازی علم دین شہید، تحریکِ پاکستان کے پہلے شہید۔ محمد مالک۔ اختر شیرانی، طاہر بندگی، شورش کاشمیری۔ حمید نظامی۔ آغا حشر۔ احسان دانش۔ میجر شبیر شہید (نشانِ حیدر) چراغ حسن حسرت۔ سعادت حسن منٹو۔ خواجہ رفیق شہید۔ جمعرات کی گہری راتوں تک مزاروں پر مشاہیر کی قبروں پر بیٹھ کر اسے سکون ملتا۔۔۔

"کیا قبروں پر جانے سے سکون ملتا ہے؟" کبھی کبھی اس کے ذہن میں یہ سوال جھانکتا۔۔

"کیا خبر؟ مگر مجھے ملتا ہے۔ مجھے اتنی تحقیق سے کیا مطلب۔۔ بس مجھے ملتا ہے۔" وہ اپنے آپ کو

جواب دیتا۔

''تو کیا وہ اسی طرح شہر ہنگاموں اور زندگی کی شورشوں سے دور شہر خموشاں کی ویرانیوں میں کھویا رہے گا۔'' اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔۔۔

گول باغ کے کونے میں ایک بنچ پر بیٹھا وہ کافی دیر تک نیلسن کے بارے میں سوچتا رہا۔ نجانے وہ کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی اور کس کے ساتھ ہوگی۔ ''کیا پتہ میری سیدھی بچی باتوں نے اس کا کتنا دل دکھایا تھا۔ اس نے لب سے ایک لفظ بھی تو نہیں نکالا تھا''۔ شاید اسے نیلسن کی بددعا لگی۔ مگر نہیں نیلسن ایسا نہیں کر سکتی ''میں نے اسے کوئی دھوکہ نہیں دیا میں نے اسے کوئی وعدہ وعید نہیں کیا تھا۔'' وہ خود کو قائل کرنے کی کوشش کرتا مگر یہ احساس کہ 'تم نے اس کی امید توڑی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کے دل سے آہ نکلی ہو! یا اس نے جادو وو!!!'۔۔۔نہیں! نیلسن ایسی نہیں تھی، وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ ہم نے محبت کی ہے دشمنی نہیں! نیلسن کی یاد ایک بار پھر بے چینی اور ملال بن کر اس کی رگ رگ میں اتری ہوئی تھی۔۔

☆☆☆

درد دل دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا

ہر آدمی کے سامنے اس کے پیشہ ورانہ سفر میں کوئی آئیڈیل ضرور ہوتا ہے۔ جب نوازش نے لیکچرر شپ شروع کی تو اس کا آئیڈیل میڈم اولگا کی شخصیت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح میڈم اپنے طلبہ و طالبات میں ہر دلعزیز تھی وہ بھی اپنے طلبہ و طالبات میں ویسا ہی ہر دلعزیز قرار پائے۔ چنانچہ اس نے اپنی تمام مصروفیات اور مساعی کو اپنے طلبہ کی محبت اور ان پر محنت سے وابستہ کر دیا تھا۔ چنانچہ طلبہ و طالبات اس کو عزت اور احترام دیتے تھے۔ اس کا زیادہ وقت اپنے طلبہ کی گلیکسی میں گزرتا تھا۔ بعض اوقات جامعہ سے باہر شام کے وقت بھی ان کی نشستیں ہوا کرتیں۔ وہ اپنے سٹاف میں اور اپنے طلبہ میں انقلابی اور بیباک رویوں کی وجہ سے ایک خاص مقام کا حامل تھا۔ اس کی کلاس میں بھی بعض اوقات اس کے مزاج کی رمق واضح طور پر جھلکا کرتی۔ آج بھی ایک ایسا ہی روز تھا وہ ایم اے، سال پنجم کی کلاس میں گونج رہا تھا۔۔۔

"۔۔۔ تیسری دنیا کی پسماندگی کی بڑی وجہ موروثی پیشوں کا تسلسل ہے جو صدیوں کے فکری جمود کا نتیجہ ہے۔ کمی اپنے چودھری کی مٹھیاں بھرتے فخر ہے کہ اس کا باپ بھی بڑے چودھری کی مٹھیاں بھرا کرتا تھا۔ اس کا حقہ تازہ کرتا تھا اور دادا بھی۔۔۔! موضوع 'نظام ہائے معیشت' تھا مگر نوازش کا ذہن طبقاتی نظام اور فکری جمود کے حوالے سے پاکستان پر مرتکز تھا۔ اس کی تدریس میں یہی خرابی یا سقم تھا کہ وہ ایک اچھا استاد ہونے کے باوجود لیکچر کے دوران تدریس کے رائج تقاضوں کو فراموش کر کے حکیمانہ اور مفکرانہ گفتگو پر اتر آتا۔ اس کا یہ انداز اکثر طلبہ، جن کا مطمع نظر صرف ایم اے پاس کرنا تھا، کے لئے الجھن اور بیزاری کا باعث تھا۔ متعدد مرتبہ اسے زبانی اور تحریری طور پر یہ تنبیہ بھی کی گئی کہ اپنے لیکچر کو نصاب تک محدود رکھا کرے، وہ کوشش بھی کرتا مگر شاید یہ اس کے بس میں نہ تھا اور اس کی خوش قسمتی تھی کہ طلبہ کا ایک گروہ جو اس کے نظریات سے متفق تھا آڑے آجاتا آج بھی وہ اپنے موضوع سے کافی پرے ہٹ گیا تھا اس کی گفتگو اب اقبال کے سیاسی افکار کے گرد گھوم

رہی تھی۔۔۔'جس معاشرے میں کمی اپنے خاندانی کمی ہونے پر اتراتا ہو، اپنی غربت پر ناز کرتا ہو وہاں معاشیات کی کوئی تھیوری، یا نظریہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ جہاں سرمایہ دار کے گھر سرمایہ دار اور مزدور کے گھر میں مزدور پیدا ہوتا ہو جہاں غلامی طرز حیات بن جائے وہاں دنیا کا کوئی بھی تہذیبی نظام انقلاب نہیں لا سکتا۔۔ یہ طے ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

شعر پڑھنے کے بعد نوازش ذرا سانس لینے کو چپ ہوا تو نصرت نے اس کی چپ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔'سر یہاں ایک سوال بڑا اہم ہے اگر اجازت دیں تو پوچھوں؟

''جی پلیز!' نوازش نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ نصرت نشست سے اٹھنے لگی مگر نوازش نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، 'بیٹھے بیٹھے پوچھئے۔''

''شکریہ! سر میرے ذہن میں سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے، کیوں ہمارا غریب غربت پر بادل نخواستہ آمادہ ہے۔ کیا اس کی وجہ یا وجوہ کا کھوج لگانا معاشیات کے نفس مضمون کا حصہ نہیں؟

نوازش نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''میرے خیال میں سوشیالوجی اور نفسیات کے ماہرین اس سوال کا بہتر جواب تلاش کر سکتے ہیں مگر جہاں تک میرے اپنے مشاہدے یا تجزیے کا تعلق ہے۔ ہندوستان کے ہندو معاشرے میں اسلام کے اثر و نفوذ نے جس اسلامی معاشرت کو جنم دیا اس میں یہ کمی رہی کہ دائرہ اسلام میں آنے والے ہندو پورے کے پورے اسلام میں داخل نہیں ہوئے بلکہ وہ اپنی آستینوں میں بت بھی چھپا کر لے آئے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ برہمن کی سرداری مسلم معاشرے میں سادات کے حصے میں آئی۔ پنڈت اور پروہت کی برتری اسلامی لبادہ پہن کر سجادہ نشینی میں تبدیل ہو گئی اور یوں ذات پات کا فرسودہ نظام اپنی جملہ خرابیوں اور خباثتوں کے ساتھ آج بھی مستحکم بلکہ مستحکم تر ہے۔ اور اسی نظام کو سچا اور سُچا اسلام سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے عوام میں آئمہ طریقت، آئمہ شریعت سے بڑھ کر وڈیروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور سجادہ نشینوں کو روحانی پیشوا مانا جاتا ہے۔ جن کا سکھایا ہوا توکل ایک طرف سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو مضبوط کرتا ہے تو دوسری طرف غربت کو مشیت ایزدی مان کر پیشوں کے تسلسل کا جواز فراہم کرتا ہے۔'ابلیس کی مجلس شوریٰ' پڑھو، تمہارا ویژن کافی صاف ہو جائے گا۔

'مگر سر اس کا کوئی علاج بھی ہے؟' اب کے سوال گلیکسی کے جاوید عینکو کی طرف سے آیا۔ نوازش

نے بھی بڑے استعجابی انداز میں اس کے چہرے کے نقوش پڑھ کر اس کے سوال کی سنجیدگی کا اندازہ کیا۔ اور پھر سب کی طرف متوجہ ہو کر فیصلہ کن انداز میں بولا۔ 'تعلیم! صرف تعلیم۔ یہی ایک مسیحا ہے پاکستانی افراد کے مرضِ کہن کا۔'

'یہ سر ہمیں اقتصادیات پڑھا رہے ہیں یا اقبالیات؟' نازلی نے نگینہ کے کان میں سرگوشی کی اور چند لمحوں میں یہ بات ساری کلاس میں پھیل گئی۔ اور کھسر پھسر اور ہلکی ہلکی ہنسی نے کلاس کی فضا کو یکسر تبدیل کر دیا۔ جس کے نتیجے میں نوازش کا بھی خضوع و خشوع ٹوٹ گیا اس نے لیکچر ختم کرتے ہوئے کہا۔ 'میرا خیال ہے آپ بور ہو رہے ہیں۔۔۔ let us finish، جواباً تھینک یو سر اور نو سر جاری رکھئے کا شور اٹھا مگر نوازش اپنے کاغذات اور کتابیں سمیٹ کر کلاس سے باہر نکل گیا۔

'یار اچھا خاصا لیکچر چل رہا تھا۔۔۔ یہ کس کو کھرک ہوئی تھی۔' کامریڈ نے کینٹین میں اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے جاوید عینکو اور پوچھا۔ اس دوران گلیکسی' کے دیگر دو ارکان نازلی اور نگینہ بھی آ گئے نازاں نے کہا میں بتاؤں؟' کامریڈ نے 'ہوں' کہہ کر نازاں کی طرف دیکھا اس نے نازلی اور نگینہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ 'پہلے نازلی اور پھر نگینہ کو اچانک یہ مرض۔۔۔' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر دونوں کی طرف دیکھا۔ نازلی کو ساری صورت حال سمجھ آ گئی۔ ارے یار ایسے ہی میرے دماغ میں جملہ آیا میں نے اس مراثن کو بتا دیا اور اس نے بات آگے چلا دی۔' نگینہ نے ہنستے ہوئے کہا دراصل' جملہ تھا ہی برمحل اور برجستہ۔ بے اختیار میری ہنسی نکل گئی اور پھر۔۔۔'

کامریڈ نے ناراضی سے کہا۔ 'تم نے ضرور لیکچر میں اپنا لچ تلنا تھا۔'

اسی اثنا میں نوازش کینٹین کے پاس سے گزرتے ہوئے سٹاف روم کی طرف جا رہا تھا۔ کامریڈ باہر کی طرف لپکا اور اصرار کر کے اسے گلیکسی میں لے آیا۔ 'ہاں بھئی کیا ہو رہا ہے؟'

نوازش نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مگر کسی کا جواب نہ پا کر کہا 'بوریت دور ہو رہی ہے۔'

'نفیس نے کہا نہیں سر ہم اس بدبخت کا ذکر کر رہے تھے جس نے سارے لیکچر کا بیڑا غرق کر دیا' یہ کہہ کر اس نے نازلی کی طرف دیکھا اور نازلی نے اس کا منہ چڑایا اور آنکھیں نکالتے ہوئے کسمسا کر رہ گئی نوازش کے علاوہ باقی سب اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ مگر جب نوازش نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ 'کیوں نازلی؟ لگتا ہے تم کلاس میں سب سے زیادہ بور ہو رہی تھی۔۔۔ ہے نا؟' نازلی ذرا جھینپ گئی۔ 'اچھا چھوڑو اور سناؤ کیا ہو رہا ہے' نوازش نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔ کامریڈ نے کہا'' ویسے کیا صورت حال ہے؟''

"کس کی، کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟"

"سر یہ سیاستِ دوراں کی بات کر رہا ہے۔۔ جتنی فکر اسے صورتِ حال کی ہے اس سے اگر ایک تہائی یہ پڑھائی کے بارے میں کرتا تو آج ہمارا لیکچرار ہوتا' نفیس نے کہا۔ مگر اس سے پہلے کہ نوازش بات بڑھاتا نگینہ نے مسکرا کر کامریڈ کی طرف دیکھتے ہوئے نفیس سے کہا۔' ویسے اگر کامریڈ ہمارا استاد ہوتا تو۔۔۔"

"۔۔۔ بڑا ہی استاد ہوتا' نازلی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔' نہیں مذاق نہیں، واقعی اگر یہ ہمارا استاد ہوتا تو بڑا مزا آتا۔ اس کی اور نفیس کی خوب ٹھنتی۔' نگینہ نے اپنی بات مکمل کرلی تو کامریڈ نے کہا' میں اسے کلاس میں گھسنے ہی نہ دیتا۔ ایسے فضول، نصابی کیڑے کے لئے کم از کم میری کلاس میں کوئی جگہ نہ ہوتی۔"

"چل بے چریا اپنی خیر منا، ڈیپارٹمنٹ تمہارے باپ کا نہیں۔ ایک معمولی سے لیکچرار کی کیا اوقات! اگر ایسے ہی ارادے ہیں تو وائس چانسلر یا ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہونے کے خواب دیکھا کرو' نفیس نے جوابِ آں غزل دیا۔ نوازش نے نفیس کی بات پکڑتے ہوئے کہا۔' چلو میری اوقات تو، مجھے پتہ چل ہی گئی۔"

"نہیں سر ایسی بات قطعاً نہیں۔ آپ کو ہم لیکچرار کہاں سمجھتے ہیں۔ آپ تو ہمارے اسم بامسمیٰ استاد اور دوست ہیں۔" نفیس نے صفائی پیش کی۔ اس کی شرمندگی اور کھسیانا پن اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

نازاں نے کہا۔" سر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کہ آپ کے بارے میں کوئی ایسا سوچے۔ سر آپ تو ہمارے آئیڈیل استاد ہیں۔"

نازلی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔" سر آپ کے منہ کی بات نہیں بلکہ ہم اکثر۔۔۔ آپ کی شخصیت اور آپ کے رویے کو discuss کرتے ہیں تو آپ جیسا سر کوئی بھی نہیں نظر آتا۔"

کامریڈ جو اتنی دیر تک چپ ان کی صفائیاں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔" ویسے سر یہ بات بالکل ٹھیک ہے یہ نفیس کو تو بکواس کرنے کی عادت ہے۔ لیکن سر یہ بات سچ ہے کہ آپ سے سب سے زیادہ نفیس اور نازاں متاثر، اور بے حد متاثر ہیں۔۔۔ اور سر آپ ہمارے لئے لیکچرار نہیں ہیں بلکہ ہمارے دوست ہیں۔" کامریڈ نے دعویٰ کرتے ہوئے کہا۔

نوازش نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ذرا نرم لہجے میں پوچھا۔" یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

کامریڈ نے کہا۔ ''سر آپ کو دو سے زائد مرتبہ پرنسپل صاحب نے بلا کر اور ایک دفعہ تحریری طور پر بھی طلبہ، خاص طور پر گلیکسی سے غیر رسمی روابط ختم کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔''

نوازش نے حیرانی سے پہلے کامریڈ اور پھر سب کی طرف باری باری دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے نہیں پتہ تھا کہ گلیکسی کسی انٹیلی جنس ایجنسی کا نام ہے میں تو سمجھتا تھا کہ سیدھے سیدھے چند لڑکوں اور چند نہایت ہی شریف قسم کی لڑکیوں کا ایک گروپ ہے۔۔ گلیکسی!''

نگینہ نے کہا۔ ''آپ کا خیال غلط ہو ہی نہیں سکتا، خاص طور پر آپ کے خیال کا دوسرا حصہ تو بالکل بلکہ دو سو فیصد درست ہے۔''

نفیس نے کہا۔ ''پرسنٹیج تھوڑی کم کر لو۔''

نوازش نے ویٹر کو آواز دی۔ ''بوٹے چائے۔۔'' اور بوٹے نے دور سے ہاتھ کے اشارے سے نفوس گن کر پینٹری والے کو آواز لگا دی۔۔ ''۔چھے چائے، نوازش صاب کی لگاؤ۔''

چائے کی چسکی لیتے ہوئے نوازش نے کہا۔ ''تمہاری انٹیلی جنس ابھی کمزور ہے۔''

سب نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ نوازش نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یونین کی طرف سے بھی خاکسار کو اپنے میل جول پر نظر ثانی کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔''

''کیا مطلب سر جی؟'' نازاں نے پوچھا۔

کامریڈ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ارے صاف طور پر کہ سمجھ لو کہ سر کو دھمکی دی ہے کہ ہم سے میل جول ختم کر لیں۔'' پھر وہ نوازش کی طرف متوجہ ہوا۔ ''سر ہم نے چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔۔ جامعہ کسی کے باپ کی نہیں۔ آپ پرواہ نہ کریں۔''

نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ارے جذباتی نہ بنو۔ میں صرف تمہاری معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔'' پھر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''نوازش علی اپنی جنگ اکیلا لڑتا آیا ہے۔''

ندرت نے اخبار کھولتے ہوئے کہا۔ ''آج ایک خبر بڑی دلچسپ ہے۔''

نوازش نے پوچھا۔ ''ایسی کون سی خبر ہے۔''

ندرت مزے لے لے کر اخبار پڑھنے لگی۔ ''آج عائلی عدالت میں ایک ایسا طلاق کا مقدمہ پیش ہوا ہے، جس میں طلاق کی وجہ ازدواجی یا خانگی نہیں۔۔۔''

'ازدواجی! خانگی؟۔۔ یہ کیا ہوتا ہے۔ یار سلیس اردو میں بات کرو۔'' نفیس نے ندرت کو ٹوکا۔

ندرت نے کہا۔ ''یار اخبار میں یہی لکھا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے پھر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔''

۔۔ایک شخص نے محض اس لئے اپنی بیوی کو طلاق کا نوٹس بھجوایا ہے کہ وہ بھٹو کی فین ہے اور پیپلز پارٹی کی ورکر ہے جبکہ اس کا خاوند چیئر مین بھٹو کا شدید مخالف اور جمعیت علمائے اسلام کا شدید حامی ہے۔''

''husband has right to divorce!'' کامریڈ نے مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔نگینہ اور نازلی نے بیک وقت غصے سے اس کی طرف دیکھا۔اس نے سر کو جنبش دے کر کندھے اچکاتے ہوئے بات جاری رکھی۔''۔۔۔میں نہیں کہہ رہا تمہارے اسلام نے یہ حق مرد کو عطا کیا ہے۔۔۔میں نے خود پڑھا ہے تفہیم القرآن میں!!!''

''ویسے سر آپ کیا کہتے ہیں؟'' نازاں نے نرم لہجے میں نوازش کو مخاطب کیا۔

نوازش نے کہا'' بحث کو چھوڑو اس خاص واقعے کے حوالے سے ہمارے معاشرتی شعور کے مطالعے کی ضرورت ہے۔''

نگینہ نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔'' سر! میاں بیوی کا معاملہ بڑا عجیب ہوتا ہے۔ذرا سی بات پر جز بز ہو جانا اور تھوڑی دیر بعد پھر اک مِک ہو جانا۔۔۔۔''

''ماشاءاللہ کافی تجربہ ہے۔'' کامریڈ نے نگینہ کی بات کاٹتے ہوئے شوخی سے کہا۔

''تجربہ نہیں تجزیہ۔ہر گھر میں یہی ہوتا ہے۔میں جب سے شعور میں آئی اپنے گھر میں یہی دیکھ رہی ہوں۔تمہارے اندر یا تو ابھی تک شعور نہیں اترا یا پھر تمہارا کوئی گھر نہیں۔' نگینہ نے کامریڈ پر چوٹ کی۔

کامریڈ کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ نوازش نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ کروا دیا اور کھنگار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔'' جہاں تک اسلام کا تعلق ہے عورت اور مرد کے حقوق مساوی ہیں۔ان حقوق کی تفویض۔۔۔۔''

مرد کو طلاق تو عورت کو خلع کا حق ہے۔مگر حق کے استعمال کے سلسلے میں اسلام نے جس احتیاط اور استدلال کا تقاضہ کیا ہے دراصل گڑ بڑ یہاں ہوئی ہے۔ہر کسی نے اپنی فہم اور منفعت کے مطابق تشریح اور تنفیذ کی ہے۔'' نازلی، جو بڑی دیر سے اپنی بات منہ میں دبائے نوازش کو سن رہی تھی۔اس سے مزید چپ نہ رہا گیا۔' سر میں تو سمجھتی ہوں ہمارے ہاں عورت کو اللہ میاں کی گاں سمجھا جاتا ہے۔' نوازش نے اس کے بولنے کا حق آخر کار تسلیم کر ہی لیا اور اپنی بات ادھوری چھوڑ کر بولا۔'' ہاں ٹھیک ہے۔ذرا بتاؤ تو یورپ جو تمہارا source of inspiration ہے وہاں

عورت کو کیا سمجھا جاتا ہے؟''

''سر یورپ میں عورت کے حقوق مقرر ہیں۔ عورت اپنے فیصلوں میں آزاد ہے۔ جو چاہے کرتی ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔'' نازلی نے استدلال پیش کیا۔ ''اب دیکھیں نا یورپی عورت مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے۔ اسے مرد کے برابر کے حقوق حاصل ہیں۔''

نوازش نے کہا۔ ''بس یہی ایک جھانسہ ہے عورت کو آزادی کا جھانسہ دے کر اسے مرد کے شانہ بشانہ لاکر ذلیل کرنے کے ہنر کو مشرق کی سادہ لوح عورت، آزادی نسواں کا نام دیتی ہے۔ ذرا غور کرو کہ عورت سے گھر کی راجدھانی چھین کر اسے سڑک پر لاکھڑا کرنے کی روش کو تم عورت کی آزادی سمجھتی ہو۔''

''اور کیا ہے یہ آزادی نہیں؟'' نازلی نے کہا۔

''کیا آزادی ہے، وقت پر دفتر جانا، وہ دفتری امور کی انجام دہی کی پابند ہے۔ نازلی سمجھنے کی کوشش کرو۔ اور پھر فیصلہ کرو کہ گھر کی پابندی بھلی یا باہر کی۔ انسان ہر حال میں پابند ہے۔ مرد ہمارے معاشرے میں جس آزادی سے دندناتا پھرتا ہے ذرا اس کے اختیارات کے پیچھے چھپے اس کے فرائض کی فہرست دیکھو۔۔۔۔''

''سر آپ مرد ہیں نا آپ اسی لئے مرد کی بڑائی بیان کر رہے ہیں۔'' نازلی ماننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ مگر نوازش نے متحمل انداز میں بات جاری رکھی۔ ''اللہ تعالیٰ نے عورت کو زندگی کا جو نصاب دیا ہے اس کا امتحان بھی اسی کے مطابق ہے''

''سر نصاب سے آپ کی کیا مراد ہے۔؟'' نازلی نے اس کی بات میں پہلی مرتبہ دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

نوازش نے کہا۔ ''نصاب سے میری مراد اس کے حقوق اور فرائض ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔۔۔ جہاں تک حقوق اللہ کا تعلق ہے، نماز کی چھوٹ مرد کو کسی طرح اور کسی بھی حالت میں نہیں مگر عورت کو مخصوص ایام میں نماز کی چھوٹ ہے۔ عورت پر زکوۃ فرض نہیں، جہاد اور حج اس طرح فرض نہیں جس طرح کہ مرد پر فرض ہے۔ اگر صاحب نصاب ہونے کے باوجود مرد یعنی خاوند عورت کو حج کی اجازت نہیں دیتا تو اس کا گناہ اور پرسش عورت پر نہیں۔ اللہ کو جواب دہ مرد ہے۔ جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے عورت کی کفالت کی ذمہ داری مرد کی ہے۔ بہن ہے تو بھائی، ماں ہے تو بیٹا، بیوی ہے تو خاوند۔ عورت اپنی اولاد کو دودھ پلانے کا معاوضہ طلب کرنے کی حقدار ہے

اور مرد پر عند الطلب ادائیگی فرض ہے اتنے سارے حقوق کے بعد اس پر کچھ ذمہ داریاں اور فرائض بھی عاید ہیں۔ مثلاً عورت بطور بیوی مرد کی امانت اور اپنی عصمت کی امین اور خاوند کی مطیع ہو۔ انتظامی اور دیگر عائلی معاملات میں اس کے احکامات کی پیروی کرے۔ اسی کو یورپ اور دیگر غیر اسلامی دنیا میں عورت کی انہی ذمہ داریوں کو اجاگر کر کے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا ہے۔۔۔''

نگینہ نے کہا۔' مگر سر ہمارے معاشرتی رواجوں کے حوالے سے تو آپ کی بات بڑی اجنبی سی لگتی ہے۔ مثلاً بہشتی زیور نے بیوی کی جو تصویر پیش کی ہے۔۔۔۔' ندرت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔' میری خبر کا کیا ہوا؟

آپ لوگ تو بہشت کے اور زیور کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔''

''میرا خیال ہے یہ عورت کے حقوق پر ڈاکہ ہے۔'' کامریڈ نے دانشورانہ انداز میں کہا۔

نفیس نے کہا'' مگر عورت کو یہ حق کہاں حاصل ہے کہ ایک مرد کے نکاح میں رہتے ہوئے دوسرے کے سپنے دیکھے۔''

ندرت نے کہا'' وہ سپنے تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ تو اپنا جمہوری حق استعمال کر رہی تھی۔''

نفیس نے کہا'' تو پھر ٹھیک ہے مرد نے اپنا شرعی حق استعمال کر لیا۔ حساب برابر!!''

ندرت نے بھولپن سے کہا۔'' سر جی، وہ آپ نے بتایا نہیں کہ اس طلاق کے معاملے میں قصوروار کون ہے۔''

نوازش نے کہا'' بھئی ظاہراً تو اس میں عورت قصوروار نظر آتی ہے کہ اس نے خاوند کی مرضی کو پیش نظر نہیں رکھا۔ حالانکہ اسے اپنے خاوند پر پورا بھروسہ ہونا چاہئے تھا۔ مگر حقیقی سطح پر مرد قصوروار ہے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اگر اختیار دیا ہے عدل کا تو احسان کا بھی حکم دیا ہے وہ درگزر کر سکتا ہے۔ اور یہ کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی جس کی کہ نا صرف اپنی بیوی کو بلکہ خود کو بھی سزا دے۔ اور اگر ان کی اولاد بھی ہے تو یہ ایک اور زیادتی ہے۔ بہر حال یہ بات معاشرتی اعتبار سے کسی طور بھی احسن نہیں۔ جہاں تک تعلق ہے شرع کا تو اس کا میرے پاس کوئی خاص علم نہیں۔ چنانچہ اگر آپ لوگوں کی تشفی نہیں ہوئی تو کسی عالم سے رجوع کریں۔''

''میرا خیال ہے کافی ہے اتنی تسلی کافی ہے۔ کیوں ندرت؟'' کامریڈ نے پوچھا۔

ندرت نے اطمینان بھرے انداز میں سر کو دائیں بائیں ہلایا۔'' چلو شکر ہے!''

"چلیں؟" نوازش نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور سب نے ہم آواز تھینک یو سر کہا اور یوں یہ مجلس بر خاست ہوئی۔

سالانہ تقریبات کا آج پہلا روز تھا فیصل آڈیٹوریم طلبہ وطالبات سے بھرا ہوا تھا۔ وقت شام تھا سٹیج پر ایک سال پنجم کے طالبعلم نشاط نقوی نے ایک اپنے مزاحیہ خطاب یوں شروع کیا۔

معزز اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ وطالبات! الحمدللہ! اہل پاکستان کو انیس سو سینتالیس کا بھولا ہوا سبق یاد آ گیا ہے۔ ان دنوں سیاستدانوں کا اتحاد اسلامی نظام کے نعرے لگا رہا ہے عوامی بادشاہ نے عوام کے جذبہ اسلامی کو دیکھتے ہوئے، اپنا اقتدار بچانے کے لئے بدست خود زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی روح پھونکنے کا اعلان کیا ہے اگر ایسا ہو گیا تو اس نے اثرات زندگی کے تمام شعبوں پر مرتب ہونے کی توقع ہے۔ چند شعبوں پر ہماری بھی نظر ہے۔۔۔ فلم کا شعبہ ہی لے لیجئے۔ فلموں کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ فلموں کے ناموں پر بھی فرق پڑے گا۔ مثلاً ساون آیا تم نہیں آئے، پگ میرے ویر دی، کے بجائے رمضان آیا تم نہیں آئے اور مسجد میرے ویر دی، جیسے نام رکھے جائیں گے۔ ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں آیئے، قینچی چپل کے اشتہار میں کوثر نیازی، ٹی وی پر آئیں گے اور کیمرے کے سامنے بیٹھ کر کہیں گے۔ میں وضو کرتے وقت یہ چپل پہنتا ہوں۔ اسی طرح علامہ دریا آبادی کا واساکی کے اشتہار میں آئیں گے، فرمائیں گے۔ جب بھی میں جماعت سے لیٹ ہونے لگتا ہوں کا واساکی مجھے بروقت تکبیر اولیٰ پر مسجد میں پہنچا دیتی ہے۔ آپ بھی نماز باجماعت کی ادئیگی کے لئے مسجد جاتے وقت کا واساکی پر انحصار کریں۔۔۔۔"

۔۔۔ ہال میں لوگوں کے قہقہے گونج رہے تھے کہ اچانک ایک للکار گونجی۔ او کافر، مرتد، تم نے شعائر اللہ کا مذاق اڑایا ہے تیرا قتل مجھ پر واجب ہو گیا ہے ایم بی اے کا ایک ملا مسلک طالبعلم ڈائس پر کھڑے مقرر کی طرف لپکا اور مجمع درہم برہم ہو گیا۔

گلیکسی کے ارکان اس تمام 'ہنگامہ گلزار' سے دور نہر کنارے یونیورسٹی بوٹس میں بیٹھے اپنی گفتگو میں مگن تھے جب نجیب نے آ کر انہیں یہ خبر سنائی اور ساتھ مشورہ دیا کہ یہاں سے اٹھ جائیں کیونکہ طلبہ و طالبات کی مخلوط محفلوں پر شب خون مارنا یونین والوں کا مرغوب مشغلہ ہے۔۔ ہر چند گلیکسی کو ان کی طرف سے نہ کوئی ایسی تنبیہ ملی تھی نہ دھمکی البتہ نجیب کو ایک بار ہا کیوں اور آہنی مکوں سے پیٹ چکے تھے۔ کیونکہ وہ بھی کامریڈ کی طرح کھل کر سرخا تھا۔ جبکہ گلیکسی کی

اکثریت کا مسلک سیاست کے بجائے علم و آگہی تھا وہ اکثر ان ہنگاموں سے دور اپنی گفتگو اور اپنی الگ تھلگ جامعہ سے باہر میل ملاقاتوں اور نشستوں میں اپنا رنگ جماتے تھے اور یونین کے انتخابات میں امیدوار کی ذاتی قابلیت دیکھ کر اسے ووٹ دیتے تھے اور یہ تو طے ہے کہ سرخوں کے امیدواروں کی نسبت سبزوں کے امیدوار ذاتی سطح پر بہت بہتر ہوتے۔ اس لئے گلیکسی کے ووٹ اکثر انہیں کے حصے میں آتے تھے اس لئے گلیکسی کو کبھی غنڈہ گردی سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ بلکہ کامریڈ اور نجیب بھی گلیکسی کی وجہ سے یونین والوں سے محفوظ رہتے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ اٹھیں'' نگینہ نے کہا۔ نفیس نے ہنستے ہوئے کہا'' کیا بات ہے۔ سبزوں سے ڈر رہی ہو؟''

'ارے یار سبزے سے کیا ڈرنا۔' نگینہ نے کہا اور نازلی نے مذاقیہ لہجے میں کہا' یہ خود سبز چادر ہے۔' نگینہ نے چڑتے ہوئے کہا۔'' ایسی کوئی بات نہیں۔''

''اچھا!'' کامریڈ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔''۔ تو پھر وہ تمہیں دیکھ کر بھن، بھن کیوں کرنے لگتے ہیں؟''

''یہی اچھی بات ہے ان میں، شائستگی اور اخلاق، جو تم سرخوں کو چھو کر نہیں گزرا۔'' نگینہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ کامریڈ نے ڈھٹائی سے کہا' تو اس میں ہمارا کیا قصور اگر اخلاق نے ہمیں نہیں چھوا تو !!۔ ویسے نگینہ۔۔۔' کامریڈ نے سنجیدگی سے کہا' مجھ سے تمہیں کبھی کوئی، اس طرح کی۔۔''

''میں تمہاری نہیں سرخوں، نام نہاد ترقی پسندوں کی بات کر رہی ہوں۔'' نگینہ کا لہجہ قدرے معذرت خواہانہ تھا۔

''مگر نگینہ پچھلے سال نجیب کے ساتھ ان کے برتاؤ کو تم اگر شائستگی کہو تو میں بطور سرخ ناشائستگی کا الزام بخوشی قبول کرتا ہوں۔' کامریڈ کے لہجے میں اب غصہ بھی تھا۔ نازلی نے نجیب کے زخمی ہونے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

''ویسے نگینہ تم کیا کہتی ہو۔۔۔ اسلام میں یہ غنڈہ گردی۔ چہ معنی؟'' ندرت نے پوچھا۔

''کونسی غنڈہ گردی !! بھئی اسلام میں غنڈہ گردی کا کیا کام؟'' نگینہ نے ذرا بنتے ہوئے پوچھا۔ نجیب نے طنزیہ کہا۔''کس سے پوچھ رہی ہو، ندرت خانم! یہ لوگ تو منافقت کو سیاست اور غنڈہ گردی کو جہاد کا نام دے کر بھولے بھالے، سادہ لوح دیہاتی طلبہ کو بہکانے میں ماہر ہیں۔ اور نگینہ ہمارے درمیان انہی کی نمائندہ ہے۔۔۔ کیوں نگینہ؟'' نگینہ نے پہلے نجیب کی طرف غصے سے اور

پھر کامریڈ کی طرف یوں سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ نجیب مجھ پر الزام لگا رہا ہے اور تم سب لوگ چپ ہو۔ مگر اس کی نظروں کی زبان کوئی نہ سمجھ سکا اس نے نجیب کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بس نجیب! enough is enough ۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ ماحول کشیدہ ہو گیا۔ مگر ندرت نے پھر نگینہ کو console کرنے کے لئے کہا' نجیب، تم نے نگینہ پر بہتان لگایا۔ اگر یہ سبز چادر ہوتی تو اس وقت نہر کنارے جھولتی ہوئی کشتیوں میں لڑکوں کے ساتھ جھولنا نہ جھول رہی ہوتی۔' عام حالات میں نگینہ اس قسم کا جملہ ہضم کرنے کی متحمل نہ ہوتی شاید مگر اس وقت کیونکہ ندرت اس کی حمایت میں بول رہی تھی اس لئے وہ چپ رہی۔ کامریڈ نے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے آنکھیں گھما کر ندرت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'تمہارا استدلال ---مضبوط استدلال ہے۔'

نگینہ نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''یہ بات نجیب کو بتاؤ، جسے لڑکیوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔'
نفیس اور نازلی نے بیک وقت کہا۔ 'تو پھر یہ ان کی وکالت کیوں کرتی ہے۔''

''میں وکالت نہیں کرتی، سچ کو سچ کہتی ہوں جو نہ تمہیں کہنے کی عادت ہے نہ برداشت کرنے کی طاقت اور نہ ہی سننے کی توفیق ہے۔'' نگینہ نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ کامریڈ نے کان پر دھری سگریٹ منہ میں لے کر دیا سلائی کشتی کی ٹیک سے رگڑ کر جلائی اور سگریٹ سلگانے کے بعد لمبا کش کھینچا۔ '' ویسے دوستو برا مت ماننا، تم سب کم و بیش مودودی کے چمچے ہو۔ سوائے نجیب کے اور میرے!''

'میرا خیال ہے ایسی بات نہیں، نفیس نے کہا'' مولانا کی شخصیت متنازعہ ہونے کے باوجود کوئی ایسی معترضہ نہیں کہ اس سے بریت کا اظہار کیا جا سکے۔ مولانا اس صدی کا اسلامی دماغ ہے۔ تفہیم، مسلمانوں کو اس صدی کا سب سے بڑا تحفہ ہے---''

کامریڈ نے طنزیہ، ہوں ں ں کی۔ نفیس نے کہا۔ ''مذاق اپنی جگہ مگر کامریڈ تم، مولانا کی --- معاشیاتِ اسلام --- پڑھو۔ تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔''

''مجھے آنکھیں کھولنے کی ضرورت نہیں، تم کارل مارکس کی۔ Das capital -- پڑھو'' نفیس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''پڑھ چکا ہوں۔ تم نے بھی پڑھی ہے یا صرف نام سن کر ہی متاثر ہو گئے ہو؟''

نگینہ نے کہا۔ ''تم لوگ دراصل نئے نئے شہر آتے ہو تو یہ نئے نئے نام ٹالسٹائی، سٹالن، لینن اور

مارکس وغیرہ بہت attract کرتے ہیں گھریلو تربیت میں اسلامی فکر کا فقدان ہوتا ہے چنانچہ جو کمیونزم کی اچھائیاں سنتے ہیں ان پر فدا ہو کر کامریڈ کہلانے لگتے ہیں۔اور کمیونزم ہی کو بہترین ضابطہ زندگی سمجھنے لگتے ہیں اس پر طرہ یہ کہ روسی لٹریچر کی وافر فراہمی ،اور مادر پدر آزادی کا تصور۔۔ اپنے غلام غوث کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا۔کیوں غلام غوث عرف۔۔'' کامریڈ کھسیانا سا ہو کر بولا۔''تم سب۔۔سب اندر سے بنے ہو۔''

نازلی نے کہا۔''استغفراللہ۔۔۔''

کامریڈ نے بات جاری رکھی۔''تم سب مسلمان ہو۔'' سب نے بیک آواز کہا''الحمدللہ!!''

نگینہ نے ہونٹ سکیڑ کر ادائے بے نیازی سے گردن گھماتے ہوئے کہا۔''کوئی دلیل نہ ہو تو ہم مسلمان!!! ہونہہ! کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔'' کامریڈ نے کہا۔''دلائل تو بہت ہیں مگر پھر تمہارا اسلام خطرے میں پڑ جائے گا۔'' نفیس نے ہنستے ہوئے کہا دلائل تو شیطان کے پاس بھی بہت تھے۔'' نگینہ نے ہنستے ہوئے کہا''میرا خیال ہے سب سے بڑا کامریڈ شیطان تھا۔'' نفیس نے کہا ''اپنے کامریڈ کو بھی شیطان ہی سمجھو۔'' نازلی نے کہا''نہیں،کامریڈ کو شیطان نہ کہو'' ندرت نے پوچھا''کیوں؟'' نازلی نے کہا۔''شیطان مائنڈ کرے گا۔کامریڈ نے انکی باتوں کو ان سنی کرتے ہوئے کہا۔دلائل بہر حال کسی بھی حقیقت کے ادراک اور ثبوت کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

نفیس نے کہا۔''دلائل کا کیا ہے۔اللہ کو بے دلیل ماننا چاہیئے۔''

''ہوں ہونہہ!'' کامریڈ نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔'دلیل کے بغیر بات کیا بات ہوتی ہے؟۔۔۔!!'

کامریڈ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان سے ذرا فاصلے پر آم کے پیڑوں تلے ایک ہنڈا ون سیون فائیو آ کر رکی۔ گلے میں رومال ڈالے دو لڑکے کہ وضع قطع سے برادر دکھتے تھے،اترے اور انہوں نے تحکمانہ اشارے سے کامریڈ کو بلایا۔مگر اس سے پہلے کہ کامریڈ اٹھتا نفیس نے اٹھتے ہوئے کہا''بیٹھو میں جاتا ہوں،کچھ ارادے اچھے نہیں لگتے۔'' نفیس نے جا کر ان سے مصافحہ کیا اور چند لمحے تک ان کی گفتگو جاری رہی۔اس کے بعد وہ چلے گئے اور نفیس واپس آ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔اور کامریڈ سے پوچھا کل تم نے یونین کیخلاف جلوس نکالا تھا جس میں تم نے اسلامیہ میں قتل ہونے والے طالبعلم کے قتل کا الزام ہاسٹل ناظم پر لگایا تھا؟''

''الزام نہیں۔نشاندہی کی تھی!'' کامریڈ نے وضاحت کی۔

''کیا ضرورت تھی۔'' جاوید عینکو نے کہا۔

کامریڈ نے کہا۔ ’’کیوں؟ ضرورت کیوں نہیں۔ ایک بے گناہ، بے دردی سے قتل کردیا گیا اور ایک عینی شاہد اس کا اظہار نہ کرے۔‘‘

سب نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ کامریڈ نے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ’’میں اس وقت اپنے ایک دوست کے کمرے میں بیٹھا تھا جب مجھے گالی گلوچ کی آواز کی آئی۔ میں نے کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ ہاں! میں نے خود ان آنکھوں سے حافظ کے سینے میں خنجر گھونپتے ہوئے دیکھا۔‘‘ اور اگلے ہی دن علی الصبح ساری جامعہ میں نیو کیمپس اور اولڈ کیمپس میں دیواروں پر اشتہار چسپاں تھے۔۔۔ ’’سرخوں کی ایک اور غنڈہ گردی۔۔ اسلامیہ میں مطیع اللہ شہید کردیئے گئے۔‘‘ انتہا ہے منافقت کی۔ میں پوچھتا ہوں۔ کون تھا کہ جس نے رات کو پریس کھول کر یہ اشتہار چھاپے۔! کیا یہ تمہارا اسلام ہے؟ تم سب لوگ منافق ہو، اپنی بزدلی کو مصلحت اور بردباری کا نام دیتے ہو۔ اور اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہو۔‘‘ کامریڈ کافی جذباتی تھا اس لئے کسی نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا یا پھر کسی کے پاس اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ تھا اس کی آنکھوں میں سچ کا خون اترا ہوا تھا۔ جس کی سرخی اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ایک انسان کی موت کو دل کی اتھاہ گہرائی سے محسوس کیا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔ ’’۔۔۔ اپنا مفاد ہو تو تم قرآن سے آیت نکال کے لے آتے ہو۔۔۔ سچی گواہی نہ چھپاؤ۔۔۔ اور دوسری طرف اپنے مفاد کے لئے اسلام کے نام پر ہی تم سچی گواہی دینے والے کو دھمکاتے ہو۔۔ کل کو مجھے بھی قتل کر کے کیمپس کی دیواروں پر۔۔ سرخوں کی غنڈہ گردی کا ایک اور پوسٹر چسپاں کردیا جائے گا اور تم۔۔۔۔!‘‘

۔۔۔۔۔۔ اور پھر وہی ہوا۔ اگلے چند روز بعد اپنے کمرے میں خون میں لت پت مردہ پایا گیا۔ اس قتل کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا اس لئے برادروں نے ایف آئی آر نامعلوم قاتل کے خلاف درج کرائی۔ اور۔۔۔

’’سرخوں کی ایک اور غنڈہ گردی!!

غلام غوث کو نہایت بیدردی سے شہید کردیا گیا۔‘‘

یونیورسٹی کی دیواروں پر ایک نیا پوسٹر چسپاں کردیا گیا۔۔ کامریڈ کو شہادت کی سند عطا کرنے کے بعد یونیورسٹی گراؤنڈ ایک باریش برادر نے نماز جنازہ پڑھائی۔ برادران اسلام نے اس میں بھرپور شرکت کی۔ کامریڈ کا جنازہ اٹھا تو۔۔۔ فضا نعروں سے گونج رہی تھی۔

غوث تیرے خون سے۔۔۔انقلاب آئے گا۔
شہید کی جو موت ہے۔۔۔وہ قوم کی حیات ہے۔
لینن جی کے پیاروں کو۔۔۔ایک دھکا اور دو
ماؤ کے دلاروں کو۔۔۔۔۔ایک دھکا اور دو۔
گرتی ہوئی دیواروں کو۔۔۔۔ایک دھکا اور دو۔

سرخوں کے احتجاج کی صدائیں ان نعروں میں دب کر رہ گئیں اور لینن اور ماؤ کے پیارے کو ایمبولینس میں رکھ کر اس کے آبائی گاؤں کی طرف دھکا دے دیا گیا۔

تمہارے گھر میں قیامت کا شور برپا ہے۔
''محاذِ جنگ'' سے ہرکارہ ''تار لایا ہے
وہ جس کا ذکر تمہیں زندگی سے پیارا تھا
وہ بھائی ''نرغہء دشمن'' میں کام آیا ہے۔

اتنی جلدی سب کچھ ختم ہو گیا۔ کبھی ایسے بھی ہوا کرتا ہے۔۔ نگینہ ویران آنکھوں سے خلاؤں میں گھورنے لگی شاید کامریڈ کی اندوہناک پیش گوئی کی بازگشت سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ کامریڈ نے ابھی دو دن پہلے ہی تو کہا تھا۔۔۔۔' وہ سسک سسک کر رو دی۔

وہ دوستی تو خیر اب نصیبِ دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا

نفیس کل سے چپ تھا۔ شاید وہ بہت رو چکا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ گہری سنجیدگی نے لے لی تھی ندرت نے روتے ہوئے پوچھا تم چپ کیوں ہو، کیا سوچ رہے ہو۔۔ نفیس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا' انسان کو ضرورت سے زیادہ سچ نہیں بولنا چاہئے ورنہ جلد مر جاتا ہے۔

نوازش کل پاکستان اکانومسٹ کانفرنس میں شرکت کے بعد کراچی سے جب واپس آیا تو سارا منظر نامہ ہی بدل چکا تھا۔ اس کے پیریڈ میں کلاس روم پر کسی تعزیتی ریفرنس کا گماں ہو رہا تھا۔ وہ بمشکل خود کو نارمل رکھ سکا۔ کامریڈ کا چہرہ اس کے ذہن کے کینوس پر جما ہوا تھا اور وہ کرسی جس پر کامریڈ اس کی کلاس میں آخری مرتبہ بیٹھا تھا آج اتفاقاً خالی تھی اس کی نظر بار بار اس کرسی پر پڑتی اور اداس لوٹ آتی۔ خدا خدا کر کے پیریڈ ختم ہوا۔

پچھلے ماہ، ٹھیک اسی جگہ کیفے ٹیریا کی اسی میز پر قہقہے ابل رہے تھے۔ اور آج۔۔۔۔۔!! نواز ش نے کہا مجھے ایک فلمی شاعر کی نظم کی چند لائنیں یاد آ رہی ہیں۔۔ حسب حال ہیں، سنو!
سب نے نوازش کی طرف منتظر نظروں سے دیکھا اور نوازش کی پر سوز آواز سماعتوں میں سرایت کرنے لگی۔

کتنا بے بس ہے انساں کتنی سنگدل ہے دنیا
کتنوں کا لہو پیتی ہے، کیسی قاتل ہے دنیا
ہر صبح قضا کا موسم، ہر پھول کے ساتھ خزاں ہے
ہر شام فنا کی آندھی، ہر دیپ کے ساتھ دھواں ہے
اپنی اپنی منزل پہ ہر راہ سمٹ جائے گی
جلے پھولوں کی، بجھے دیپوں کی، یہ یاد بھی مٹ جائے گی

نوازش نے سر کو جنبش دے کر نظم ختم ہونے کا اشارہ دیا۔ تھوڑی دیر پہلے نازاں کی توجہ نوٹس بورڈ پر پوسٹر چسپاں کرتے ہوئے ایک لڑکے کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔
"استقبال رمضان پر عائشہ صدیقہؓ ہال میں طالبات کی خصوصی نشست۔۔۔"
وہ ایک دم اپنی کتابیں چھوڑ گولی کی سی سرعت کے ساتھ بھاگی اور پوسٹر اکھاڑ کر پھاڑ ڈالا۔ پوسٹر چسپاں کرنے والے لڑکے نے پلٹ کر دیکھا اور نازاں کی طرف تیزی سے بڑھا۔ وہ بڑبڑا رہی تھی اور پوسٹر کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔
لڑکے نے غیر ارادی طور پر اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ "کیا کر رہی ہو، بہن!"
نازاں چیخی۔ "خبردار۔۔ خبردار! جو مجھے بہن کہا۔ یہ رشتہ تم لوگوں کے منہ سے گالی لگتا ہے۔ منافقو! قاتلو!۔۔۔" اس نے زوردار جھٹکے سے اپنا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنا پلید ہاتھ مت لگاؤ" اس کا سانس پھول رہا تھا وہ ہانپ رہی تھی۔
لڑکے نے نہایت ملائمت سے کہا۔ "بہن۔ آپ اس وقت غصے میں ہیں۔ درود شریف پڑھیے۔ صبر کریں۔۔۔"
اسی اثنا میں سب اس کے پاس پہنچ گئے۔ نوازش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا اور وہ اس کے ساتھ لگ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔۔۔ "سر جی یہ مجھے بھی قتل کر دینگے اور

پھر ایک پوسٹر۔۔انہوں نے کامریڈ کو ماردیا۔ان مسلمانوں نے ایک کافر کو۔۔۔" اس نے سر اٹھا کر بھیگی بھیگی سرخ آنکھوں سے نوازش کی طرف دیکھا۔معصومیت، بے چارگی، بے بسی اور کرب دروں اس کی خوبصورت آنکھوں میں اتر آیا تھا۔نوازش کا جی چاہا کہ وہ اسے اپنے دامن میں کچھ اور دیر تک سمیٹے رہے۔مگر اس نے اپنی اس خواہش کو نظر انداز کرتے ہوئے اشارے سے ندرت کو قریب بلایا اور نازاں کو خود سے الگ کر کے اس کے حوالے کر دیا اور خود سٹاف روم کی طرف چلا گیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ دھیرے دھیرے
وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے

نازاں بھی اب نارمل ہو چکی تھی۔مگر نوازش کبھی کبھار نازاں کو دیکھ کر اس کے لمس کی حرارت اپنے وجود پر محسوس کرتا تھا۔کرب کی شدت میں نازاں کا اسے دیکھنا اس کے لاشعور اور طرز احساس کا حصہ بن چکا تھا۔اب وہ نازاں سے اس بے باکی سے کلام کرنے کے بجائے ایک تکلف اور تواضع کے ساتھ بات کرتا۔بعض اوقات تو سامنا ہونے پر صرف مسکراہٹوں کا تبادلہ ہی ہوتا۔اور وہ کچھ کہے بغیر اپنی راہ لیتا اب وہ کلاس روم میں نازاں سے سوال بھی نہ کرتا تھا۔مہینے گزر گئے تھے۔ابھی تک نازاں کے پوسٹر پھاڑنے کے واقعے کا کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا تھا۔زیادہ لوگوں کا خیال تھا کہ یونین نے اسے جذباتی لڑکی ہونے کا فائدہ دے کر بری کر دیا ہے۔مگر نوازش کو وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی بات کا دھڑکا لگا رہتا کیونکہ وہ یونین کے شتر کینہ سے واقف تھا اور اپنے دور طالبعلمی میں اس کا شکار بھی ہوا تھا۔اس نے ایک آدھ مرتبہ اشارۃً نازاں کو محتاط رہنے اور آنکھیں کھلی رکھنے کی تاکید بھی کی تھی مگر شاید نازاں نے اس کے خدشے کو ہمدردانہ وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔مگر شومئی قسمت! ایک شام کچھ لڑکے جو بازار حسن میں ونڈو شاپنگ کر رہے تھے انہوں نے نازاں کو گھریلو لباس میں بالا خانے کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھ لیا اور اگلے روز جامعہ کی دیواروں پر اس کے خلاف ایف آئی آر درج کر دی گئی۔۔۔" مادر علمی کی مقدس گود میں ناپاک طوائفوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔۔نازاں کو جامعہ سے فارغ کیا جائے"۔۔۔۔"شریف زادیوں کے ساتھ طوائفوں کا میل ملاپ برداشت نہیں کیا جائے گا۔"

یونین کا ایک وفد وائس چانسلر سے ملا اور نازاں نے اپنے اوپر لگنے والے الزام کو ہلکی سی ہاں کہہ کر قبول کر لیا چنانچہ اسے جامعہ سے رضا کارانہ طور پر نکل جانے کا غیر تحریری فرمان جاری کیا

گیا۔ جسے اس نے قبول کرلیا۔ اس کی محبت کا دم بھرنے والی، گلیکسی کی لڑکیوں نے اس سے منہ موڑ کر دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔ مگر لڑکوں کی اکثریت کو نازاں سے ہمدردی تھی۔ ان کے لئے نازاں کا طوائف زادی ہونا حیرانی کا باعث ضرور تھا مگر وہ ان کی نظر میں اچھوت نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ نازاں اپنی تعلیم کسی نہ کسی طرح مکمل کرے۔ انہوں نے نازاں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر گم صم نازاں چپ چاپ جامعہ کی فضاؤں کو یوں حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر چلی گئی جیسے دلہن میکے سے مایوس سسرال کو چلدے۔ اور اسے روکنے والا کوئی نہ ہو۔ نوازش کو جب اس حقیقت اور رئیس الجامعہ کے اس رویے کا پتہ چلا تو وہ اندر ہی اندر سلگ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ انتظامیہ کو اور اسلام کے ان نام نہاد ٹھیکیداروں کو قائل کرنے کی کوشش کرے کہ کل تک جسے تم بہن بہن کہتے تھے آج وہ تمہارے لئے ملیچھ کیوں ہوگئی۔ اگر وہ طوائف کے گھر میں پیدا ہوئی ہے تو یہ اس کی خطا ہے یا قدرت کی عطا؟ اور اگر تم اشراف کے ہاں پیدا ہوئے تو اس میں تمہارا کیا کمال۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ قدرت کے جبر کو کوئی اپنی قدر میں کس طرح قبول کرتا ہے۔ اللہ کے حضور جب فیصلے کا معیار پارسائی اور تقویٰ ہے تو رواج اور سماج کی کیا حیثیت؟؟ کیا نازاں ایک غیر معمولی انسان نہیں کہ جس نے گناہ کے باڑے میں آنکھ کھولی مگر کنول کے پھول کی طرح اس نے اپنی پاکیزگی برقرار رکھی۔ آج تک بھی اس کا کوئی سکینڈل نہ بنا تھا جبکہ شریف زادیاں، بڑے بڑے گھروں والیاں بھی نجانے کن کن قصوں اور کہانیوں کا کردار بن کر بھی نیک نام اور باعزت قرار پائی تھیں۔ نازاں نے پونے دوسال کا عرصہ جس شرافت اور نجابت سے گزارا تھا اسے دیکھ کر اکثر لوگوں نے اس کے خاندان کی نجابت اور اس کے والدین کی احسن تربیت کے سرٹیفکیٹ دیئے تھے۔ آج وہ سب سرٹیفکیٹ یک قلم پرزہ پرزہ کردئے گئے تھے۔ وہ والدین جو اپنی اولاد کو اس جیسی دیکھنے کی دعائیں کرتے تھے وہ بھی آج چھی چھی اور تھوئی تھوئی کررہے تھے۔ ذرا سی دیر میں زمانے کو کیا ہو گیا تھا۔ جنس کے بازار کے خریدار سلطانی گواہ بن کر نیک نام تھے کوئی بتانے والا نہیں کہ خریدنے اور بیچنے والے کا مقام اور مرتبہ برابر ہے مگر بکنے والے کا کیا قصور۔ خریدار سے کوئی بھی پوچھنے والا نہیں۔ بیچنے اور بکنے والا ہی قابل گردن زدنی ہے۔ سب کی نظر میں نازاں ہی مجرم تھی۔ ۔اور نازاں نے بھی اپنا ناکردہ جرم قبول کرلیا تھا۔۔ع

بدنام ہوگئے ہیں بڑی سادگی سے ہم

☆☆☆

ہر طرف دیوار و در اور ان میں آنکھوں کے ہجوم
کہہ سکے جو دل کی حالت وہ لبِ گویا نہیں

نازاں چلی گئی تھی۔ جس طرح اشرافیہ طبقے نے ایک گناہوں کی دلدل سے ابھرتی ہوئی لڑکی کو پھر سے گناہوں کی دلدل میں دھکا دے دیا تھا نوازش اسی طبقے کا ایک فرد ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اس ظلم میں برابر کا شریک سمجھتا تھا۔ اس کے اندر ایک خلش تھی۔ ایک احساس ندامت تھا۔ جو ہر تنہائی میں اس پر طاری ہو جاتا اور وہ خود کو مجرم مان کر بے چین و بے قرار ہو جاتا۔ 'اسے ایم۔ اے ہی کر لینے دیتے ظالم!'۔ جوں جوں ایم اے کے امتحان قریب آرہے تھے اس کے اندر یہ احساس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ گھر میں بھی اکثر اس کی تنہائی اسی ملال سے بے حال رہتی۔ آخر ایک شب یہی احساس مقصد بن کر اس کی رہنمائی کرتا ہوا اسے اسی بازارِ شب میں لے آیا۔ اس بازار اور اس کے جنم بھوم کے درمیان ایک ہی سڑک۔۔۔ راوی روڈ۔۔۔ کا فاصلہ تھا۔ بچپن، لڑکپن اور پھر نوجوانی، یہیں گزری تھی۔ عید کی نماز اور کبھی کبھار جمعہ کی نماز بھی وہ بادشاہی مسجد میں ادا کر کے مسجد کے صدر دروازے سے دائیں مڑنے کے بجائے بائیں مینار پاکستان کو یا سامنے شاہی قلعے کو نکل جاتا۔ اس نے اس بازارِ گناہ کی طرف آنکھ بھر کے بھی نہ دیکھا تھا۔ لڑکپن میں خوفِ گناہ اور نوجوانی میں لوگ کیا کہیں گے کا خوف ہمیشہ مانع رہا تھا۔ مگر آج۔۔۔ وہ اس بازار میں یوں چل رہا تھا جیسے اسے روزمرہ چہل قدمی کی عادت ہو۔ ابھی تک اس نے نازاں کو ڈھونڈنے کی کوئی منصوبہ بندی نہ کی تھی۔ وہ کہاں رہتی ہے۔ وہ اسے کیسے تلاش کرے گا، اور اگر اسے کسی سے پوچھنا پڑا تو کیا پوچھے گا۔ اس نے اس بارے میں بالکل نہیں سوچا تھا۔ وہ تو بس یہ مقصد اور دھن لے کر گھر سے نکل پڑا تھا اور اس بازار میں آگیا تھا۔ اس کا مقصد ہی اس کا راہنما تھا اور مقصد کے حصول کی لگن اس کی اخلاقی جرات اور توانائی کا مصدر تھی۔ دو تین دنوں میں اس نے اس بازار کی تنگ و تاریک، ٹیڑھی میڑھی، اداس اور یبوست زدہ، سب گلیاں دیکھ ڈالیں۔ دلالوں کی دعوتوں پر ان کا

دل رکھنے کے لئے کئی سیڑھیاں بھی چڑھیں ،اور ساحر کی ''چکلے'' کے سارے مناظر دیکھ ڈالے۔مگر نازاں کا اس طرح ملنا۔۔۔؟ اگر وہ اسے اس حالت میں، ان حالات میں مل جاتی تو وہ شاید کبھی اس سے ملنا پسند نہ کرتا۔وہ ہر بالا خانے پر ڈرتے ڈرتے قدم رکھتا اور نازاں کو نہ پا کر دل ہی دل میں شکر کرتا اور سوچتا بعض اوقات نامرادی، مراد بھر آنے سے زیادہ طمانیت کا باعث بنتی ہے۔ان گلیوں سے نکل کر اب وہ بازار شیخو پوریاں کی طرف آ گیا تھا۔آج کی شام اس نے کن انکھیوں سے جھروکوں میں سجی حیرانیوں اور جوانیوں میں نازاں کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام! یہ ناکامی بھی اس کے لئے طمانیت کا ساماں تھی۔گویا نازاں بازار کی جنس ہونے کے باوجود بازار میں دستیاب نہیں۔اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔اور آج کا سفر اور تلاش کر کے گھر کو لوٹ رہا تھا کہ ایکدم وہ رک گیا۔اس کے کانوں میں ایک مدھر اور مترنم آواز نے ارتعاش پیدا کر دیا۔

ان کا ہی تصور ہے محفل ہو کہ تنہائی
سمجھے کوئی دیوانہ ،جانے کوئی سودائی

وہ یہ گانا سننے کے لئے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔پان کی دکان پر پان لینے کے لئے رکنے کا بہانہ باندھا۔مغنیہ سر بکھیر رہی تھی۔

نغموں کا بھرم ٹوٹا ، میخانے کا در چھوٹا
نغموں کا بھرم ٹوٹا ، میخانے کا در چھوٹا
جب ساز چھڑا کوئی آواز تری آئی
ان کا ہی تصور ہے محفل ہو کہ تنہائی

آواز کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے قدم بالا خانے کے زینے پر پڑنے لگے۔

نازاں کے گماں اور ذہن کے کونے کھدرے میں بھی نہ تھا کہ اس طرح ایک دن کا محبوب استاد اس کے ہاں چلا آئیگا۔وہ ایک دم ٹھٹھک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سر آپ !!!'' اس کی آواز کی ہکلاہٹ اور لہجے میں حیرت گونج گئی۔ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ فلمی مناظر، اور اتفاقات، مصنف کی ذہنی اختراع ہوتی ہے مگر۔۔۔۔یہ حسن اتفاق بھی بالکل فلمی ڈرامہ کا منظر تھا۔ایک ادھیڑ عمر کی عورت جو ابھی تک سوال بنی بیٹھی تھی نازاں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

باجی ماں! سر!اک لرزش خفی اس کے سارے بدن میں کرنٹ بن کر دوڑ رہی تھی۔باجی ماں نے اٹھ کر اس کے سامنے سر جھکا کر فرشی سلام کیا۔اور انگلی سے اشارہ کر کے نازاں کی طرف دیکھتے

ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔ 'سر نوازش؟' نازاں اثبات میں سر ہی ہلا گئی۔ جواباً اس نے سازندوں کو دیکھا اور وہ اشارہ سمجھتے ہوئے ساز سمیٹ کر نکل گئے۔ نوازش نے حیرانی سے نازاں کی طرف دیکھا باجی ماں نے نوازش کی نظروں کا سوال بھانپتے ہوئے کہا۔ ''سر جی یہ آپ کا اکثر ذکر کرتی رہتی ہے۔۔ ہم نے اس کے منہ سے ایک ہی نام سنا ہے اس کے ابا کہہ رہے تھے' لگتا ہے یونیورسٹی میں ایک ہی ٹیچر ہے جو ہر وقت ایک ہی نام لیتی رہتی ہو۔ بڑا شوق پیدا ہو گیا تھا آپ سے ملنے کا مگر آپ کو ہم ۔۔۔۔۔ آپ سمجھتے ہیں نا۔ شکر ہے آپ خود تشریف لائے۔۔۔۔'' تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد باجی ماں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا اب اس کے لہجے میں دکھ اور گلہ تھا۔'' ۔۔ ویسے سر جی میری بچی کے ساتھ آپ کی دنیا والوں نے اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہم تو آپ کی دنیا کے پاپیوں کو دامن میں سمیٹ لیتے ہیں ہماری دنیا کی معصوم بچی بھی آپ کو قبول نہیں۔۔ خیر!' اس نے بڑی دل گرفتگی کے ساتھ کہا اور سرد آہ بھر کے چپ ہو گئی۔ نوازش نے کہا'' میں کسی ایسی دنیا کا نمائندہ نہیں۔ جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ میں تو خود آج اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ۔۔۔'' اس نے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا اور نازاں کی طرف دیکھ کر کہا کیوں نازاں کیا خیال ہے۔'' باجی ماں کی آنکھوں میں فرطِ مسرت سے آنسو آ گئے۔ اور اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ 'مولا پنجتن پاک آپ کو خوش رکھے۔'' نازاں نے حمائل دوپٹے کا پلو سر پر لیتے ہوئے کہا۔ سر جی بیٹھئے۔ نوازش کے بیٹھنے کے بعد اس کی ماں نے نوازش سے کہا۔ ابھی حاضر ہوئی۔ نازاں تم بیٹھو' نازاں کی آنکھوں میں ایک عجیب غیر معمولی تحیر اور انبساط تھا۔ ماں کے جاتے ہی وہ صوفے پہ بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک دونوں کے درمیاں خاموشیوں کے پردے تنے رہے۔ آخر کار اسی نے پہل کی۔

''سر جی!'' اس کا سانس پھولا ہوا تھا اس نے ذرا توقف کر کے اپنے سانسوں کو درست کیا۔'' سر جی، بیان سے باہر ہے، کہ آپ آئے تو کیا ہوا بس غالب کا ایک شعر۔۔۔۔۔ اس نے خوابیدہ سے لہجے میں شعر پڑھا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
ہم کبھی ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مگر سر جی افسوس یہ گھر بھی تو نہیں۔ آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔۔۔ یہ کہہ کر وہ پھر چپ ہو گئی۔ نوازش نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔'' کل جا کر لیٹ فیس کے ساتھ ایم اے کے امتحان کا داخلہ بھیجو۔ دو ماہ رہ گئے ہیں۔ یہ میری خواہش ہے کہ تم جو اتنی محنت

کرنے کے بعد گھر میں آبیٹھی ہو۔۔۔'' نازاں نے پہلی بار ہمت کر کے کہنا شروع کیا۔اس کے لہجے میں دکھ کرب اور ملال و مایوسی تھی۔ ''میں کہاں آبیٹھی ہوں آپ کے طبقے نے مجھے واپس بھیج دیا ہے اس گنا کی دنیا میں جہاں سے میں نجانے سر جی کیسے نکلی تھی۔ مجھے یہ دنیا اچھی نہ لگتی تھی مگر سر جی اب مجھے یہی دنیا بھا گئی ہے کیونکہ یہی دنیا میری دنیا ہے۔جس سے مجھے کسی نے نہیں نکالا۔میں نے اب اس دنیا میں دل لگالیا ہے۔۔۔

اس دوران باجی ماں ٹرے میں تواضع کا سامان سجائے کمرے میں داخل ہوئی۔ ''ہمارے بھاگ جاگے سر جی، جو آپ آگئے۔'' اس نے صوفے کے سامنے میز پر ٹرے رکھ کر سامان میز پر رکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''جس دن سے آئی ہے اپنے کمرے میں پڑی اپنی کتابوں کو دیکھ دیکھ روتی رہتی ہے۔کھوئی کھوئی سی پڑی رہتی ہے۔آج پہلا دن ہے میں نے کہا ذرا دل بہل جائے گا ساز سروں میں اور آج ہی آپ آگئے۔'' '' میں پچھلے کئی روز سے نازاں کو تلاش کر رہا تھا۔۔۔۔نوازش نے اس بازار میں اپنی گزشتہ چندروزہ سرگزشت مختصراً بیان کردی۔ ''یہ تو بالکل فلموں والا سین ہوا۔۔'' باجی ماں نے دانت نکالتے ہوئے نوازش کی طرف دیکھا۔نوازش نے کہا۔'' کہانیاں بھی تو انسان ہی لکھتے ہیں اور وہ جو بھی لکھتے ہیں اسی دنیا کے بارے میں اسی دنیا میں رہ کر لکھتے ہیں۔چنانچہ بعض اوقات اتفاقات اور حادثات ایسے مل جاتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے بالکل ہماری طرح۔۔جیسے ہم اپنی اپنی جگہ حیران ہیں۔۔'' باجی ماں نے معترف نظروں سے نوازش کی طرف اور پھر نازاں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔اس نے شکوہ آگیں لہجے میں کہا''نہیں باجی ماں۔بے سود!! کوئی فائدہ نہیں۔ایم اے۔کر کے بھی تو مجھے اسی سوسائٹی میں رہنا ہوگا۔جنہیں میں اب ملیچھ لگتی ہوں ایم اے کر کے ان کے لئے کیا میں شریف زادی۔۔۔؟؟ بس باجی ماں میں نے سر سے معذرت کرلی ہے۔'' باجی ماں نے نوازش کی طرف دیکھا۔نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا

''معذرت تو کرلی ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ معذرت میں نے قبول بھی کرلی ہے۔؟''

''نہیں بس سر آپ کو میری معذرت قبول کرنی پڑے گی،،اس نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔تادیر بحث وتمحیص کا سلسلہ چلا بالآخر نوازش نے مختلف طریقے سے، دلائل دے کر اسے قائل کر ہی لیا۔اس ملاقات میں طے پایا کہ نوازش اسکی کوچنگ کرے گا۔چنانچہ ہر دوسرے تیسرے دن نوازش آکر نازاں کو پڑھا جاتا۔نازاں۔۔۔۔کسی طوائف زادی کو پڑھانا اور پھر اس کے گھر

میں پڑھانا اس کے لئے ایک نہایت انوکھا مگر خوشگوار اور متاثر کن تجربہ تھا۔ جب وہ پڑھانے کے لئے آتا تو باجی ماں اس کے احترام میں بالا خانے پر ساز و آواز کا کام رکوا دیتی۔ نوازش نے ایک مرتبہ کہا بھی کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں مگر اس کے جواب نے نوازش کو لاجواب کر دیا، اس نے کہا۔ ''میں علم والوں کا ادب کرتی ہوں۔ اور آپ کے ہوتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اور یہ آپ پر احسان نہیں یہ سب کچھ میں نازاں کے لئے کرتی ہوں کہ اس کے دل میں اگر علم کی قدر نہیں ہو گی تو وہ علم حاصل نہیں کر سکے گی۔'' اس کی کلاس میں پڑھنے والی نازاں اور یہاں پڑھنے والی نازاں میں واضح فرق تھا۔ یہاں اس کے سامنے بیٹھی ہوئی نازاں کے سر کا دوپٹہ کبھی نہ سرکا تھا۔ ایک ماہ تک پڑھانے کے باوجود اس نے کبھی نوازش سے آنکھ ملا کر بات نہ کی تھی۔ بعض اوقات نوازش کو یوں لگتا جیسے وہ نازاں کی پرچھائیں کو پڑھا رہا ہو۔ دھیما لہجہ نرم آواز۔۔ وہ بولتی تو جی چاہتا کہ وہ بولے اور یہ سنتا رہے۔

دو ماہ گزر گئے، پلک جھپکنے میں۔۔ وہ گھر سے جو ارادے لے کے چلا تھا ان کی تکمیل ہوئی، نازاں نے ایم اے کا امتحان دیا اور نوازش کی توقع کے خلاف وہ اول درجے میں کامیاب قرار پائی۔ مبارک بادوں کے ساتھ ساتھ بازار میں اس کا اشتہار بھی تماش بینوں میں گونجنے لگا۔۔۔'' زہرہ بائی کی بیٹی نے ماشاءاللہ ایم اے کر لیا ہے اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں۔ اب تو کوئی بڑا رئیس، وزیر ہی اس کی نتھ اتارے گا۔'

''ہاں بھئی حق بنتا ہے۔ زہرہ کا، بڑی محنت کی ہے اس نے۔ اس کا حق بنتا ہے بھئی۔'' ایک کہتی۔'' وہ تو ٹھیک ہے زہرہ نے، اپنا فرض اپنا پیٹ کاٹ کر ادا کیا ہے۔ دیکھیں اب نازاں اس کی محبت اور قربانی کا دین کیسے دیتی ہے۔'' سرگوشیاں کلام کرنے لگتیں۔'' سنا ہے طوائف زادی، شریفوں میں شماری کے خواب دیکھ رہی ہے'' ایک کہتی'' ظاہر ہے شریف زادی کی بیٹی ہے یہی گل کھلائے گی۔۔۔۔ ہائے، بیچاری زہرہ کو کیا ملا۔ ساری زندگی گھنگھروؤں میں پاؤں توڑ کر۔ تھ۔ تھ۔۔ تھیہ تھیہ!'' ایک نے کہا۔'' زہرہ کو کیا ملتا۔ شریف زادی نے آخر بیٹی کو۔۔۔۔۔!!'' کوئی افسوس کا اظہار کرتی باقی ہاں میں ہاں ملاتیں۔ ایک نے کہا۔'' اس سے تو بہتر تھا کہ چھٹپنے ہی میں کسی کے ساتھ نکل جاتی۔۔'' نازاں کبھی کانوں پڑی کبھی ادھر اُدھر سے کہی۔۔ یہ سب کچھ سنتی، سوچتی، سمجھتی مگر چپ چاپ!!

ایک دن اس نے باجی ماں سے کان پڑی سب باتیں کہہ دیں۔ اور سر جھکا کر ماں کے

فیصلے کا انتظار کرنے لگی۔ مگر باجی ماں نے اس کی سنی ان سنی کر دی اور اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے اسے تسلی دی۔ ''ان کی چھوڑو، تم اپنی کہو تم کیا چاہتی ہو۔ ملازمت یا۔۔۔۔'' نازاں نے محسوس کیا باجی ماں کے لہجے میں کوئی جھول نہیں تھا:

دور پرے اسماناں اتے

رب سچے داناں

بیٹھاں ایس جہان دے اتے

بس اک ماں ای ماں

اس نے فرط عقیدت سے ماں کا منہ چوم کر اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ آنکھوں میں جذبوں کی جل تھل ہونے لگی۔ ''ارے!!'' باجی ماں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ''میری سوہنی کی آنکھ میں آنسو؟''

نازاں نے اس کے کندھے سے سر اٹھا کر آنکھیں پونچھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''اوہ میرئیے مائیں! یہ تو مان سمان کے، خوشی اور پندھار کے آنسو ہیں۔ یہ تو نصیبوں والی آنکھوں کو ملتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ماں کو گلے لگا کر خوب بھینچا۔ ''اری چھوڑ بھی، کیا اب اندر گھسے گی۔'' نازاں نے الگ ہو کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''جی تو یہی چاہتا ہے۔'' اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

لوگ بچوں کو یتیمی سے بچانا چاہیں
اور حاکم یہ سمجھتا ہے رعایا خوش ہے

برطانوی سامراج سے آزادی کی جدوجہد کے سفر کے آغاز میں جب قوم نے جمہوریت کا چلن سیکھا تھا تب سیاستدانوں کا خمیر معاشرے کے محروم طبقے سے اٹھتا تھا۔اور باجبروت حکمرانوں کے ایوان ان کی للکار سے لرزتے۔یہی سیاستدان قوم کی آنکھوں میں امید کے ستارے بن کر چمکتے۔انہی کے دم قدم سے برصغیر آزاد ہوا،ہندوستان بٹا اور پاکستان بنا۔مگر ---منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے---چنانچہ ملک تو خداداد تھا مگر اس کا آئین اور قانون آقاداد تھا۔انگریزوں کے تلوے چاٹنے والے،ان کے گھوڑوں کے سائیس اوران کے کتے نہلانے والے اور قوم سے غداری اور انگریز کی وفاداری کے عوض جاگیریں پانے والے---یہی لوگ مملکت خداداد کے مالک اور مختار بنے۔راعی اور رعایا کا رشتہ حاکم اور محکوم اور قاہر ومقہور کا ---جو انگریزی استعمار کی دین تھا۔وہی مستحکم تر ہوتا گیا اور برطانوی استعمار سے آزادی کی جنگ جیتنے والے اپنے حقوق کی جنگ میں اپنوں سے ہار گئے۔شاعر چلا اٹھا۔

اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے　　یہ مری رات کا سویرا ہے ؟

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر　　تھا انتظار وہ جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں　　جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

ایوانوں سے کوئی جواب نہ ملا۔سفر جاری رہا---دائرے کا سفر---دائرہ تھا کہ ٹوٹنے میں نہیں آتا تھا۔البتہ بعض مصلحتوں کے تحت اس دائرے نے چھوٹے چھوٹے دائروں میں بٹنے کا ہنر سیکھ لیا۔جب دائرے کا سفر نہ ٹوٹا تو ملک ٹوٹ گیا۔ادھر تم ادھر ہم کی روش نے

آخرش پاکستان کو بانٹ دیا۔۔۔۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا او مغربی پاکستان کا نام پاکستان رکھ دیا گیا۔۔۔۔ نیا پاکستان!!!

۱۹۷۱ء کے نئے پاکستان کی پہلی حکومت قائم ہوئی۔ مگر دائرہ نہ ٹوٹا۔ بلکہ دائرہ پھیلتا گیا۔ پہلے فوج تھی اب ایجنسیوں کا عنصر بھی اس دائرے میں شامل ہو گیا۔ نئے پاکستان میں نیا کلچر متعارف کروایا گیا۔ عوامی حکومت کا سب کچھ عوامی تھا۔ صدر، وزیر اعظم، وزرا، اور تو اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی عوامی تھا۔ رویے، اقدامات اور بدعنوانی، اور غنڈہ گردی۔۔۔۔ سب عوامی تھا۔ جیسے کیسے اس حکومت نے پانچ سال بھی سال پورے نہیں کئے تھے کہ اس کو خفیہ ایجنسیوں نے جو مصدقہ اطلاعات فراہم کی تھیں ان کے مطابق ملک کی کوئی بھی سیاسی جماعت انفرادی حیثیت میں حکومتی پارٹی کے خلاف انتخابات جیتنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ انہی اطلاعات کی روشنی میں حکومت نے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ مگر عوامی وزیر اعظم کے رنگیلے اور زہریلے پن سے چند ایک ایسے اقدامات سرزد ہوئے کہ ملکی اور غیر ملکی سطح پر رائے عامہ اور رائے خاصہ حکومت کے خلاف ہو گئی تھی۔ چنانچہ تمام سیاسی جماعتیں متحد ہو کر سامنے آ گئیں۔ اپوزیشن کے جلسے اہل شہر کی تفریح گاہ بن گئے۔ ایسے میں حکمرانوں کا بوکھلانا سیاسی عمل میں کوئی نئی بات نہ تھی چنانچہ جب انتخابات کے غیر متوقع نتائج برآمد ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک گیر احتجاج ہر شعبہ زندگی میں سرایت کر گیا۔ کراچی اس احتجاج میں پیش پیش تھا۔ جبکہ اہل لاہور اپنے مخصوص مزاج کے مطابق پر امن احتجاج میں لگے رہے۔ پھر خبر اڑی کہ کراچی کے جاں نثاروں نے اہل لاہور کے لئے مہندی اور چوڑیاں بھیجی ہیں۔ بس پھر کیا تھا

۹۔ اپریل کو زندہ دلان لاہور نے کروٹ لی اور لاہوریوں کی دلاوری کے سامنے انتظامیہ چاروں شانے چت ہو گئی۔ لاہوریئے تحریک کو منطقی انجام کی طرف لے کر چل پڑے۔ حکمران ہٹ دھرمی اور خوش فہمی میں صورتِ حال کی نزاکت نہ سمجھ سکے۔ اور ملک گیر پر امن مظاہرے پر تشدد تحریک کی صورت اختیار کر گئے۔ طرہ یہ کہ مذہبی جماعتوں نے اس تحریک کو مشرف بہ اسلام کر دیا۔ لہجوں میں آگ، آنکھوں میں غضب، سڑکوں پر لہو، فضا میں بارود، دلوں میں نفرت: حکومت سے، حکمرانوں سے، حکومتی اداروں سے، پیشہ ور قاتلوں سے، سپاہیوں سے،۔۔ خود ساختہ شہادت کے منصب پر فائز ہونے والے سیکڑوں مجاہدین کا لہو اس تحریک کی رگوں میں گردش کرنے لگا۔ سیاستدانوں کی اناؤں کے تصادم نے کئی ماؤں کی گودیں اور بھائیوں کے بازو اور

باپوں کی بیساکھیاں چھین لی تھیں۔ ساحر کا کہا سچ ثابت ہو رہا تھا

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں

سر پھرے جوان اگر شام گئے گھر نہیں پہنچے تو انکے اعزہ واقربا ہسپتال، تھانے یا جیل کی فہرستوں میں تلاش کرتے نظر آتے۔۔۔ یہ وہ دن تھے کہ عام لوگ سر شام ریڈیو کے سامنے بیٹھے بی بی سی سنا کرتے۔ شہر کی بڑی سڑکوں پر گشت اور گلیوں بازاروں پر ناکے لگے ہوتے۔ گھر سے باہر اگر کوئی نکلتا تو محلے کی مارکیٹ سے سودا سلف لینے۔ والدین بچوں کو اور بیویاں شوہروں کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیتیں۔۔۔۔ گولیوں کے موسم کون سا موقع ہے باہر نکلنے کا۔۔۔۔۔

نوازش گھر سے تو نکلا تھا اپنی ایک پبلشر کے پاس جانے کے لئے۔ جس کا دفتر اردو بازار میں تھا۔۔ عام طور پر وہ اولڈ کیمپس سے ہوتا ہوا Oriental College سے ہوتا ہوا گورنمنٹ کالج کی عقبی سڑک پر سے اردو بازار جایا کرتا تھا مگر اس روز وہ پیدل چلنے کے بجائے ویگن میں سوار ہو گیا۔ مگر ویگن کا روٹ شہر کے ہنگاموں کی وجہ سے بدلا ہوا تھا۔ اسے میو ہسپتال کے راستے جا کر آگے اخبار مارکیٹ کے پاس اتار کر ویگن شاہ عالمی کی طرف مڑ گئی۔ یہاں بھی پولیس کی بھاری نفری تعینات تھی۔ شہر کا یہی حصہ تحریک کا مرکز تھا۔ اور سلسلۂ قتل قتال کا مقتل تھا۔ اس وقت فضا آنسو گیس سے گرانبار تھی۔ بھی وہ مسلم مسجد کے بازو میں پہنچا ہی تھا کہ لوہاری دروازے کے باہر بھگدڑ مچ گئی مسجد کے اندر کے احتجاجیوں کا ریلہ، پولیس کی وارننگ کو نظر انداز کرتا ہوا مسجد سے باہر نکلا۔ تڑ۔ تڑ۔ تڑ۔۔۔ نعرہ وہ تکبیر۔۔۔ اللہ اکبر!!۔۔۔ کچھ لوگ اس کے ادھر کچھ ادھر گرے ،اسلام غالب آئے گا۔ بھٹو کتا ہائے ہائے۔ فائرنگ ،شور چیخ و پکار ،اور نعروں کے نقارے سب نے مل کر اسے حواس باختہ کر دیا۔ اچانک اسے معمولی سا ایک جھٹکا۔۔۔ اپنے بائیں طرف پسلیوں کے نیچے۔۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسکی قمیص ہلکے سے کھینچ کر چھوڑ دی ہو وہ اس معمولی سے واقعے کو نظر انداز کر کے آگے بڑھا مگر ایکدم اسے درد کی ایک ٹیس اٹھی اور اسے یہ دیکھنے کی مہلت نہ ملی کہ درد کا مصدر کہاں ہے۔ ایک طرف سے اسے کے کان میں آواز پڑی۔۔ اوووووووو خون ن ن ن!!!

اسکے بعد اسکے کانوں میں ہارن نما سائرن سا گونجا اور اسے یوں لگا جیسے وہ لمحہ لمحہ سر اور نئے کے سمندر میں اتر رہا ہو۔۔۔۔۔۔!!!!!!

جب سے ہوش آیا تو وہ میو ہسپتال کے دلی وارڈ کے سرجیکل یونٹ میں گیارہ نمبر بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے وجود کا روم روم درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ وہ کہاں سے اور کیوں ہے۔ مگر اپنے ارد گرد ایک ہی نظر دوڑا کر اسکے ذہن میں ساری کڑیاں جڑتی گئیں۔ ۔۔۔لوہاری دروازے کے باہر مسلم مسجد کے عقبی دروازے سے وہ مغرب کی نماز پڑھ کر نکلا کہ ایک گولی اس کی بائیں پسلی کے نیچے سے گردوں کو چھیڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔۔ شکر ہے اللہ کا پسلی بچ گئی۔ ہاں مگر گردے بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ اوہ! اچلو اللہ خیر کرے، شکر ہے جان تو بچ گئی۔۔۔ جان ہے تو جہان ہے۔۔۔ ہائے کتنا سوہنا جوان ہے۔ پتہ نہیں کس کا لخت جگر ہے کس کا بھائی۔۔۔۔۔! اس کے کانوں میں مختلف آوازیں سمع خراشی کر رہی تھیں۔ پلیز آپ لوگ باہر چلے جائیں صرف ایک آدمی مریض کے پاس رہے،، میں رہتا ہوں،۔۔ نہیں میں،، تم جاؤ۔ میں نے کہا نا میں رہتا ہوں۔ تم جاؤ۔۔۔۔ تم سب باہر چلو صرف مریض کا ایک رشتہ دار۔۔۔! کیسی باتیں کرتے ہیں یہ ہم سب کا رشتہ دار ہے۔ یہ غازی ہے۔ سب کا رشتہ دار ہے۔ آپ حکم کریں۔ بھائی عرض یہ ہے کہ آپ مریض۔۔۔!!'' یہ وہ مختلف آوازیں تھیں جو اس کے کانوں میں پڑتے پڑتے اس کی بے ہوشی میں ڈوب گئیں۔ پھر کیا ہوا اس کچھ خبر نہ ہوئی۔۔۔ ''لو ہوش آ گیا غازی کو۔'' ایک آدمی نے نوازش کی طرف دیکھتے ہوئے اعلان کیا۔ یہ آواز سن کر اسے پتہ چلا کہ وہ اب سے پہلے بے ہوش تھا اب ہر طرف شور مچ گیا۔ ہوش آ گیا، شکر ہے اور اس کے ساتھ ہی نوازش نے خود کو بہت سے لوگوں میں گرا ہوا پایا۔ آنکھوں کے ہجوم میں اس نے غنودگی سے معمور آنکھوں سے کسی شناسا آنکھ کو پہچاننے کی کوشش کی۔ مگر شدتِ درد سے اس کی آنکھیں مندھ گئیں۔ پھر دوبارہ وہ نجانے کتنی دیر تک وہ بے ہوش رہا۔ اب جب اسے ہوش آیا تو منظر بدل چکا تھا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے۔۔۔ ہلیں مت پلیز!'' ایک مہربان نسوانی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ سفید یونیفارم میں ملبوس سٹاف نرس اس کے گلوکوز بیگ میں سرنج چبھو کر پچکاری دبا رہی تھی۔ اس نے ذرا گردن اٹھا کر اپنے ننگے پیٹ پر بندھی موٹی پٹی کی طرف دیکھ کر نرس کی طرف دیکھا۔ ''میں۔۔۔؟'' اللہ بہتر کرے گا۔ شکر ہے اللہ نے آپ کی جان بچالی۔ آپ کے ارد گرد چار لاشیں گریں۔ یہ تو اسے پتہ چل چکا تھا کہ اس کے گردے۔۔۔ pain killer کے باعث درد کی شدت میں کمی رہی تھی چنانچہ وہ متجس تھا کہ اس کے زخم کی نوعیت کیا ہے؟ اس نے سٹاف سے وقت پوچھا۔ نیم شب کا عمل تھا ''ڈاکٹر صاحب۔۔۔؟'' اس نے سٹاف سے پوچھا۔ ''ابھی

راؤنڈ پر آئیں گے۔۔۔آپ کے گھر کا کوئی فون۔؟''

اس نے گھر کا فون نمبر دیتے ہوئے کہ۔۔۔۔۔ no detail just inform۔۔۔۔،''

''جی اچھا، فکر نہ کریں!'' شاف یہ کہہ کر چلی گئی۔ اسی دوران نعروں کی گونج میں نوابزادہ نصر اللہ خان اور مولانا جان محمد عباسی دیگر سیاسی عمائدین کے ساتھ وارڈ میں داخل ہوئے۔ ''نوابزادہ صاحب پولیس کی لاٹھیوں سے زخمی ہیں مگر آپ کی قربانی پر آپ کو سلام پیش کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اور آپ مولانا جان محمد عباسی۔۔ جنہوں نے لاڑکانہ سے بھٹو کے مقابلے میں مجاہدانہ الیکشن لڑا تھا۔ سندھ سے تشریف لائے ہیں۔'' ایک آدمی نے بڑے جوشیلے انداز میں ان کا تعارف کروایا اور پھر تقریری انداز میں بولا۔ نوابزادہ صاحب، یہ نوازش علی صاحب ہیں۔ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی انہوں نے حق کی خاطر، نظام مصطفیٰ کی خاطر مسلم مسجد کے سامنے، خانہ ءخدا کے سامنے گولی کھائی۔ وہ ایسے کہ رہا تھا جیسے کہ نوازش نے برضا و رغبت گولی کھائی ہو۔ تکلیف کے باوجود وہ اس شخص کی سادگی یا لاعلمی پر اندر ہی اندر مسکرا دیا۔

''یہ ظلم کی سیاہ رات ختم ہونے والی ہے۔ اس ملک میں ان شاء اللہ اسلام غالب آئے گا۔ شہداء اور غازیوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ اک ذرا صبر کہ اب جبر کے دن تھوڑے ہیں۔۔۔۔ لہو جو سڑکوں پہ بہہ رہا ہے۔۔۔ یہ قطرہ قطرہ شمار کرلو۔ ہم اس لہو کا خراج لیں گے۔۔۔۔!!! سیاسی رہنماؤں کی تقریر ختم ہوئی تو ایک ساتھی نے وارڈ کے دوسرے زخمیوں کی طرف متوجہ کیا۔ ان زخمیوں میں اکثریت ان پولیس والوں کی تھی جو عوام کے ردعمل کے نتیجے میں زخمی ہوئے تھے۔ مولانا نے ان کی طرف مڑ کر وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ اٹھا کر ان کی خیریت کی دعا کی اور کہا یہ پولیس والے بھی ہمارے بھائی ہیں۔ یہ بیچارے اپنی نوکری کے ہاتھوں مجبور ہیں لیکن۔۔۔۔ نوابزادہ نصر اللہ خاں نے مسکرا کر کہا۔ ڈنڈا ہاتھ میں ہو تو ذرا ہاتھ ہلکا رکھا کرو۔ اس پر قہقہہ پڑا۔ مولانا نے چپکے سے کچھ پیسے اس طرح تکئے کے نیچے رکھ دیئے کہ نوازش کے سوا کسی کو پتہ نہ چلا وہ چاہتے ہوئے بھی انہیں منع نہ کر سکا کیونکہ وہ ہلنے جلنے سے قاصر تھا دوسرا مخیّر کے انداز میں خیر کا عنصر اس قدر غالب تھا کہ اسے یوں لگا جیسے منع کرنے پر موصوف کا بھرم ٹوٹ جائے گا، اسے شاید تکلیف ہو۔ وہ زندگی میں پہلی بار دینے کے اس انداز سے آشنا ہو رہا تھا۔ شاید حسن استغنا اسی کا نام ہے۔ کہ لینے والے کی انا اور دینے والے کا انکسار مجروح نہ ہو۔

۔''خفیہ والے سفید کپڑوں میں یہاں موجود ہیں ذرا خبردار رہنے گا۔ ویسے رپورٹ میں ہم نے

لکھوادیا ہے کہ سڑک پار کرتے ہوئے گولی لگی ہے بس اسی بیان پر رہنا۔'' جاتے ہوئے ہجوم میں سے ایک نوجوان کہ حرکتوں سے سیاسی کارکن لگتا تھا، نے مڑ کر بڑی اپنائیت اور رازداری سے اسکے کان میں کھسر پھسر کیا اور باہر چلا گیا اور نواز ش کو دوبارہ نیند نے آلیا۔ نجانے وہ کب تک سوتا رہا۔ اچانک درد کی ایک ٹیس نے اسے بیدار کیا۔ نازاں اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ اس نے ویران نظروں سے نوازش کی طرف دیکھا اور اگلے لمحے وہ اٹھ کر دھڑام سے اس کی چھاتی پر گری، اس کا وجود ہل گیا اور وہ بمشکل اپنی کراہ پر قابو پا پایا۔ نازاں کی آنکھوں کا سیلاب نوازش کی چھاتی پر بہتا رہا اور نوازش اس کے سر کو سہلاتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے دل کا غبار نکل جائے۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس کے رونے کی روانی کم ہوتے ہوتے ہچکیوں میں بدل گئی۔ اس نے سرخ آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس نے نوازش کا ہاتھ پکڑ کا اپنے گیلے گالوں سے لگایا، چوما، اس کے ہونٹوں پر اپنے آنسوؤں کی نمکین نمی میں نوازش کے لمس کا لطیف سا احساس پھیل گیا۔'' اس کے بعد نوازش نے اسے اپنے زخمی ہونے کی داستان اور دیگر احوال کہ سنائے۔ پھر جب ڈاکٹر کی آمد کا اعلان ہوا تو انہوں نے سلسلہ کلام توڑا نوازش نے ڈاکٹر سے زخم کی نوعیت دریافت کی۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق گولی کے بارود نے اسکے دونوں گردوں کے nephron کو بری طرح متاثر کیا تھا اور اس کا علاج Anti-toxia کے ذریعے تجویز کیا گیا ہے

''دیکھیں، اللہ کرم کردے۔ ورنہ!''

''ورنہ؟ نوازش نے متفکرانہ لہجے میں پوچھا۔

ڈاکٹر نے اس کی تشویش کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔'' گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ،دعا کریں۔۔ ورنہ پھر گردے کی تبدیلی کا آپشن بھی موجود ہے''

''گردے کی تبدیلی؟ نوازش نے نازاں کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر یکدم کرب کے خطوط ابھر آئے تھے۔

''ہاں مگر یہ last option ہے۔ ان شاءاللہ۔۔ ہم کوشش کر رہے ہیں، میڈیسن سے ہی ہوسکتا ہے مسئلہ حل ہو جائے۔ ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر سے فراغت ہوئی تو اسے ایک سیاسی کارکن نے آن گھیرا۔ نازان کی آنکھوں میں دکھ کے سائے آنسو بن کر تیر رہے تھے۔ اس نے نازاں سے کہا۔'' بہن آپ بےفکر ہو کر گھر جائیں آپ کے میاں کی دیکھ بھال ہماری ذمہ داری ہے ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائیگی۔'' نازاں اور نوازش

، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مگر دونوں نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ وہ پھر بولا۔ ''ان شاء اللہ بہن جی۔۔۔''

''جی اچھا۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔'' یہ کہ کر وہ بنچ پر بیٹھ کر رونے لگی۔ نوازش نے اس سے حوصلہ دیا۔ تو نازاں نے کہا۔ ''سر جی یہ لوگ بار بار مجھے بہن جی کہہ رہے ہیں۔۔۔ مجھے رونا اس بات پر آرہا ہے۔ ان کے لہجے کتنے خالص اور جذبے کتنے سچے ہیں۔ ان کی نظریں پاکیزہ ہیں۔۔۔ یہ سب کچھ ہمارے بازار میں کہاں یہ تقدس۔ وہاں تو مرد عیاشی کا مرقع، عورت عیاشی کا ذریعہ اور اولاد گناہ کی دستاویز ہے۔۔'' نوازش پر مسکن ادویہ کی غنودگی وقفے وقفے سے زور کرتی۔ اس وقت بھی وہ دواؤں کے زیر اثر تھا اس لئے وہ نازاں کی کسی بات کا جواب نہ دے پایا۔ اب نازاں سوچ رہی تھی کہ اگر یہاں پر کسی نے اسے پہچان لیا۔۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ وہ جسے وہ بہن جی کہہ رہے ہیں، طوائف کی بیٹی ہے تو ان کا بھرم ٹوٹ جائے گا اور شاید وہ ان کی نفرت برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ ہسپتال میں نہیں آئے گی۔

ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ تین چار دن تک وہ pain killer medicine اور tranquilizer میں رہے گا۔ تاکہ درد کی شدت میں کمی لانے میں درد کا احساس اور مریض کی تڑپ مخل نہ ہو۔ گھنٹہ بھر وہ سوتا رہا۔ اس دوران بے شمار انجان لوگ نوازش کی تیمارداری کے لئے آتے رہے اور اپنا خون اور خدمات کی پیشکش کرتے رہے۔ ڈاکٹر نرسیں اور عملہ حیران تھا کہ کیا کریں کیونکہ بلڈ بنک میں خون رکھنے کی گنجائش ختم ہو چکی تھی۔ ڈونرز کی ہدایت، خواہش یا تنبیہ تھی کہ ان کا خون صرف تحریک کے دوران زخم کھانے والوں کے لئے استعمال ہونا چاہئے۔ مگر ہسپتال میں آنے والے سرکاری اہلکاروں اور پولیس والے زخمیوں کی بے کسی اور ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر ڈاکٹروں نے اس خون سے خون بہانے والوں کی بھی جان بچائی۔ صبح کوئی پانچ بجے نوازش پر ادویہ کا اثر کم ہوا اور وہ کراہتے ہوئے بیدار ہوا۔ اس وقت ایک جوشیلا نوجوان بڑے تمکنت بھرے انداز میں بتا رہا تھا۔ ''بھٹو خود مولانا (مودودی) کے گھر اچھرے میں آیا۔ اور انہیں صورت حال کو سنوارنے اور قابو میں لانے کے لئے مدد کی درخواست کی ہے۔ مگر مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب تحریک رہنماؤں کے ہاتھ سے نکل کر عوام کے ہاتھ میں آچکی ہے۔ مولانا نے اسے سیدھا سیدھا کہہ دیا کہ تم لیٹ ہو گئے ہو۔ سڑکوں پر غریب اور بے آسرا لوگ خون بہا رہے ہیں اب اور ان کے لئے کیا خوف باقی رہ گیا۔ تم نے گولی سے انہیں ڈرانا چاہا تھا اب وہ خود گولی بن گئے

ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔''مولانا بہت غصے اور کرب میں تھے۔ہم اس قاتل کو دیکھ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے کیونکہ مولانا نے ہمیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ۔''مہمان کی تعظیم اور حفاظت ہمارے مذہب کا حصہ ہے۔کوئی ایک نعرہ بھی نہ لگائے۔''ورنہ آج،وہ زندہ واپس نہ جاتا۔۔۔۔۔۔۔''

نوازش اس کی باتیں سنتا رہا۔وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کمی ہے ہم میں۔اسلام کے نام پر لوگوں کے دلوں میں کیا اخلاص پایا جاتا ہے۔اب کوئی شیعہ،سنی نہیں،پنجابی پٹھان،بلوچ نہیں،سندھی نہیں۔۔سب اسلام غالب آئے گا،کا ورد کرتے ہوئے سر پر کفن باندھے اپنے ہی ملک میں اپنے ہی لوگوں،اپنی ہی حکومت کے خلاف نبرد آزما ہیں،شہادت کے شوق میں ہر شہر میں محاذِ جنگ پر سینہ سپر ہیں۔قربانی،ایثار اور اخوت،کیا نہیں ہے۔ہر کوئی ایک اجنبی کے لئے آستینیں کھولے رگیں پھیلائے چلا آ رہا ہے صرف اس لئے کہ ان کا خیال ہے کہ میں نے اسی مقصد کے حصول کے لئے زخم لئے ہیں جوان کا بھی ہے۔اس لئے وہ اس زخم کو اپنا زخم اور میری تکلیف کو اپنی تکلیف مان رہے ہیں۔اسی لئے سڑکوں پر بہنے والے خون کا خراج اپنے خون سے دینے جوق در جوق چلے آ رہے ہیں،کوئی طمع نہیں،تشہیر نہیں،ترغیب نہیں،اپنی اپنی جگہ ہر کوئی اپنا اپنا فرض ادا کرنے کو بے چین ہے۔کاش یہ جذبہ ایسا باشعور جنون بن جائے جو قوموں کے عروج کا باعث ہوا کرتا ہے۔کاش کوئی رہبر کامل مل جائے۔۔ایک اور اقبال ایک اور محمد علی جناح!!!

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

۹۔اپریل کو وہ ہسپتال لایا گیا تھا۔اور آج ۲۲۔اپریل تھی۔: سٹاف نائل پریشوز۔۔۔نوازش کو بھانے والی واحد نرس تھی جو روز اولیں سے آج تک مسلسل نوازش کی تیمارداری فرض منصبی کے بجائے فریضہ انسانی کے طور پر کر رہی تھی۔نوازش اس سے اپنی injury کے بارے میں پیش رفت دریافت کرتا رہتا اور نہایت صبر اور تسلی سے اسے اصل صورت حال بتاتی رہتی۔شروع کے دنوں میں تو اس کے گھر سے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔مگر پھر اس نے مسلسل کرفیو کی وجہ سے سب کو ہسپتال آنے سے منع کر دیا تھا۔صرف ابا ہی آتے۔اس نے ہدایت کی تھی کہ شبیر کو امریکہ اس کے اس حادثے کی خبر نہ دی جائے کہ پردیس میں پریشان ہوگا۔یوں بھی اس کے پاس اس کے خدائی تیمارداروں کا ہجوم بنا رہتا تھا۔ادھر نائل سے بھی اس کی کافی بے تکلفی ہو گئی تھی اس لئے اب اس کا ہسپتال میں جی لگ گیا تھا۔وہ نائل کی شفٹ کا بے قراری سے انتظار کرتا رہتا تھا۔جب وہ آتی تو سب سے پہلے وہ اس سے اپنے مرض کی بابت دریافت کرتا اور

وہ اسے سب کچھ صاف صاف تفصیل کے ساتھ بتا دیتی۔

آج بھی وہ زخم کے بارے میں دریافت کرنے ہی والا تھا کہ اس کے خدائی تیمار داروں نے اسے آن گھیرا۔ ''برادر کیسے ہو، ان شاء اللہ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ہم ڈاکٹر صاحب سے مل کر آ رہے ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ میڈیسن کے ذریعے بارود کے زہر سے گردوں کو صاف کر رہے ہیں۔ امید ہے سرجری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔۔۔ یہ تو تھی مقامی خبریں، ملکی خبریں یہ ہیں کہ قومی اتحاد نے کل ملک بھر میں پہیہ جام ہڑتال کی کال دی ہے۔ اس سے حکومتی ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی ہے، بھٹو نے تحریک پر امریکی پشت پناہی کا الزام لگایا ہے۔ کیونکہ یہ ملکی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا احتجاج ہے۔۔ دوسری طرف، مذاکرات کی باقاعدہ پیش کش کی ہے۔ عجیب منافقت ہے۔۔۔۔۔۔۔'' ایک کا کوٹہ ختم ہوا تو دوسرا بولا۔۔ ''مولانا مفتی محمود سے سہالہ ریسٹ ہاؤس میں کوثر نیازی نے ملاقات کی ہے اور مذاکرات کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیر باز خاں مزاری کو ڈیرہ غازی خاں سے اور اصغر خاں کو لاہور سے اور مولانا نورانی اور پیر پگارا کو کراچی سے اور نسیم ولی خان کو چارسدہ سے آج رہا کر دیا گیا ہے کل رات اسلام آباد میں اجلاس ہو رہا ہے۔ جس میں فیصلہ کیا جائے گا۔'' تیسرا بولا ''اب یہ کارواں نہیں رکے گا۔ اس کی منزل نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔'' اسی دوران ایک اور نوجوان آ گیا'' اس نے ہاتھ میں ایک تھیلا پکڑا ہوا تھا، پہلے سے موجود لوگوں میں سے ایک نے پوچھا۔ ''اتنی دیر۔۔۔؟'' نووارد نے جواب دیا۔ ''پہلے پیچھے دھنی رام روڈ پر گیا، پھر انارکلی، پھر شاہ عالمی چوک۔۔ سب دکانیں بند تھیں۔ تمہیں پتہ ہے ہڑتال چل رہی ہے۔ پھر گوالمنڈی بازار میں ایک گلی کی دکان کھلی تھی اس کی منت کی اور بتایا کہ ہمارا ایک مجاہد زخمی ہے اس کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جوس لانے کو کہا ہے اس 'شہزادے' نے پیسے بھی نہیں لئے۔۔۔۔'' اس نے بڑے فخر سے کہا۔ اور باقیوں کے چہرے تفاخر کے احساس سے چمک اٹھے اور بے اختیار ان کے منہ سے، ماشاءاللہ!! نکلا۔ پھر ان میں سے ایک نوازش سے مخاطب ہوا۔ دیکھا برادر! لوگوں کے دل کیا کہتے ہیں، تمام زخمیوں کے درد کو سب اپنے زخم جانتے ہیں۔ اپنا مورال بلند رکھو۔ یہ سیب اور ناشپاتی کا جوس ہے سپیشل۔ پیو اللہ جلد صحت دے گا۔۔۔۔۔ اچھا اب اجازت۔ پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ!!

یہ تواضع اور یہ تیمارداری۔۔۔! وہ اور ان سب دعاؤں کا حقدار تو شاید تھا۔ مگر وہ اس کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اور جب اسے اتحادی کارکن اور سرفروش آ کر اپنی جماعت یا لوگوں کی باتیں بتا

کرداد طلب نظروں سے دیکھتے تو اسے اپنے اندر عجیب قسم کی الجھن یا احساس کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ ان تمام حالات وواقعات سے بالکل لاتعلق اور الگ تھا۔ اسکی بلا سے کون کس حلقے یا الیکشن کے کس عمل میں مرایا گرفتار ہوا۔ وہ تو اتفاقاً گولی کے سامنے آ گیا تھا۔ اس کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے تھا جو کبھی متوسط اور اب زیریں متوسط طبقہ کہلاتا ہے اور جس کا معاشرے میں، کسی انقلاب میں براہ راست کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ مگر یہاں رہتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس دور نا پرساں میں، جب کوئی اپنا، درد آگاہ، کسی کی تکلیف کو اس کی اپنی کرنی یا ہونی قرار دے کر اپنا راستہ ناپتا ہے۔ پل پل اس کا پتہ رکھنے والے یہ لوگ کون ہیں۔ اس کی بیاض میں یہ لوگ بے وقوف اور سادہ تھے جو ابن الوقتوں کے مفادات کے لئے ان کے وعدوں کے جھولنے میں جھولتے ہیں۔ جب بھی کسی بھی تنظیم، جماعت کے زخمی رکن یا ورکر کو غازی قرار دیا جاتا اور کسی کی موت کو شہادت کے کفن میں لپیٹ کر خبروں میں دفن کیا جاتا تو وہ طنزیہ انداز میں اپنے اندر ہی اندر مسکرا دیتا۔ ہونہہ! شہادت کو ان لوگوں نے مذاق سمجھ رکھا ہے۔ منڈی میں دھڑیوں میں کوڑیوں کے مول بکتی ہے گویا۔!!۔۔۔ مگر اب وہ یہاں ان دنوں میں وہ اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ یہ سیاسی بزرجمہروں کا کردار اور ایمان اپنی جگہ مگر اس غریب اور محروم طبقے کا سیاسی رویہ، ہر چند اصلاح طلب اور نظر ثانی کا طالب سہی مگر ان لوگوں کے جذبے سچے اور محبتیں خالص ہیں۔ ریاکاری سے پاک ان سادہ لوح عوام کی تقدیر کب بدلے گی۔؟؟ اس کے ذہن میں یہ سوال اک ٹیس بن کر اٹھا۔ مگر جواب نہ پا کر سیاستدانوں کی نفرت کا روپ دھار کر اس کے دل میں اتر گیا۔۔ ننگِ انسانیت، ننگِ وطن۔۔۔ یہ نیرنگی سیاست کے پروردہ، نجانے ان کا ضمیر کس مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ انسانی جذبوں کے سمگلر۔۔۔ ان کے لئے کوئی قانون نہیں۔ آئین میں کوئی سزا نہیں۔۔۔؟؟؟ کتنے کتنے عالم، فاضل۔ امیر کبیر، سرمایہ دار اور زیرک لوگ اس سیاست میں آ کر ،، چلتا ہے، سب چلتا ہے، مجبوری ہے۔'' کہہ کر سب کچھ کرتے ہیں، سکندر مرزا نے ایوب خان کو معتمد بنایا، اس نے بھٹو کو بیٹا بنایا۔ بھٹو نے سیاست میں رنگ جمایا۔ غریب عوام کو بے وقوف بنایا۔۔۔ آخری فتح غریب عوام کی ہوگی کا نعرہ لگایا اور ''آخر'' مچادی۔ اقتدار میں آتے ہی عوام باہر اور سرمایہ دار اور جاگیردار پھر ایوان اقتدار میں، سیاسی قتل، غنڈہ گردی، سرکاری نیم سرکاری اور نجی اداروں کی بندر بانٹ۔۔۔۔ سیاست اور سیاستدان، طوائف اور تماش بین تھے ہی مگر اب حکمرانی، عیاشی کا مرقع بن گئی، ایوان صدر اور گورنر ہاؤس، بھانڈوں، رانڈوں اور بھڑووں کی تفریح گاہ بن

گئے۔ پارٹی کے نظریاتی، بانی ارکان اور سرخ دانشور، سب ایک ایک کر کے نکال دیئے گئے یا نکلنے پر۔۔۔نہایت ذلت آمیز طریقے سے۔۔۔۔۔مجبور کر دیئے گئے۔ جو بولے وہ دلائی کیمپ میں۔مگر ساتھ کھڑے ہیں تو عوام۔!

آج بھی ساری جماعتیں مل کر بھٹو کی اکثریت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔اس کے دور حکومت میں اس کے کرتوتوں کی وجہ سے اس کی اکثریت، کم ہوئی تھی، ختم نہیں ہوئی تھی۔ قائدِ اعظم کے بعد شاید بھٹو ہی تھا کہ جسے عوام کا بے لوث اعتبار، پیار ملا۔ جسے عوام نے ٹوٹ کر پیار کیا ،مگر وہ اپنی ذات کے سوا کسی سے بھی مخلص نہ نکلا۔ کاش، قائد کی قابلیت کا حامل یہ شخص کردار اور اخلاص اور اخلاق میں عام سطح پر ہی فائز ہوتا۔!!!۔۔۔۔۔۔۔۔اٹینڈنٹ باہر چلے جائیں ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آرہے ہیں۔ ہسپتال کے ہرکارے کے اعلان پر اس کے خیالات کا تانا بانا بکھر گیا۔اور وہ ملکی تناظر سے نکل کر ایک دفعہ پھر ہسپتال کے یبوست زدہ ماحول میں آ گیا۔تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کا راؤنڈ شروع ہوا۔ نائل بھی ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ تھی۔ ہر بیڈ پر تھوڑا تھوڑا وقت رک کر ڈاکٹر نعیم اس کی فائل چیک کرتا اور نائل کو کہیں زبانی کہیں تحریری ہدایات دیتا ہوا نوازش کے پاس آ گیا، آج نجانے کیوں وہ اپنے آپ کو کھوکھلا اور اندر ہی اندر شرمندہ سا محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر روایتی خوشگوار موڈ میں تھا۔ ''ہاں جی! نوازش علی صاحب بڑی دھمکی آمیز سفارشیں مل رہی ہیں آپ کے لئے۔۔۔''

''میں معافی چاہتا ہوں ان تمام ان دیکھے اور انجانے ہمدردوں کی طرف سے۔۔۔میں آپ کے علاج سے پوری طرح مطمئن ہوں۔'' نوازش نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں take it easy ہمیں اس طرح کی صورت حال سے روز گزرنا پڑتا ہے۔۔اور سنائیں کیا کہہ رہی ہے سیاست آپ کی؟'' نوازش کی فائل دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نعیم کا موڈ فوراً بدل گیا اس نے نائل کو مخاطب کیا۔ ''سٹاف! یہ کیا ہے۔''

''جی!'' نائل نے قدم آگے بڑھا کر پوچھا۔ ''کیا۔۔س سر!'' وہ ذرا گھبرا سی گئی۔

''گیارہ نمبر کی فائل آپ نے لکھی۔ یہ نامکمل ہے۔ اسے مکمل کیجئے۔'' ڈاکٹر نے غصے سے فائل، نائل کی طرف بڑھائی۔

''یہ تم لوگوں کو ڈائجسٹ پڑھنے اور گپیں ہانکنے کے سوا بھی کچھ آتا ہے۔۔'' ڈاکٹر کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔

''جی؟ ڈاکٹر! میں سمجھی نہیں!'' مگر فائل کھولتے ہوئے اسے یاد آ گیا۔ نوازش کی pulse والا

خانہ خالی تھا۔" اوہ! سوری ڈاکٹر۔" کہہ کر وہ نوازش کی pulse لینے کے لئے آگے بڑھی۔
"مس نائل آپ کا دماغ کہاں ہوتا ہے۔" ابھی تک ڈاکٹر کا موڈ آف تھا۔ نوازش ساری صورت حال کا ذمہ دار تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا نائل اس کی کلائی ہاتھ میں لے چکی تھی اس نے نوازش کی کلائی دبا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ دیا۔
"ہاں جی نوازش صاحب کیسے گزر رہی ہے، ویسے یہ سوال تو بے معنی ہے، ہسپتال میں تو ظاہر ہے آدمی بور ہو جاتا ہے۔" دوبارہ ڈاکٹر نے اپنے اوپر سابقہ موڈ طاری کر لیا۔
نوازش نے پوچھا۔" ڈاکٹر صاحب۔ مزید کتنا عرصہ میں بستر پر۔۔۔۔ میرا مطلب ہے چلنے پھرنے کے لئے۔۔۔۔"
ڈاکٹر نے نائل کو بلایا۔" سٹاف! انہیں ویل چیئر پر آدھا گھنٹہ" وہ نوازش سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔" چند قدم، پیدل بھی چلنے کی کوشش کیجئے گا مگر زیادہ نہیں، آہستہ آہستہ۔۔۔ ٹھیک ہے۔" پھر سٹاف سے کہا۔۔ پلیز آپ۔۔۔"
"لیکن ڈاکٹر، وارڈ۔؟" نائل نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔"
ہاں دوسری سٹاف she will look after "
"او کے ڈاکٹر!"
نائل ویل چیئر دھکیلتی ہوئی لان کی طرف چل رہی تھی۔ نوازش نے کہا۔" آج نجانے کتنے دنوں بعد کھلا آسمان دیکھا ہے تو اپنے ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔" نائل ویل چیئر دھکیلتی رہی۔ شاید اس نے نوازش کی بات نہیں سنی تھی۔ اس لئے اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوازش نے سمجھا کہ اس کا موڈ آف ہے۔ چنانچہ بڑی لجاحت سے بولا۔" سٹاف جی! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں اور خود کو آپ کے ساتھ ہونے والے سلوک کا ذمہ دار بلکہ گنہگار محسوس کر رہا ہوں۔۔۔"
نائل نے نہایت ملائمت اور مہربان لہجے میں کہا۔" ایسی تو کوئی خاص بات نہیں، ہم نرسوں کے ساتھ ڈاکٹر۔۔۔"
مگر میں ڈاکٹر کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں بلکہ میں نے ہی آپ کو منع کیا تھا۔"
نوازش نے اسکی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
نائل نے کہا۔" شکر ہے آپ چپ رہے ورنہ آپ جو صفائی پیش کرنے جا رہے تھے وہ زیادہ بڑی بات بن جاتی۔۔۔"

نوازش نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اسے پوچھا "میں سمجھا نہیں۔"
"ڈاکٹر آپ کی صفائی قبول کرنے کے بجائے۔۔۔ ہونہہ مس نائل گیارہ نمبر تمہارے لئے بڑی ہمدردی رکھتا ہے۔۔ کہہ کر کوئی اور بات بنا دیتا۔ میں آپ کی شکرگزار ہوں کہ آپ چپ رہے۔!!" نائل کے لہجے میں ڈاکٹروں کے رویے کے خلاف رمزیہ احتجاج تھا۔
"بہرحال میں معذرت۔۔۔" نوازش نے موضوع سمیٹتے ہوئے کہا۔
"معذرت قبول ل ل!!! اب آپ کی سیڑھی سے اتر کر تم کے زینے پر آجایئے۔" نائل نے ہنستے ہوئے کہا اور یوں ہوگئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ "نائل تم بہت اچھی ہو۔ میں نے تمہارے پروفیشن کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔ اس نے نائل کی خواہش کی احترام کرتے ہوئے تم کا صیغہ استعمال کیا۔" نائل ، میں اپنے بچپن میں ایک نرس کو اپنی دادی کی تیمارداری کرتے دیکھا تھا۔ وہ دادی کے انتقال کے بعد بھی وہ ایک مدت تک ہمارے گھر آتی رہی۔ مجھے وہ بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کی موجودگی میں مجھے ایک عجیب سا سکون محسوس ہوتا تھا۔ جب وہ چلی جاتی تو میں اداس ہو جاتا۔ سارے گھر والے مجھے اس کے حوالے سے چھیڑا کرتے۔۔۔۔ یہ میری زندگی کی شاید پہلی محبت تھی۔ میری عمر اس وقت کوئی چھ سات برس تھی۔ اس محبت کی کیا نوعیت تھی، پتہ نہیں۔ لیکن وہ محبت ہی تھی۔ کیونکہ محبت میں اب بھی میرا دل اسی طرح دھڑکتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ کسی نرس کو اپنی شریک حیات بناؤں مگر میری اس خواہش کی شدید مخالفت کی گئی۔ خاص طور پر میری بہنوں نے تو۔۔۔۔۔۔ بہر حال اس پیشے کی عزت میرے دل میں آج بھی قائم ہے اور نائل تمہیں دیکھ کر میرے اس عزم کی تجدید ہوگئی ہے کہ اگر میں نے شادی کی اور اللہ نے مجھے بیٹی دی تو میں اسے اسی پروفیشن۔۔۔۔"
نائل نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "نوازش صاحب ،منہ سے نکلی اکثر پوری ہوجاتی ہے۔ آپ بہت جذباتی انسان ہیں۔ صاف دل۔۔۔، جو دل میں ہوتا ہے منہ سے۔۔۔ منہ پہ۔۔۔ کہہ دیتے ہیں۔ اللہ نہ کرے آپ کی بیٹی یا کوئی بھی عزت دار اس پیشے کی طرف آئے۔ شاید یہ ایک چھوٹی سی جھلک تھی نرس کی عزت کی، جو آپ نے دیکھی ہے۔ اگر اللہ آپ کو بیٹی دے تو اسے ڈاکٹر بنایئے گا۔۔ ہمارے معاشرے میں طوائف کی شاید زیادہ چاہت ہے۔ نرس کی زندگی تو موت سے بدتر ہے۔ لوگ طوائفوں کے حسن اور اداؤں سے متاثر ہو کر انہیں گھر میں ڈال لیتے ہیں۔ مگر نرس۔۔۔۔، اس کی

آنکھوں میں تیرتے آنسو اس کے گالوں پر اتر آئے۔۔ نوازش صاحب، ہم نرسیں تو وہ گندگی بھی اٹھاتی ہیں جو شاید بھنگی بھی اٹھانے سے پہلے منہ لپیٹ لیتا ہے۔"

"مس نائل! ایک ذاتی سا سوال ہے پوچھو؟"

"جی! پوچھیے"

"تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا"

"آہ ہ ہ!!!۔۔۔ جنگ عظیم میں میجر مائیکل بنجمن سنگاپور کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف لڑتے ہوئے جب شدید زخمی ہوئے تو ایک نرس ان کو گولوں کی بوچھاڑ سے نکال کر لائی اور ان کی تیمارداری کرتی رہی۔ اس کا شوہر ملایا (ملائشیا) ٹرانسفر ہوا تو اس نے ساتھ جانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اپنے مریض کو بے علاج چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ اس نرس کا نام نائل تھا، اسکی قربانی اور ایثار سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ جنگ کے بعد انہوں نے ہندوستان آ کر سیالکوٹ میں ایک اینگلو انڈین سے شادی کر لی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ یہیں قیام کرنا چاہتے تھے مگر انہیں انگلستان واپس بلا لیا گیا۔ ان کی بیوی جو اس وقت حاملہ تھیں، ڈاکٹر نے بحری جہاز یا ہوائی جہاز کے سفر سے منع کر دیا۔ ویسے بھی مسز بنجمن اپنے وطن میں رہنا چاہتی تھیں۔ بہر حال میجر بنجمن نے جلد لوٹ آنے کا وعدہ کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ اگر بیٹی ہوئی تو وہ اس کا نام نائل رکھیں گی اور اسے نرس بنائیں گے۔۔۔" نائل نے ذرا رک کر ٹھنڈی آہ بھری اور بولی۔ "نوازش صاحب! میری تقدیر کا فیصلہ تو میری پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔۔۔۔ میجر بنجمن کبھی لوٹ کر نہ آئے مگر ماما مشرقی عورت تھی۔ خاوند کی خواہش کا احترام کیا اور مجھے اور بھیا کو پالا پڑھایا، اکلاپے کا عذاب سہا بھائی سے ماں کو امید تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی اچھی ملازمت پر لگے گا تو گھر کا خرچ اٹھانے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی، میرے بارے میں بھی باپ بن کر سوچے گا۔ مگر۔۔۔۔!! بھیا نے کراچی والے مکان پر قبضہ کر کے ایک ایئر ہوسٹس سے شادی کر لی۔ ماما نے جہاں اتنے صدمے برداشت کئے یہ صدمہ بھی چپکے سے سہ گئی مگر میرے ہاتھ پیلے کرنے کی خواہش میں پہلے منہ دنیا سے چلی گئی میرے پاس یہی قابلیت تھی سو کام آئی۔ مگر میں کسی کے کام کی نہ رہی۔۔۔۔۔" نائل کی آنکھیں ٹپ ٹپ برسنے لگیں۔ اس نے جلدی سے آنکھیں پونچھیں۔ "میرا خیال ہے کہانی لمبی ہو گئی۔ زیادہ وقت ہو چکا ہے۔ چلیں۔" نوازش کھلی فضا میں ذہنی اور دلی آسودگی محسوس کر رہا تھا اور نائل کی جیون کتھا سننے کے بعد ایک افسردگی اور دکھ کے موڈ میں وہ تھوڑی دیر کے لئے مزید اس سبزہ زار میں رکنا

چاہتا تھا۔ کیاریوں میں اگے ہوئے ننھے ننھے، رنگ برنگے پھولوں سے جو خوشبو شام کی ہوا اس کی اداس روح کو ایک طرح کی بالیدگی عطا کر رہی تھی۔ مگر ڈھلتی شام کے باعث اسے جانے کے لئے ہامی بھرنا پڑی اور نائل اس کی ویل چیر چلاتی ہوئی اسے وارڈ کی طرف لے کر چل دی۔

نوازش کو ہسپتال میں داخل ہوئے ایک ماہ ہونے کو آیا مگر گردوں کا مرض ختم نہ ہوا۔ آخرش ڈاکٹروں کے پینل نے گردے کی تبدیلی، انتہائی علاج قرار دیا۔ اس سلسلے میں دو مشکلات تھیں: اول یہ کہ گردہ کون دے اور دوم یہ کہ اگر گردہ مل بھی جائے تو اسے ٹرانسپلانٹ کون کرے گا۔ ۔۔۔؟

پھر ایکدم گویا کوئی معجزہ ہوا۔ پتہ چلا کہ گردے کا انتظام ہو گیا ہے۔ کون ہے وہ؟ نام صیغہ راز میں رکھنے کی تلقین ہے۔ اصرار کیا، کون ہے؟ جواب ملا۔ آم کھاؤ پیڑ نہ گنو۔ اور دو مہینوں کے اندر اندر اس کی زندگی اپنی پرانی ڈگر پر آ گئی۔ مگر ابھی بارگاہ عشق کے کچھ اور امتحان باقی تھے ۔۔۔ ہسپتال میں داخل ہونے سے فارغ ہونے تک محکمے والوں نے پلٹ کر نہ دیکھا لیکن جونہی وہ صحت مند ہو کر واپس آیا تو اسے شوکاز نوٹس تھما دیا گیا جس کی رو سے اس نے حکومت کے خلاف عوامی احتجاجی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہوا اور دو ماہ تک ملازمت سے بغیر پیشگی منظوری غیر حاضر رہا۔ چنانچہ Esta Coed کی فلاں دفعہ، زیریں دفعہ فلاں فلاں کے تحت کیوں نہ اسے ملازمت سے برخواست کر دیا جائے ۔۔۔ اس نے جواب میں حلفیہ لکھا کہ وہ ایک استاد ہے اور ان کا کسی قسم کی کسی تحریک سے کوئی تعلق نہیں۔ اور گولی اتفاقاً لگی۔

اگلے روز جب وہ یونیورسٹی آیا۔ ڈیپارٹمنٹ کے برآمدے میں سٹاف روم کے سامنے چپڑاسی ایک نوٹس لے کر آ گیا۔ اور اسے دے کر رجسٹر پر اس سے دستخط کرائے۔ نوازش لفافہ کھولتا ہوا سٹاف روم میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ اس لیٹر کی تحریر پڑھ کر اس کے قدم باہر ہی رک گئے لمبی چوڑی تفصیل کا لب لباب یہ تھا کہ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود اس نے سرکار کیخلاف تحریک میں حصہ لیا جس کی شہادت ذرائع ابلاغ کے ساتھ ساتھ اس ہسپتال کے روزنامچے سے بھی ملتی ہے جہاں وہ زخمی ہونے کے بعد برائے علاج داخل ہوا۔ اور یہ کہ جب تک انکوائری کمیٹی اپنی رپورٹ نہ دے آپ کو یونیورسٹی کے تمام کیمپس کی حدود میں داخل ہونے، کلاس میں جانے کی اجازت نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ وغیرہ"

جب اس نے دیکھا کہ جامعہ کی دیواروں پر اس کی حمایت میں اور انتظامیہ کے اس عمل

کے بارے میں احتجاجی اور دھمکی آمیز کلمات لکھے ہوئے تھے۔جن کی نوعیت کچھ یوں تھی:

''اسلام دشمنوں کی سازش۔۔۔۔شوکاز ٹو نوازش!!''

''سر نوازش کیخلاف ہر سازش کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔''

''سر نوازش کی معطلی کے احکامات واپس نہ لیئے گئے تو۔۔۔۔۔!!!!''

وہ جن کی وجہ سے یہ افتاد اس پر پڑی تھی وہ مکمل طور پر اس کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کر رہے تھے۔ ۔نوازش نے مسکرا دیوار پر نوشتہ نعرے پڑھے ہنگاموں کے مابعد تاثرات کے باعث یونیورسٹی میں تدریس کا عمل تو پہلے ہی معطل تھا۔ ایک ویرانی ہی ویرانی تھی۔نوازش نے کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھا اور الٹے قدموں واپس آ گیا۔

گھر پہنچا۔گھر بیٹھے بیٹھے اسے اچانک نائل یاد آ گئی ..... ابھی تک یہ تجسس موجود تھا کہ اسے گردہ دان کرنے والا دانی کون ہے۔اس لئے وہ اپنی فراغت کا فائدہ اٹھا کر میو ہسپتال کی طرف چل پڑا۔۔۔۔ہسپتال پہنچا تو نائل کے بارے میں پتہ چلا کہ ڈے آف ہے شام کو آئے گی۔ہاسٹل میں وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔اس وقت کوئی چار بجے کا وقت تھا۔ابھی اس کی شفٹ شروع ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے۔چنانچہ وقت گزارنے کے لئے وہ انارکلی بازار میں چلا آیا۔حکومت او راپوزیشن کے درمیان مذاکرات چل رہے تھے اس لئے ملکی حالات میں کچھ بہتری آ رہی تھی۔ ہڑتالوں کا سلسلہ رک گیا تھا البتہ احتجاجی مظاہرے اب بھی جاری تھے ہر روز ہر شہر میں کسی نہ کسی مسجد کے باہر مقامی قیادت گرفتاری پیش کرتی اور پتھراؤ اور معمولی لاٹھی چارج کے بعد آج کی کارروائی ختم ہو جاتی۔یہی وجہ تھی کہ بازاروں کی رونق لوٹ آئی تھی اور مشتری اور بائع دونوں اس لئے خرید و فرخت میں سرگرم تھے کہ نجانے فریقین کے درمیان کوئی معاہدہ ہو نہ ہو اور مبادہ پھر ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو جائے، چنانچہ جب وہ ایبک روڈ سے گزر کر انارکلی بازار میں داخل ہوا تو کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔اسی اثنا میں اس کی نائل سے مڈبھیڑ ہو گئی وہ بھی کچھ خریداری کر کے ہاسٹل کو لوٹ رہی تھی۔اس کے دونوں ہاتھوں میں خریدی ہوئی اشیاء کے لفافے تھے۔یوں اچانک نوازش کو سامنے پا کر وہ دم بخود رہ گئی۔سلام دعا اور ایک دوسرے کی خیریت پوچھنے کے بعد چلتے چلتے نوازش نے اپنی آمد اور اسے ڈھونڈنے کا مقصد بیان کیا۔نائل نے پہلے تو کچھ پس و پیش کی مگر جب نوازش کا اصرار بڑھا تو اس نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہہ دیا کہ وہ جس نے گردہ عطیہ کیا ہے وہ ان دنوں پاکستان میں نہیں ہے۔اور نوازش سے اس کا فون نمبر لے کر اسے یقین دلایا

کہ جب بھی اس کا رابطہ نوازش کے محسن سے ہوا وہ اسے ضرور مطلع کرے گی اور ساتھ ہی ساتھ اسے نوازش کی ملنے کی خواہش سے بھی آگاہ کر دے گی۔ باتیں کرتے کرتے وہ لیڈی مکلیگن ہسپتال کے پاس نرسز ہاسٹل پہنچ گئے۔ یہاں پہ نائل کو خدا حافظ کہا اور گھر واپس آ گیا۔

ان دنوں نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں بی سی سی آئی کا طوطی بولتا تھا۔ اس بنک کے سربراہ آغا حسن عابدی کا نام بنکنگ کی دنیا میں بڑے عزت اور احترام سے لیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے بنکر آغا صاحب کا نام بڑے رشک آمیز لہجے میں کرتے تھے اور اپنے جونیئرز کو آغا صاحب کے کیریئر کے آغاز اور نشیب و فراز کے قصے سناتے۔ یہ بنک اگرچہ برطانیہ میں رجسٹرڈ تھا مگر اس کا زیادہ تر کاروبار خلیجی ممالک میں تھا۔ اور پاکستان میں بنکوں کے قومیائے جانے کے بعد نجی شعبے میں بنک کھولنے کی اجازت نہیں تھی اس لئے یہاں اس کی برانچیں فارن بنک کے طور پر بزنس کرتی تھیں اور بیرون ملک کے لئے یہیں سے ریکروٹمنٹ ہوتی تھی۔ اس بنک کے salary structure اور fringe benefits دیکھتے ہوئے ہر کوئی اس بینک میں ملازمت کے خواب دیکھتا تھا۔ یہ نوازش کی خوش قسمتی تھی کہ نیشنل سینٹر میں فارن انویسٹمنٹ پر ایک سیمینار میں نوازش کی اولگا میڈم سے ملاقات ہو گئی۔ اور اس نے نیلسن سے لے کر اپنی معطلی تک کے تمام واقعات اس کہہ سنائے۔ نیلسن کے بارے میں نوازش کے فیصلے کو میڈم اولگا نے بڑی تحسین بھری نظر سے دیکھا اور کہا کہ ”my son I am proud of you مجھے تم سے اسی طرح کے realistic behaviour اور realistic فیصلے کی امید تھی۔

well done, my son. ۔ نوازش نے دل ہی دل میں کہا ’میڈم تمہارا یہ ویل ڈن لینے کے لئے میں نے خود کو کس کرب سے گھسیٹا ہے اپنی خواہشوں کو کس طرح رگیدا ہے۔ تمہیں کیا خبر ۔۔۔ میڈم تم تو چراغ راہ گزر ہو۔ تمہیں کیا پتہ دورون خانہ کیا کیا ہنگامے ہوئے۔ میڈم نے بتایا کہ وہ ان دنوں بی سی سی آئی میں جائنٹ ڈائریکٹر ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ نوازش کو بنک جائن کرنے کا مشورہ دیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! نوازش کو ایک ماہ کی معطلی پہاڑ لگ رہی تھی۔ اور یوں بھی وہ اس ماحول سے نکلنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر کامریڈ اور نازاں کے واقعے کے بعد تو وہ اس ملازمت سے بیزار سا رہنے لگا تھا اس میں کچھ حصہ یونیورسٹی میں نیلسن سے وابستہ یادوں کا بھی تھا۔۔ چنانچہ جب میڈم نے بتایا کہ چند ہی دن پہلے ان کے بنک میں گریڈ تھری کی ایک جگہ بنی ہے تو اس نے میڈم کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کی درخواست کر دی۔ قسمت کی دیوی ان دنوں

شاید اس پر مہربان ہو گئی تھی چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی دنوں میں نواز ش علی پی سی آئی میں گریڈ تھری آفیسر کا appointment letter لے کر ٹرینگ کے لئے کراچی پہنچ گیا۔

نواز ش کراچی میں اپنے قیام کی یادیں لے کر لاہور آیا تو اسے پتہ چلا کہ اس کے لئے دھڑا دھڑ لڑکیاں دیکھی جا رہی ہیں۔ان کے خد و خال قد بت پر اپنی اپنی رائے دی جا رہی ہے۔۔۔"پتہ نہیں نواز ش کو پسند آئے؟۔۔ان کی پسند بہت اونچی ہے۔۔۔نہیں یہ رشتہ نہیں۔۔!! کوئی اور دیکھتے ہیں۔نواز ش کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔اسے اپنے گھر والوں پر سخت غصہ آتا تھا۔بڑی باجی اور چھوٹی باجی یا اس کی بھانجیاں بھتیجیاں تو اپنی جگہ نادان ہیں۔۔۔یا عورتیں ہیں مگر یہاں تو ابا جان بھی لڑکیوں کو پسند و ناپسند کے بارے میں عورتوں ہی کی طرح مین میخ نکالتے تھے۔۔۔۔یہ بڑے بڑے آدرشوں اور اصولوں والے۔۔۔خاندانی ہونے کا دعویٰ کرنے والے۔۔۔!!! یہ کیا ہو جاتا ہے ان لوگوں کو۔۔۔کسی کی بہن بیٹی کو جنس خرید کی طرح پرکھنا۔اور اس کے جسم کے حصوں کی پیمائش کرنا۔۔۔۔یہ ساری صورت حال دیکھ کر آخر ایک دن وہ اس نے بڑی آپا سے،۔۔۔۔جو ڈیرہ غازی خان سے صرف اس کا رشتہ دیکھنے کے لئے آئی ہوئی تھی۔۔کہا آپا جانی بند کرو اس پریکٹس کو۔مجھے چند ہی دنوں میں ابو ظہبی چلے جانا ہے۔جب واپس آؤں تو اپنے چاؤ پورے کر لیجئے گا۔اب میرا پنڈ چھوڑیں۔"

چھٹکی نے شرارت سے کہا "اگر کوئی دیکھ رکھی ہے تو اس کی تصویر ہی دیجئے بھائی جان!۔"

نواز ش کا دھیان فوراً ایلسن کی طرف چلا گیا۔مگر اس نے اپنے جذبات پر قابو پا کر بڑی سرد مہری سے جواب دیا۔"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔رشتہ آپ ہی دیکھئے گا مگر اس طرح نہیں جیسے قربانی کا جانور خریدا جاتا ہے۔"

بڑی آپا نے کہا۔"ہائے اللہ نہ کرے نواز ش تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ہم کوئی تمہارے دشمن تو نہیں۔ظاہر ہے اپنے بھائی کی دلہن بھائی کے معیار کی تو لانی ہے نا۔"

نواز ش نے کہا۔"آپ کو پتہ ہے میرا معیار کیا ہے،مجھ سے پوچھا ہے۔؟"

چھٹکی نے کہا۔"لو! پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ہمیں پتہ ہے ہمارے بھائی کو کیسی دلہن چاہئے۔"

"نہیں! تم لوگوں کو بالکل نہیں پتہ اور نہ ہی کسی نے مجھ سے پوچھا ہے۔" نواز ش کے لہجے میں احتجاج کی ہلکی سی رمز تھی۔ابا جان نے نواز ش کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔۔"اپنے جمائے ہوؤں کے دانت نہیں گنا کرتے۔۔۔۔! تم اس کھیل میں اپنی باری کھیل چکے ہو۔(نواز ش سمجھ

گیا۔ ابا جان کا اشارہ نیلسن کی طرف تھا) یہ تمہاری بہنیں ہیں۔ اب انہیں کرنے دو جو یہ کر رہی ہیں۔۔"

نوازش نے دھیمے سے لہجے میں ناگواری سے کہا" مگر ابا جان۔ اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے کسی کی عزت نفس سے کھیلنے کا تو کوئی جواز نہیں۔"

ابا جان نے پیار سے کہا۔"چلو۔ کرنے دو اپنا چاؤ پورا۔۔ شادی کونسی روز روز ہوتی ہے۔"

اب نوازش کے لئے، خطائے بزرگاں گرفتن خطاست، کی روشنی میں چپ ہو جانا ہی مناسب تھا۔ سو وہ چپ ہو رہا۔

کوئی دو ہفتے بعد اسے ابوظہبی کے لئے روانگی کے آرڈر ملے تو اس نے والدین کے بعد یہ خوشخبری سب سے پہلے کراچی فون کر کے شمسہ کو سنائی۔ (شمسہ کون تھی اس کے احوال اور کراچی کے واقعات کا ہماری کہانی کے نیٹ ورک سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ اس کے تسلسل کے لئے ایک الگ ناول۔۔۔ زیر تصنیف ہے۔)

وہ مقام آیا حیات میں، وہ سلجھ گیا میں الجھ گئی
رہی اس کے جال میں کاٹتی ،میرے گرد بن گیا جال سا

نیلسن جب نوازش کی معذرت کے ساتھ گھر پہنچی تو اس کے گھر پر مہمانوں کی گہما گہمی تھی اس کی ممی نے بتایا کہ یہ لوگ اس کا رشتہ دیکھنے کیلئے آئے ہیں اس لئے وہ جلدی سے کپڑے بدل کر تیار ہو جائے۔ نیلسن نے گم صم، ممی کے حکم کی تعمیل کی۔ اور تیار ہو کر مہمانوں کے سامنے آ گئی۔۔۔ مہمان کچھ دیر ان کے ہاں ٹھہرے پھر چلے گئے۔ اور گھر جانے کے بعد انہوں نے فون پر بتا دیا کہ انہیں اور ان کے بیٹے آصف سوشیل کو نیلسن پسند آ گئی ہے۔ مگر وہ چٹ منگنی پٹ بیاہ چاہتے ہیں۔ اس کے والدین کو بھی لڑکا پسند آ گیا تھا چنانچہ انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ البتہ نیلسن سے پوچھا گیا تو اس نے چپ چاپ ہاں کر دی۔ چنانچہ اگلے ہی ہفتے نیلسن اور سوشیل رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے۔ سوشیل جنرل ہسپتال میں لیبارٹری ٹیکنیشن تھا۔ تھا۔ وہ اپنی عمر کے نوجوانوں سے ذرا مختلف تھا عام طور پر اس عمر میں سنجیدگی شخصیت کا عیب بن کر سامنے آتی ہے۔ مگر وہ سنجیدہ اور خاموش طبع واقع ہوا تھا۔ ادھر نیلسن بھی اسے دیگر لڑکیوں سے مختلف لگی۔ کیونکہ چوں چرا اس کی طبیعت سے کوسوں پرے تھی۔ ان کی شادی کو تین سال ہونے کو آئے تھے مگر نیلسن کی کوکھ ابھی تک خالی تھی۔ مگر دونوں کے درمیان کبھی اونچ نیچ، جو عام طور پر ازدواجی زندگی کا خاصہ ہے، نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق نقص سوشیل میں تھا۔ جس کے لئے سال بھر سے علاج جاری تھا۔ اس کے علاوہ عجیب بات تھی کہ اس تمام عرصے میں دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔ شاید اپنی اپنی جگہ پر دونوں نے کبھی اس کی ضرورت نہ محسوس کی تھی۔ البتہ دونوں اپنی اپنی جگہ بجھے بجھے سے رہتے تھے۔ ان کے میکے اور سسرال والوں کا خیال تھا کہ یہ اداسی شاید لاولدیت کی وجہ سے ہے۔ اس لئے وہ انہیں وقتاً فوقتاً حوصلہ دیتے رہتے۔ بلکہ اب تو انہوں نے اپنے اپنے والدین کے اصرار پر راہبوں، روحانیوں اور پیروں فقیروں کے پاس بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ جو جس نے کہا کیا؛ کبھی صدقے کا بکرا، کہیں تعویذ گنڈے۔ کبھی ٹونا ٹوٹکا۔۔۔ سرما کی چاندنی

رات میں چھت جا کر سارے کپڑے اتار کر پھر پہنو۔۔کبھی چالیس دن داتا دربار کی نیاز کے علاوہ کچھ نہیں کھانا۔۔کبھی ننگے پاؤں میاں میر کی درگاہ کا طواف۔۔۔الغرض جو کسی نے کہا کیا۔آخر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔اسی طرح ایک سال اور بیت گیا ایک دن سوشیل نے زبان کھولی۔''نیلی! ۔۔۔''میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔امید ہے تم برا نہیں مانو گی۔نیلسن نے اثبات میں سر ہلایا مگر اس کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تجسس یا تفکر نہ ابھرا۔سوشیل نے کہا۔''شادی سے پہلے میں میو ہسپتال کی ایک نرس، نائل سے پیار کرتا تھا۔۔۔میرا مطلب ہے۔۔اب۔۔بھی۔۔۔'' وہ رک رک کر بول رہا تھا۔اس کی یہ بات سنکر بھی نیلسن کا چہرہ کسی قسم کے ردِ عمل سے عاری تھا۔سوشیل کہہ رہا تھا۔''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس کا نرس ہونا ہماری شادی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا۔میں نے اسے کہا نرسنگ چھوڑ دو مگر وہ آمادہ نہ ہوئی اور میرے والدین تو سرے ہی سے نرس سے شادی کے شدید مخالف تھے۔وہ خواہ نرسنگ چھوڑتی یا نہ چھوڑتی اس کا نرس ہونا ہی اس کی سب سے بڑی نااہلیت تھی۔مگر میں نے سوچا شاید اس طرح وہ مان ہی جائیں۔بہر حال میں ابھی تک اس سے پیار کرتا ہوں۔۔۔۔۔''سوشیل نے اپنی گفتگو کی پنچ لائن ماری اور چپ ہو کر نیلسن کے رد عمل کا انتظار کرتا رہا۔مگر وہ بالکل پر سکون تھی۔۔شوشیل نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہیں تھا۔اس نے دل ہی دل میں سوچا۔کیسی بیوی ہے یہ، جسے اپنے خاوند۔۔۔۔!نیلسن ابھی تک چپ تھی بولی۔''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں۔۔۔میں۔۔۔اگر تم اجازت دو تو نائل۔۔۔'' وہ اس کا ردعمل جاننے کے لئے چپ ہو گیا۔مگر نیلسن نے کسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔سوشیل نے اپنی بات مکمل کر دی۔''۔۔۔میں نائل کو دیکھنا چاہتا ہوں۔اسے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔میں نے اس کا دل دکھایا ہے شاید اسی وجہ سے ہم اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔۔!''

نیلسن نے اس کی بات کا پھر کوئی جواب نہیں دیا۔وہ ہی بولتا رہا۔وہ سنتی رہی۔آخر میں اس نے کہا۔

''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔میو ہسپتال!''

اب نیلسن بولی۔''میں بھی اسے ملنا چاہوں گی۔''سوشیل ایک لمحے کے لئے چونکا اور اس نے نیلسن کی آنکھوں میں جھانکا۔جو ابھی تک کسی تاثر سے خالی تھیں۔سوشیل نے ہامی بھر لی۔

ان دنوں ملک ہنگاموں کی زد میں تھا اس لئے ہر روز جلسے جلوس اور پولیس، مظاہرین کے لاٹھی چارج اور پتھراؤ کے باعث وہ باہر نہ نکل سکے۔اور جب شہر میں گولی چلنے اور لاشوں کے گرنے کی

خبریں آنا شروع ہوئیں تو وہ آرام سے گھر بیٹھ کر سیاسی گرد چھٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ پھر حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات کی خبریں آنا شروع ہوئیں او رحالات نارمل ہوئے۔ تو ایک دن سوشیل نیلسن کو لے کر میو ہسپتال گیا۔ نائل بڑے اچھے طریقے سے اور خاص طور پر نیلسن کو بڑے تپاک سے ملی مگر دوران ملاقات وہ کچھ الجھی الجھی سی تھی۔ سوشیل کے اصرار پر اس نے بتایا کہ ان دنوں ان کی وارڈ میں بہت سی casualities آئی ہیں۔ اس نے بتایا کہ ان زخمیوں میں ایک یونیورسٹی کا پروفیسر نوازش۔۔"نیلسن ایک دم اچھلی۔"کیا ہوا نوازش کو؟؟"نیلسن کے چہرے پر دکھ، کرب اور اضطراب ایک ساتھ ابھر آئے۔ نائل اور سوشیل دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ نائل نے اسے چونکتے دیکھ کر پوچھا۔"آپ جانتی ہیں اسے؟

۔۔۔ بڑا خوبصورت اور خوش اخلاق نوجوان ہے۔"نائل نے معترف لہجے میں کہا۔

نیلسن نے بے بسی سے سوشیل کی طرف دیکھا۔"سوشی! میں دلی وارڈ جانا ہے۔!"وہ سوشیل سے بات ادھوری چھوڑ کر نائل سے مخاطب ہوئی۔"کونسی وارڈ میں۔۔۔؟؟"

"میں آپ کو لے جاؤں گی۔"نائل نے شائستگی اور ملائمت سے کہا۔ سوشیل نے گھڑی پر ٹائم دیکھا اور نائل سے پوچھا۔"آج تمہاری نائٹ ہے۔"

نائل نے اثبات میں سر ہلایا۔ نیلسن نے کہا۔ میں بھی چلتی ہوں۔ سوشی۔۔ میں؟"اس نے سوالیہ نظروں سے سوشیل کو دیکھا

سوشیل نے کہا۔"کل چلی جانا، دن میں کسی وقت!"

"نہیں! میں آج ہی جاؤں گی۔"اس نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔"

"تم نہیں چلو گے؟"نیلسن کے لہجے میں اب کچھ اطمینان تھا۔

"شاید۔۔۔"سوشیل کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر بات بدل کر بولا۔"میں پھر کسی وقت۔۔۔ ابھی تم ہو آؤ!"

سوشیل کے جانے کے بعد نائل اور نیلسن دونوں ہسپتال پہنچیں راستے میں نائل نے نوازش کی injury bullet اور اس سے متعلقہ تمام consequences کے بارے میں بتایا۔ نیلسن جب وارڈ میں پہنچی تو نوازش under tranquiliser ہونے کی وجہ سے گہری نیند میں تھا۔ نائل اسے چھوڑ کر ڈیوٹی پر سٹاف نرس relieve کرنے چلی گئی۔ اور نیلسن دیر تک

نوازش کو دیکھتی رہی۔۔اسے نوازش اسے اپنی آخری ملاقات یاد آگئی۔۔وہ تو اسے یہ بھی نہ کہہ پائی تھی کہ۔لگ جا گلے کہ پھر۔۔۔۔۔شاید پھر اس جنم میں ملاقات ہو نہ ہو۔وہ تو ڈوبتے دل کے ساتھ اسے اتنا ہی کہہ پائی تھی۔۔۔۔''میں جاؤں؟''اور نوازش نے کہا تھا۔''as you wish''.......اور لفظ''wish''اس کے ہونٹوں پر جم کے رہ گیا تھا۔وہ یہ بھی نہ کہہ پائی تھی کہ اس کی wish کیا ہے!۔۔۔اس کے بیڈ کے سرہانے کھڑی وہ ہمہ تن چشم بن کر اسے دیکھتی رہی۔اتنا قریب سے، اتنی بھرپور نظروں سے، پہلی دفعہ شاید۔۔اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔۔اس طرح، اتنا قریب سے۔۔اس کا جی چاہا اس کا ماتھا چوم لے۔۔۔کیوں؟ بس ایک لمس، یہی مقصد حیات ہے۔یہی عشق کا مقصود و موقوف ہے؟؟۔وہ اسی ادھیڑ بن میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔جیسا اس نے سوچا ویسا نہیں ہو سکا۔

مگر اس نے بے اختیاری میں اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا۔اور نوازش کے لمس کا احساس اس کے رگ وپے میں اتر گیا۔اچانک اس کی نظر کونے میں کھڑی نائل پر پڑی جو کسی مریض کی فائل ہاتھ میں لیے نیلسن کی طرف دیکھ رہی تھی۔نیلسن نے نوازش کی پیشانی سے اپنا ہاتھ اٹھالیا۔اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئے وارڈ سے نکل کر سٹاف نرس کے ڈیوٹی روم میں آکر بیٹھ گئی۔تھوڑی دیر بعد نائل بھی مریضوں کی فائلز دیکھ کر کر اور ان پر لکھی ہوئی ہدایت کے مطابق سارا کام کر کے ڈیوٹی روم میں آگئی۔نیلسن نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی مگر جواب میں نیلسن کا چہرہ حسب توقع افسردہ تھا۔اس نے کوئی بات نہیں کی۔

نائل نے کہا۔''کچھ سوچ رہی ہو!۔۔۔شاید یہ کہ اس وقت تم یہاں پر اس کی سٹاف نرس ہوتی، اس کی تیمارداری کر رہی ہوتی۔؟؟''

نیلسن نے افسردہ حیرانی سے چونکتے ہوئے نائل کی طرف دیکھا۔اس کی نظریں نائل سے پوچھ رہی تھیں۔'تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہی سوچ رہی تھی'۔

نائل نے پیار مسکراتے ہوئے پوچھا''ہے نا۔۔؟یہی سوچ رہی تھی نا۔''

نیلسن نے سر کو اثبات میں ہلکی سی جنبش دی۔

نائل نے ایک افسردہ سی آہ بھری اور کہا۔''کتنی عجیب بات ہے،ہم جو چاہتے ہیں۔۔۔نہیں ملتا''۔

نیلسن نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔''اور ہم جس منظر کا حصہ بننا چاہتے ہیں وہ ہم سے دور ہو کر ہمارے نظارے کا اہتمام کرتا ہے۔۔۔ہلکی سی جھلک دکھاتا ہے اور خود سے جدائی کا ملال دے کر ہماری

نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔"
پھر اچانک اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔" I want to donate my kidney ! "
نائل نے حیرانی سے اسے دیکھا۔"کیا؟"
"ہاں نائل"
" Are you sure you" نائل کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔
نیلسن نے کہا " What I said I mean that
نائل کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔تھوڑی دیر بعد واپس آ کر اس نے نیلسن کو بتایا کہ وہ کل صبح آ جائے اس کے بلڈ ٹیسٹ کے بعد ہی ڈاکٹر بارے میں بتا سکے گا۔جاتے ہوئے نیلسن نے نائل سے وعدہ لیا کہ وہ نوازش کو اُس (نیلسن) کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔

اگلے دن نیلسن، اس کے بتائے ہوئے وقت پر ہسپتال میں آ گئی اور چند ہی روز پہلے جو ناممکن نظر آ رہا تھا ممکن ہوتا گیا۔پاکستان میں ابھی گردے کی تبدیلی کی تھیوری ہی پہنچی تھی۔۔۔اس کے سب ٹیسٹ وغیرہ ہو گئے۔اور قسمت کی خوبی کہ پی ایم اے کی دعوت پر لیکچر دینے آئے ہوئے امریکی نژاد پہلے پاکستانی پروفیسر ان دنوں اسلام آباد سے لیکچر دے کر کراچی جاتے ہوئے پی ایم اے کی خصوصی دعوت پر ایک روز کے لئے لاہور رکے ہی تھے کہ یہ سانحہ پیش آ گیا۔فلائٹس کا جدول اتھل پتھل ہونے کی وجہ سے انہیں ایک سے زائد دن لاہور رکنا پڑ گیا۔معاً ڈاکٹروں کا دھیان، ڈاکٹر موصوف سے استفادہ کرنے کی طرف دوڑ گیا۔انہی ڈاکٹروں میں میو ہسپتال کے سرجن پروفیسر اقبال بھی تھے جنہوں نے نوازش کا کیس discuss کیا اور اتفاقات رونما ہوتے گئے، واقعے سے واقعہ جڑتا گیا۔۔۔نیلسن کا گردہ نوازش کے ساتھ میچ کر گیا۔

اس نے گھر آ کر بڑے عام انداز میں سوشیل کو نوازش کے بارے میں بتا دیا۔پہلے تو اسے سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔مگر جب نیلسن نے سیدھے اور صاف لفظوں میں اسے بتایا کہ وہ نوازش کو گردہ دان کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے تو وہ سدِ راہ بن گیا۔
"کیوں؟۔۔۔یہ کوئی معمولی فیصلہ ہے۔۔۔ٹھیک ہے۔۔۔نوازش تمہارا کون ہے؟ استاد ہے۔!!"
اس نے سوشیل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔"میں نے کب کہا کہ وہ میرا استاد ہے۔وہ میرا۔۔۔اور ہم۔۔بلکہ شاید صرف میں اس سے محبت کرتی ہوں۔"

''ایک شادی شدہ عورت ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔۔''
نیلسن نے آہستگی سے کہا'' ۔۔اور شادی شدہ مرد کو یہ حق ہے؟''
اس کے سوال میں چھپی چبھن اور طنز کو سوشیل نے واضح طور پر محسوس کیا۔اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔''بہر حال! میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔''
نیلسن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔سوشیل نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔''ہاں! تمہارا جسم میری ملکیت ہے۔''
''مگر روح تو نہیں!''
''گردے کا تعلق روح سے نہیں جسم سے ہے۔!'' سوشیل نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔نیلسن لاجواب ہوگئی۔مگر جب کوئی کام کرنے کی ٹھان لے تو دلائل بے معنی ہو جاتے ہیں۔۔محبت میں دلیلیں کہاں کام آتی ہیں! نیلسن پر تو اک بیخودی طاری تھی۔اسی بیخودی میں بولی۔''۔۔۔۔اور روح کی منشا پر جسم آزاد بھی تو ہو سکتا ہے۔''
سوشیل کو یوں لگا جیسے نیلسن نے اسے سر سے اتار کر دھڑام سے زمین پر گرا دیا ہو۔
ان کی ازدواجی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں آمنے سامنے ہوئے تھے۔پہلی بار ان کے لہجے ٹکرائے تھے۔پہلی بار دونوں میں میاں بیوی والا اختلاف پیدا ہوا تھا۔مگر سوشیل اسے گھر کی چار دیواری تک اور دونوں کے درمیان رکھنا چاہتا تھا۔اس نے اس نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کر کے اسے اپنے مؤقف پر قائل کرنے کی کوشش کی۔مگر بے سود۔اس نے نائل سے بھی اس بارے میں مدد چاہی مگر اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ تم دونوں کا ذاتی معاملہ ہے۔اس سلسلے وہ سوشیل کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ادھر نیلسن نے یہ کہہ کر یہ بحث ختم کر دی۔کہ'جو کہہ دیا سو کہہ دیا'۔
انہی دنوں نیلسن کی چھوٹی بہن اگاتھا کی شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔چنانچہ نیلسن کا زیادہ وقت میکے ہی میں گزرتا۔اور اس نے ہسپتال میں اپنے میکے کا ہی رابطہ نمبر دے رکھا تھا۔چنانچہ عجیب اتفاق تھا کہ ادھر بارات آرہی تھی، ادھر نیلسن کو ہسپتال سے بلاوا آگیا۔اس نے جاتے ہوئے کسی کو کچھ نہیں بتایا، بس ابھی آئی کہہ کر نکل گئی۔کیونکہ اس کا سسرال نزدیک ہی تھا گھر والوں نے سمجھا کہ شاید اپنے گھر میں کچھ لینے گئی ہے۔جاتے جاتے اس نے سوشیل کو بلا کر اس کے کان میں کہا۔''میں ہسپتال جا رہی ہوں۔مجھے روکنا نہیں، ورنہ ہمارے درمیان جو بھرم قائم ہے۔ ٹوٹ جائے گا۔

یہ کہہ کر نیلسن چلی گئی۔ ہسپتال جا کر اس نے آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ اسلام قبول کرنا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔ کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ نیلسن اس کی نظروں کا سوال سمجھ گئی اور بتایا کہ جسے اس کا گردہ ٹرانس پلانٹ ہوگا۔ وہ مسلمان ہے۔ اگر اسے کبھی پتہ چل گیا کہ اس کے اندر گردہ کسی غیر مسلم کا ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ بات اسے زندگی بھر کے لئے بے چین کر دے۔ ڈاکٹر نے کہا "بی بی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انسان کے جسم کا کوئی مذہب نہیں۔ اسی لئے اسلام نے لاشوں کی بے حرمتی سے منع کیا ہے۔ پھر بھی اگر آپ کی تسلی اس بات سے ہوتی ہے تو بسم اللہ! اسلام میں خوش آمدید۔" اور یوں اس نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام کے دامن عافیت میں قدم رکھ دیا۔

وہ بھرم جو دونوں کے درمیان تھا۔ ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ رشتے بدل گئے۔ اندازِ نظر بدل گئے۔ ہر کوئی نیلسن کو قصور وار گردانتا تھا۔ والدین نے اپنی قسمت کو کوسا کہ ایک بیٹی بیاہی تو ایک بیٹی واپس آ گئی۔ وہ نیلسن جس نے اپنے خاوند کی بیماری کو چار سال برداشت کیا تھا۔ اس کی ہر بات پر لبیک کہا تھا۔ اس کے سامنے کبھی اونچی سانس نہیں لی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اس کی ایک خواہش کا احترام نہ کر پایا بلکہ اس نے تو نیلسن کے صحت یاب ہو کر ہسپتال سے واپس آنے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔

نیلسن کو نارمل ہونے میں ایک ماہ لگ گیا۔ جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی اور اپنے والدین کے گھر پہنچی تو وہیں دھر لی گئی۔ ابھی تک تو گھر والوں نے اسے سرسری طور پر قصور وار ٹھہرایا تھا۔ مگر اس کے والد نے صاف صاف کہہ دیا بیٹی اس معاملے میں ہم سب سوشیل کے ساتھ ہیں۔ یہ راز اس پر چند روز بعد کھلا کہ اس کی تیسری بہن، کرسٹی کی شادی سوشیل سے کر دینے کا ارادہ باندھا ہے۔ تو وہ سمجھ گئی کہ اس گھر میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ اس نے زندہ رہنے کے لئے اگلا قدم اٹھانے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ نائل کی اس کے ساتھ راہ و رسم اب دوستی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس نے تمام ماجرہ اسے کہہ سنایا اور نائل کی پیشکش پر وہ عارضی طور پر نائل کے ہاسٹل میں رہنے لگی۔ یوں وہ لحہ لحہ نوازش کے روبصحت ہونے کے بارے میں بھی باخبر رہی۔ وہ ہر روز نائل سے نوازش کے بارے میں پوچھتی۔ نائل بھی محبت کر چکی تھی۔ اور اس نے بھی محبت کو لوبھ نہیں بنایا تھا۔ کہ نیلسن کی طرح وہ بھی محبت سے جینے کی توانائی کشید کرتی تھی۔ اور یوں بھی۔۔۔ غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست۔۔۔۔ والا معاملہ تھا۔ اس لئے

دونوں کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ مگر نیلسن نہایت کم بات کرتی۔ نائل کی طبیعت میں بھی سنجیدگی کا عنصر تھا مگر اس کا انداز شگفتہ تھا۔ کبھی کبھار مذاق بھی کر لیتی۔ کبھی کبھار سوشیل کا ذکر بھی آجاتا۔ عجیب اتفاق تھا۔ کہ ایک کو اس کے ساتھ شادی کا ملال تھا تو دوسری کو اس کے ساتھ شادی نہ ہونے کا ملال۔ مگر دونوں کی قربت کی بنیاد ایک ہی شخص تھا۔

جب تک نوازش تندرست نہ ہوا نیلسن پر ایک تشنج کی کیفیت رہی۔ وہ سارا دن گھر پر ہی رہتی۔ نماز روزہ اور دیگر ارکانِ دین کے بارے میں پڑھتی تھی۔ فارغ وقت وہ قرآن پاک پڑھنے کے لئے ہاسٹل کے چوکیدار کی بیوی کے پاس چلی جاتی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ قرآن کی تلاوت کرنے اور اسے سمجھنے کے قابل ہو جائے۔ نائل اس کی ہم مذہب رہی تھی مگر اس نے اپنا مذہب ترک کرنے کے باوجود اس سے تعلق ترک نہیں کیا تھا۔ ایک دن اس نے پوچھا تو نائل نے کہا۔

''ہر مذہب انسان کو انسان سے تعلق جوڑنے کے لئے آیا ہے۔۔۔ اسے ترکِ تعلق کا جواز بنانے والے لامذہب ہیں۔ انسان ہم مذہب ہو نہ ہو۔ کوئی مشکل نہیں، گزارا ہو سکتا ہے مگر لامذہب نہ ہو کیونکہ اس کے ساتھ گزارا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔۔'' یہ کہہ کر اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔۔۔ محبت انسان کو کتنا عالی کر دیتی ہے کہ اس کا اندازِ نظر ہی بدل جاتا ہے۔

ایک دن نائل نے اسے بتایا کہ نوازش صحت یاب ہو کر ہسپتال سے فارغ ہو گیا ہے۔

بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ الحمدُ للہ! اس روز کے بعد نیلسن نے اپنے آئندہ کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔ نائل نے اسے مشورہ دیا کہ وہ لیکچررشپ کے لئے کوشش کرے۔ مشورہ صائب تھا۔ ایم اے انگلش کا بہترین مصرف۔۔۔۔! اس نے سوچا اور ہامی بھر لی اور تجربہ حاصل کرنے کے لئے ایک پرائیویٹ سکول میں انٹرویو کے لئے گئی۔ نائل بھی اس کے ہمراہ تھی۔ یہ سکول کسی سینٹ کے نام پر تھا۔ مگر اس کا مالک مسلمان تھا۔ انٹرویو میں پرنسپل نے بتایا کہ سکول کی انتظامیہ مسلم ٹیچرز کو ترجیح نہیں دیتی ہے۔ اس پر نائل نے مسکرا کر نیلسن کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں ہلکا سا طنز بھی چھپا ہوا تھا۔ جسے نیلسن نے بھی محسوس کر لیا۔ مگر اگلے ہی لمحے نائل نے نیلسن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ یہ سب سن کر پرنسپل نے معذرت خواہانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ وہ سکول کی انتظامیہ کے ساتھ اس سلسلے میں مشورہ کرنے کے بعد ہی حتمی فیصلہ کرے گی۔۔۔۔ چند دن بعد نیلسن کو سکول سے تقرری کا مراسلہ مل گیا اور اس نے یہاں پڑھانا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کا شمار اسکول کی بہترین ٹیچروں میں ہونے لگا۔ اس کارکردگی اور اس کے مذہبی پس منظر

کے بدولت سکول انتظامیہ اس پر خاص مہربان تھی۔ چنانچہ اسے سکول کی بورڈنگ میں رہائش مہیا کر دی۔ نائل کے ہاں سے شفٹ کرنے کے بعد اس کی ملاقاتوں میں تعطل آتا گیا اور نیلسن ایک نئی زندگی کے معمولات میں رچ گئی۔ البتہ کبھی کبھار وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے کا وقت اور جواز نکال ہی لیتیں۔

آج ان کی ملاقات کوئی تین ماہ کے بعد ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں نائل نے اسے دو ماہ پہلے نوازش سے ہونے والی مڈبھیڑ اور اس کے تجسس کے بارے میں بتایا۔ نیلسن اسے یاد دہانی کروائی۔ اور جواباً اس نے بھی اسے یقین دھانی کروائی۔ اس کے بعد کئی ماہ گزر گئے مگر نائل نے نوازش کے بارے میں کوئی بات نہ کی جبکہ نیلسن کا جی چاہتا کہ نائل اس کے بارے میں کوئی بات کرے مگر نائل ہر ملاقات میں ادھر ادھر کی ہانک کر چلی جاتی۔ آخر ایک دن نیلسن نے نوازش کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ نائل نے اسے بتایا کہ اس روز کے بعد ملاقات نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی اس کا کوئی اتا پتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ مشورہ بھی دیا کہ اب وہ ان باتوں کو چھوڑ کر یکسوئی سے اپنے تدریسی فرائض ادا کرے۔ چنانچہ نیلسن کچھ دیر تک چپ رہی۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں اس وسوسے نے سر اٹھایا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔۔ کہیں میں اس انتظار میں تو نہیں کہ اسے شادی کے لئے تمام رکاوٹیں اٹھ چکی ہیں۔۔۔ میں آزاد ہو چکی ہوں۔۔۔ نوازش نے بھی شادی نہیں کی۔۔۔۔ ایسا ہے؟؟۔۔۔ اگر ایسا ہے تو ٹھیک نہیں۔

چنانچہ اس روز کے بعد اس نے اپنے آپ سے فیصلہ کر لیا اور اس نے وہ راستے بھی چھوڑ دیئے جن پر کہ اس کے یادوں کے دیپ جلتے تھے۔ اس نے لاہور چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔

جب اس نے سکول چھوڑنے کا نوٹس دیا تو انتظامیہ کے لئے اس کا یہ فیصلہ حیران کن تھا کیونکہ اسے اپنی اس ملازمت سے یا اس کے ایمپلائر کو اس سے کوئی شکایت نہ تھی بلکہ وہ تو پچھلے سات ماہ ہی میں طلبہ و طالبات میں ہر دلعزیز ہو چکی تھی۔ اس لئے اس کے استعفیٰ کو انتظامیہ نے بڑی سنجیدگی سے لے لیا۔ ایسے موقعوں پر اکثر انتظامیہ کا دھیان تنخواہ و مشاہرے کی طرف جاتا ہے مگر نیلسن نے اس پہلو کو سرے سے خارج از امکان قرار دے دیا۔ اس لئے جب انتظامیہ نے اسے تنخواہ میں اضافے کی پیش کش کی تو اس نے پیشکش ٹھکرا دی۔ نائل نے بھی اس اچانک فیصلے کی وجہ دریافت کی مگر نیلسن نے۔ ''یونہی!'' کہہ کر بات ٹال دی۔ اسی طرح انتظامیہ کو بھی اس نے مختلف بہانوں سے بہلانے کی کوشش کی مگر وہ اسے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جب مالک کو پتہ

چلا کہ نیلسن کسی طور رکنے کو تیار نہیں تو اس نے اس تجسس کو دور کرنے کے لئے خود اس سے بات کرنے کی ٹھانی چنانچہ اس نے نیلسن کو آفس میں بلایا۔ مالک اور ملازم کے درمیان یہ پہلی ملاقات تھی۔ کوئی پچاس، پچپن سال کا چودھری صغیر احمد۔ اس کے لہجے اور چہرے سے متانت اور سنجیدگی جھلکتی تھی۔ اس کی جاذب شخصیت اور مہربان اندازِ گفتگو نے نیلسن کو اسے سب کچھ صاف صاف بتا دینے پر آمادہ کیا۔۔۔ ہر پہلو پر غور کیا۔ حسن اتفاق سے مری فرنچائز کا مالک ، نصر من اللہ جو چودھری صغیر کا دیرینہ دوست بھی تھا۔ اس نے نصر سے ساری صورت حال کے حوالے سے بات کی ۔اس نے فوراً ہامی بھر لی۔ چنانچہ چودھری صغیر نے نیلسن کو اس پیشکش سے مطلع کیا۔

نیلسن کے لئے یہ پیشکش نہ صرف یہ کہ قابل قبول تھی بلکہ ایک طرح سے نعمت تھی۔۔۔۔ یہ اس نے اب سوچا تھا کہ نوکری چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں جا کر نوکری تلاش کرنے اور نوکری لے کر کسی دوسرے شہر میں جانے کا کیا فرق تھا۔ کیونکہ اسے بھی تو اس سکول کو چھوڑ کر لاہور چھوڑنا ہی تھا کہ لاہور اس کی یادوں کا قبلہ نما تھا۔

کوئی ایک مہینے کے بعد نیلسن کی مری میں ٹرانسفر کے تمام انتظامات ہو گئے، اور وہ نائل کے ہمراہ اپنی نئی منزل کی طرف روانہ ہوئی۔ خوش قسمتی سے مسٹر نصر اپنی اہلیہ سمیعہ کے ہمراہ سکول کے بعض معاملات کے سلسلے میں راولپنڈی ڈائریکٹوریٹ آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق نیلسن اور نائل کو لیاقت باغ، بس سٹینڈ سے لے لیا۔

نصر اور سمیعہ۔۔۔ دونوں میاں بیوی کی عمر کوئی علی الترتیب تیس اور پچیس کے ارد گرد لگتی تھی۔ نصر۔۔ گورا رنگ گھنی مونچھیں، قد مثالی بھرا ہوا جسم۔۔۔ سمیعہ۔۔۔ صاف رنگ درمیانے قد اور اکہرا جسم۔۔۔۔ اسے دونوں کی جوڑی بڑی باوقار لگی۔ شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے مگر اولاد کی آزمائش سے محروم تھے۔ سکول کے بیرونی معاملات نصر دیکھتا تھا جبکہ اندرونی معاملات کی نگرانی سمیعہ کرتی تھی۔ مگر آج کیونکہ نیلسن کو پک کرنا تھا۔ اس لئے۔ اس لئے نصر نے سمیعہ کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ خوش آمدیدی اور استقبالی کلمات اور تعارفوں کے تبادلے کے بعد وہ مری کے لئے روانہ ہوئے۔

''یہ دائیں طرف سرکنڈوں اور درختوں کے پار راول جھیل ہے۔'' نصر نے ڈھوکڑی موڑ کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ جواباً دونوں نے سر اٹھا کر راول جھیل دیکھنے کی کوشش کی۔

''یہاں سے نہیں نیول پور سے دیکھئے گا۔'' سمیعہ نے کہا ''ویسے ہمارے گھر سے اس جھیل

کا منظر بڑا خوبصورت اور سہانا دکھتا ہے۔"
"اچھا وہاں سے! مری سے؟" نائل نے حیرانی سے پوچھا۔
"بلندی ہے نا۔" سمیعہ نے وضاحت کی۔
وین چلتے چلتے ایک بازار میں سے گزری تو سمیعہ نے دونوں کو مخاطب کیا۔ "یہ بھارہ کہو ہے بائیں طرف اس کی آبادی کے عقب میں قائداعظم یونیورسٹی ہے۔" کوئی دو کلومیٹر آگے جا کر نصر نے وین کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے بتایا "یہ چھتر ہے یہاں سے مری ہلز کا سلسلہ کا آغاز ہوتا ہے۔" پھر اس نے ہاتھ سے بائیں طرف زیتون کے تجرباتی فارم کی طرف اشارہ کر کے کہا "ان دنوں یہاں زیتون کی کاشت کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔"
"نیلسن نے بے اختیار کہا "زیتون! سبحان اللہ' والتین و زیتون ......" نصر اور سمیعہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مگر انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کی نیلسن نو مسلم ہے اور ابھی کئی چیزوں کے بارے میں اس کا رویہ غیر معمولی ہے۔ چنانچہ نصر نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہاں ہاں یہ وہی زیتون ہے۔" وہ بڑی عقیدت سے باہر زیتون کے پودوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔
ذرا آگے "بائیس میل" کا بورڈ دیکھ کر نیلسن نے سمیعہ کی طرف دیکھا۔ سمیعہ نے کہا۔ "یہ سنگِ میل نہیں ایک گاؤں کا نام ہے"
برساتی نالے کے پل سے گزرتے ہوئے نیچے ایک چھوٹی سی آبادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نصر نے کہا۔ "وہ ہے گاؤں، بائیس میل۔"
سمیعہ نے کہا "ابھی آگے سترہ میل بھی آئے گا۔ "سترہ میل؟" یہ بھی ایک دیہہ کا نام ہے۔"
اب چڑھائی شروع ہو گئی تھی اس لئے وین کی رفتار آہستہ تھی۔ بل کھاتی چڑھتی ہوئی سڑک اور بائیں جانب سیکڑوں فٹ کی گہرائیوں اور کھائیوں کے پار سرمہ آسا سبزے سے ڈھپنے ہوئے پراسرار پہاڑوں کو دیکھ کر نیلسن پیلی پڑ رہی تھی کیونکہ وہ زندگی میں پہلی بار لاہور سے نکلی تھی اور پہاڑ کا نظارہ اس نے صرف فلموں ہی میں کیا تھا۔ ادھر نائل کبھی کبھار مسکرا کر اس کی طرف دیکھ لیتی۔ اگلے بل سٹاپ تک وین میں خاموشی رہی۔ پھر وین ایک خطرناک موڑ پر چڑھ کر آبادی میں داخل ہوئی۔ "یہ تریٹ ہے۔ تریٹ سیداں!" نصر کافی دیر بعد بولا۔
تینوں خواتین نے باہر دیکھا سڑک کے نیچے چند مکانوں پر پنجتن پاک کے سیاہ علم لہرا رہے تھے۔ سڑک کے کنارے، دائیں طرف قبرستان کے پاس سے گزرتے ہوئے نیلسن نے ہلکی سی

آواز میں کہا۔ ''۔۔۔۔۔السلام علیکم یا اہل القبور۔۔۔۔'' کیونکہ سمیعہ اس کی دائیں طرف بیٹھی ہوئی تھی چنانچہ اس نے یہ کلمات سن کر نیلسن کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔ اور نیلسن نے بھی معصوم مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور ذرا شرما سی گئی۔

جس وقت وہ ''چھرہ پانی'' سے گزر کر کمپنی باغ کی طرف جارہے تھے تو مختلف جگہوں پر کاریں اور بسیں کھڑی تھیں اور لوگ ڈبوں اور ادھ کٹے کنستروں سے گاڑیاں ڈھو رہے تھے۔ نصر نے کہا ''ساری وادی میں سب سے زیادہ پانی انہی دو مقامات پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاڑیاں دوران سفر سروس کے لیے یہیں رکتی ہیں کمپنی باغ میں پاکستان کا مشہور سینی ٹوریم بھی ہے۔ کمپنی باغ کی ایک وجہ شہرت یہ بھی ہے۔''

چند میل کے بعد سڑک پر گھوڑا گلی کا بورڈ نظر آیا ''اور یہ گھوڑا گلی ہے۔'' نصر نے کہا
سمیعہ نے ذرا خوش دلی سے کہا ''مگر یہاں گھوڑے نہیں ہوتے انسان رہتے ہیں۔'' نیلسن مسکرادی
نصر نے کھائی کے پار ایک پہاڑی پر ٹین کی چھت کے مکان کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا ''وہ سرو کے دو لمبے لمبے درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گھر...... نظر آیا؟''
اس نے جیپ کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے پوچھا۔
نیلسن کی نظروں نے نصر کی انگلی کا تعاقب کرتے ہوئے مری روڈ سے بائیں طرف پار دیکھتے ہوئے کہا ''جی ہاں!۔۔۔ کیا ہے وہاں!''
''ہمارے علاقے کے مشہور بزرگ اور روحانی شخصیت شاہ صاحب کا گھر ہے۔''
''بزرگ! روحانی شخصیت ؟؟'' نائل اور نیلسن نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اچانک نصر کو پھر یاد آیا کہ نیلسن تو نو مسلم ہے، شاید ابھی پاکستانی '(ہندوستانی) اسلام کی اصطلاحات سے آگاہ نہیں۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ '' spritual guide
''you mean ۔۔ تعویذ!'' نیلسن نے پوچھا۔
اس نے اپنی ممی کو بعض اوقات کسی ''پڑھائی کرنے'' والے سے چھوٹی چھوٹی پرزیاں لاتے اور پانی میں گھول کر پیتے دیکھا ہوا تھا۔ اور جب نیلسن نے اپنا مذہب ترک کیا تب ممی نے چند روز اسے یہ پرزیاں سی پانی میں گھول کر پلانے سے پہلے کہا تھا۔ ۔'لو بیٹی پی لو سکون آجائے گا۔ ۔ مگر اسے سکون کہاں ملا تھا۔
نصر نے گاڑی کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا ''شاہ جی کہتے ہیں کہ تعویذ پانی تو میں لوگوں کی تسلی کے

لئے دیتا ہوں۔ حالانکہ اصل چیز تو دعا ہے۔ وہ کہتے ہیں میں تو صرف دعا کرتا ہوں۔ قبول/ نا قبول اس کی مرضی ہے میں تو ادعونی استجبلکم پر ایمان رکھتا ہوں۔

''شاہ جی خود کو پیر نہیں کہلواتے! یہ ان کی بڑی realistic اپروچ ہے۔' نصر نے کہا

نیلسن نے سوالیہ نظروں سے دیکھا ''مطلب!!؟''

نصر نے کہا۔'' پیر کا مطلب ہوتا ہے بوڑھا۔ ان کا استدلال بڑا دلچسپ اور حقائق پر مبنی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں ابھی صرف چھیالیس کا ہوں'۔۔ وہ اپنے آپ کو فقیر بھی نہیں کہلاتے۔ فرماتے ہیں۔۔ 'فقیر اس لئے نہیں ہوں کہ میں ابھی تک اس منزل تک نہیں پہنچا۔ میری اولاد ہے' ان کی بنیادی ضروریات ہیں ہم بیوی میاں کے کچھ خواب ہیں جن کی تکمیل کے لئے میں اور میری بیوی دن رات سرگرداں ہیں۔ آج کے بجائے کل کی فکر میں معاشی جدوجہد کر رہے ہیں جبکہ فقیر ان جھمیلوں سے آزاد ہوتا......'' بے اختیار نیلسن کے منہ سے ''گڈ!'' نکلا۔

اسی دوران ان کی وین بانسرہ گلی پہنچ کر رک گئی۔ نیلسن نے وین سے اتر کر ارد گرد کے منظر پر نظر گھمائی۔ اچانک اس کا دل نوازش کے لئے دھڑکا۔ وہ چند سال پیچھے چلی گئی یہاں تک آتے کاش وہ سفر آج بھی جاری ہوتا' اس لمحے اس نے شدت سے کسی وجود کی کمی محسوس کی۔ اور اس پر اداسیوں کے سائے لہرا گئے۔ زندگی ایسی ستم ظریف' کٹھور اور تقدیر اتنی سنگدل کیوں ہے'؟ وہ دل ہی دل میں یہ سوچتے ہوئے تڑپ کر رہ گئی۔

تیسرے دن نیلسن اور سمیعہ نے نائل کو اسلام آباد جی ٹی ایس کے اڈے پر الوداع کہا۔ اسے رخصت کرتے ہوئے نیلسن نے نائل کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔۔ ''جس طرح یہ فضا تازہ ہوا سے خالی نہیں اسی طرح یہ دنیا نیک اور ہمدرد لوگوں سے خالی نہیں رہ سکتی۔ نیلسن کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ نائل کے جانے کے بعد واپس جاتے ہوئے سمیعہ نے کہا۔ ''واہ! نیلسن آپ تو بڑا اچھا جملہ کہہ لیتی ہیں۔ آپ کو تو افسانہ نگار ہونا چاہئے تھا۔'' نیلسن نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔'' افسانہ خود کبھی افسانہ نگار ہو تا نہیں ہو سکتا ہے۔ اسے اپنے اظہار کے لئے کوئی افسانہ نگار ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اور میرا افسانہ نگار شاید۔۔۔'' اس نے زیر لب کہا۔ ''کھو چکا ہے۔''

☆ ☆ ☆

مقدر میں تخلیق کا کرب تھا
جہاں بھی گئے داستاں لے کے آئے

جہاز اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ فضا سے زمین کی طرف اتر رہا تھا کہ اعلان ہوا" خواتین وحضرات کچھ ہی دیر بعد ہم ابوظہی انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔ اپنے حفاظتی بند باندھ لیجئے اور اپنی کرسی کی نشست سیدھی کرلیں۔ اپنے سگریٹ بجادیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کا سفر پی آئی اے کے ساتھ۔۔۔" نوازش دوران سفر سویا رہا تھا اناؤنسمنٹ پر بیدار ہوا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

نیچے رات کی تاریکی میں مدھم روشنیاں آہستہ آہستہ واضح ہو کر اپنے اپنے مقام کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف کناروں پر نصب لائٹیں بلندی سے یوں محسوس ہو رہی تھیں جیسے کسی نے زمیں پر کہکشائیں بکھیر دی ہوں۔ وہ پورے انہماک کے ساتھ اترتے ہوئے جہاز کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ جہاز نے رن وے پر اتر کر دوڑنا شروع کردیا۔ جہاز میں مسافروں کے حفاظتی بند کھولنے کی چھن چھن سن کر اس نے بھی حفاظتی بند کھولے اور اپنی کتابیں اور عینک برابر والی خالی سیٹ سے اٹھا کر اپنے چرمی ہینڈ بیگ میں رکھیں۔ اور جب جہاز رکا تو وہ دیگر مسافروں کیساتھ اتر کر امیگریشن سے ہوتا ہوا ائیر پورٹ سے باہر نکل آیا۔

سامنے شاہدہ کھڑی تھی۔ وہی صاف رنگت، سرخی مائل، کالی کالی آنکھیں اور ان پر پتلی پتلی پلکیں اور پلکوں پر گھنے ابرو۔ لمبا قد جسم بھرا ہوا۔ پانچ سال پہلے ڈیپارٹمنٹ میں آخری بار ملنے والی شاہدہ اب بھی اسی طرح تھی۔ اس کی فزیک اور چہرے میں کسی خاص تبدیلی نہ آئی تھی سوائے لباس کے۔ اس وقت اس نے پینٹ اور شرٹ، پہنی ہوئی تھی تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی جبکہ نوازش سراپائے تحیر بنا کھڑا تھا اس کی آنکھوں میں سوال اور لب پر خاموشی تھی

میں آنکھ بن کے یوں ہی تجھے دیکھتا رہوں
تو سامنے کھڑی رہے تصویر کی طرح

'کیا یہ حسن اتفاق ہے!!!' اس نے اپنے اندر سرگوشی کی۔ مگر اسی اثنا میں شاہدہ کی شوخی بھری آواز نے اس کا لمحاتی سحر توڑ دیا۔ "۔۔۔۔کیوں مل گئے نا! میں نے کہا تھا نا کہ ہم پھر ملیں گے۔ یاد ہے نا۔" اس کے لہجے یا چہرے پر ذرہ برابر بھی حیرت نہیں تھی یوں لگ رہا تھا جیسے نوازش کا اس سے ملنا اس کی توقع اور تیقن کے عین مطابق تھا۔ وہ ابھی تک چپ تھا۔ شاہدہ ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے بابا کچھ بولو بھی۔"

"تم کیسے؟۔۔۔۔ کیسے آئی یہاں؟" نوازش کے منہ سے صرف یہی الفاظ نکل سکے۔

"چلو چلیں، یہ ساری باتیں کرنے کے لئے بہت وقت ہے۔ فی الحال وقت کم ہے مجھے واپس بھی جانا ہے۔" اس نے باہر کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

"مگر وہ۔۔۔ مجھے تو وہ بنک کا پی آر۔۔" نوازش حقیقی معنوں میں ابھی تک چکرایا ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہے۔ شاہدہ نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی اور بازو باہر کی طرف پھیلا کر کہا۔ "تشریف لے چلئے" پھر اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر روایتی طریقے سے سر جھکا کر بولی۔ "پی آر او حاضر ہے۔"

"ہیں!!۔۔ تم بی سی سی آئی۔۔؟" اب صورت حال کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔۔۔

گاڑی میں بیٹھ کر نوازش نے پوچھا۔ "کیا تمہیں مجھے یہاں پا کر حیرانی نہیں ہوئی؟" شاہدہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس سے بھی زیادہ حیرانی مجھے اس وقت ہوتی جب تم یہاں نہ آتے۔"

"کیا مطلب؟۔۔۔۔ بابا اب تو اس تجسس کا پردہ چاک کر دو، یہ کیا معاملہ ہے۔ تم کب سے ہو یہاں، کیا کر رہی ہو۔۔۔۔۔" اس کے چہرے پر ابھی تک سوالات کی گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ چنانچہ شاہدہ نے مختصراً گزشتہ چار سالوں کی آپ بیتی کہہ سنائی:

ایم اے کرنے کے بعد دو سال تک شاہدہ نے سٹینڈرڈ چارٹرڈ بنک میں گریڈ تھری آفیسر کے طور پر جاب کی۔ اس کے والد ان دنوں کراچی پورٹ ٹرسٹ میں تعینات تھے۔ اور انہیں تین سال میں، جلد یا بدیر کسی دوسرے شہر میں ٹرانسفر ہونا تھا جبکہ مذکورہ بنک کی پاکستان میں ایک ہی برانچ تھی اس لئے اس نے یہ بنک چھوڑ کر بی سی سی آئی جائن کر لیا دو سال بعد وہ اسلام آباد واپس پوسٹ ہوئے تو

اس کی بھی بی سی سی آئی، اسلام آباد میں ٹرانسفر ہوگئی۔ پھر وقت پلٹا اور اس کے والد حکومتِ وقت کے عتاب میں آ گئے۔ چنانچہ معطل ہوئے، غبن کیس میں اندر ہوئے۔ مگر اس سے پہلے کہ ان کی فیملی ایگزٹ کنٹرول لسٹ پر آتی۔ پرانے تعلقات کو کام میں لا کر انہوں نے بیٹی کو ابوظہبی بھیج دیا مگر ان کی بیگم نے خاوند کا ساتھ چھوڑ کر باہر جانے سے انکار کر دیا۔ ابوظہبی میں شروع دنوں میں اس کا قیام اپنے والد کے ایک دوست کے ہاں تھا جو پاکستانی ایمبیسی میں فرسٹ سیکریٹری تھا۔ مگر حکومت بدلنے کی اکھاڑ پچھاڑ میں جب اسے واپس بلا لیا گیا تو شاہدہ انہی کے ایک دوست۔ ڈیفنس اتاشی، گروپ کیپٹن ۔۔۔ کے ہاں منتقل ہوگئی۔ کپتان صاحب کی بیٹی شاہدہ کی ہم عمر تھی۔ مگر بیٹی کی جوانی بھی کپتان صاحب کی آنکھ کی میل نہ دھو پائی تھی چنانچہ شاہدہ نے ان کو خیر باد کہا۔ اور چند ایک پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہنے لگی۔ ہر چند وہ ایک اونچے گھرانے کی بے باک اور الٹرا ماڈرن لڑکی تھی مگر ایسی ماڈرن جسے آزادی اور مادر پدر آزادی کا فرق پتہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دوسری قومیت کی لڑکیوں کے برعکس پاکستانی لڑکیاں، عرب لڑکوں کو ''بوائے فرینڈ'' نہیں کرتیں بلکہ سیدھی سیدھی شادی کرتی ہیں۔ وہ بھی اکثر والدین کی مرضی سے یا اجازت سے۔ مگر ۔۔ ہر کہ در کان نمک نمک شد والی بات تھی۔ ہر شام ہر کمرے میں کوئی کندورہ پوش گھسا رہتا۔ یوں بھی اس کی فلیٹ میٹ اس کے گھر، خاندان اور اس کی یہاں آمد کے بارے میں ایسے ایسے سوال پوچھتیں جن کا وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی اس پر مختلف قسم کی افواہیں پیدا ہونا شروع ہوگئیں ۔ بلکہ اس کی ساتھی لڑکیوں نے یہ کہہ کر اس سے تعلق قطع کر لیا کہ وہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سے تعلقات نہیں رکھنا چاہتیں چنانچہ گذشتہ ایک سال سے وہ ایک پارسی ایرانی فیملی کی paying guest تھی۔ چند ایک انڈین اور اینگلو انڈین پاکستانی کرسچن لڑکیوں کے علاوہ اس کی کسی سے قریبی تعلقات نہ تھے۔ گزشتہ ڈیڑھ سال سے شاہدہ یہیں اسی بنک میں تھی۔ ہر پاکستان سے آنے والے لوگوں کے آنے اور جانے ویزے لگوانے اور کینسل کروانے اور ان کے لیبر کے معاملات کی نگرانی کرنے والے ایرانی مندوب کی وہ نائب تھی۔ چنانچہ جب نوازش کے تعیناتی کے کاغذات یہاں کے ہیومن ریسورس ڈیپارٹمنٹ میں پہنچے تو ویزے کے لئے اسی کے پاس بھیجے گئے تھے کیونکہ مندوب چھٹی پر تھا۔ چنانچہ اسے تب سے نوازش کی آمد کی خبر تھی بلکہ نوازش نہیں جانتا تھا کہ اسے کب ابوظہبی جانا ہے مگر وہ اس کی آمد کے بارے میں اس سے پہلے باخبر تھی۔

شاہدہ نے ایک ماہ کے اندر اسے مشہور مقامات کی سیر کروائی۔ اور دیگر خاص باتیں جو

کسی نئی جگہ رہنے کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہیں بتادیں۔ابوظہبی فلک بوس عمارتوں اور امارتوں، کشادہ شاہراہوں اور روشنیوں کا شہر ہے جو چاروں طرف سے سمندر کے نیلے پانیوں میں گھرا ہوا ہے۔ ابوظہبی شہر کو ابوظہبی ریاست سے ملانے کا ذریعہ ایک باریک سی نہر پر بنا ہوا ایک پل ۔۔جسر المقطع ۔۔۔ ہے۔اس جزیرہ نما شہر کے ساحلوں پر کارنش نامی میلوں لمبا تفریحی پارک ہے اور ایک دورویہ کشادہ سڑک اس پارک کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی واٹر بریکر سے شروع ہو کر شہر کے باہر ابوظہبی ، دبئی موٹروے سے جا ملتی ہے۔امن وامان اور قانون کی حکمرانی میں یہ خطہ دنیا بھر میں اپنی نظیر آپ ہے۔

یہاں کی پاکستانی کمیونٹی میں تین طرح کے لوگ تھے۔ایک تو وہ جو بہت ابتدا میں یعنی ساٹھ ستر کی دہائی میں ملک میں بے کاری اور بے روزگاری سے تنگ آ کر لانچوں کے ذریعے یہاں پہنچے ان میں اکثریت ان پڑھ اور غریب لوگوں کی تھی۔ یہ لوگ یہاں کے سرکاری محکموں ۔۔۔ بلدیہ، دفاع اور پی ڈبلیو ڈی ۔۔۔ میں یا یہاں کے شیوخ کے ذاتی ملازم ہو گئے۔ بعضوں نے چھوٹا موٹا اپنا کام کرلیا۔۔ بہر حال یہ لوگ مالی طور پر کافی مستحکم اور آسودہ تھے۔دوسرے پاکستانی وہ تھے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور باقاعدہ کسی منصوبہ بندی سے، معتبر ذرائع سے یہاں آئے تھے۔ بھاری مشاہرہ پاتے اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ان میں آئل کمپنیوں اور قومی مالیاتی اداروں وغیرہ کے ملازمین شامل تھے۔تیسرا طبقہ ۔۔۔ متوسط طبقہ ۔۔۔ جسے نیچے والے پہچانتے نہیں اوپر والے مانتے نہیں ۔۔۔ ان کا یہاں بھی یہی حال تھا۔سفید پوشی کا بھرم لئے ،رشتوں کی اذیت اور رشتہ داروں سے محفوظ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی غرض سے یہاں فروکش تھے۔ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو پڑھے لکھے تو تھے مگر مالی اعتبار سے وہ دیگر دونوں طبقوں سے پیچھے تھے۔کیونکہ یہ late comer تھے۔یہ یہاں اس وقت آئے تھے جب میلے کی رونقیں ماند پڑ گئی تھیں۔ ڈویلپمنٹ کا زیادہ کام انجام پا چکا تھا۔اجرتوں کا تعین ہو چکا تھا۔اور بقول کسے اب 'انہیں' سمجھ آچکی ہے کہ کس کو کیا دینا ہے۔نوازش کا تعلق تیسرے قبیل سے تھا۔اس قبیل کے لوگوں کو آجر کی طرف سے رہائش نہیں فراہم کی جاتی تھی چنانچہ وہ ایک ہی فلیٹ میں ایک ایک کمرے میں کرائے پر رہنے پر مجبور تھے۔یوں بیچلر فلیٹس پر ڈیرے اور فیملی فلیٹس پر کٹڑی ہونے کا گمان غالب آتا تھا۔اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ پاکستانیوں میں فی زمانہ جو قباحتیں ہیں تو کچھ امتیازی حسنات بھی ہیں مثلاً دیگر اقوام کے تارکین ایک کمرے میں دس دس اور بارہ بارہ نفوس پر

مشتمل تھے مگر پاکستانیوں کا رہنے کا انداز حتی الوسع باعزت تھا۔ اسی طرح اس ملک میں تعمیر و ترقی کے ہر کام میں پاکستانیوں کا بھرپور حصہ رہا انہوں نے مزدوری سے لے کر فورمینی اور راج سے لے کر انجینئر تک ہر پوسٹ پر کام کیا۔ بیروزگاری بھگت لی۔ کھرپا پکڑ لیا مالی بن گئے۔ مزرعوں میں کام کر لیا مگر کسی پاکستانی نے ہاتھ میں جھاڑو نہیں پکڑا۔۔

جس فلیٹ میں اسے کمرہ ملا۔ وہ چھے کمروں پر مشتمل تھا۔ جس کے دو کمروں میں فلپینی اور کیرالائٹ (انڈین) اپنے اپنے بوائز فرینڈز کے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک کمرے میں کسی پاکستانی تعلیمی ادارے کا اکاؤنٹنٹ، سلیم اور ایک نجار رہتے تھے۔ ایک کمرے میں ایک پٹھان، جو ہنڈی کا کام کرتا تھا، اپنی ایک سیلونی گرل فرینڈ کے ساتھ رہتا تھا۔ دونوں کیرالائٹ جو کسی بار میں کام کرتی تھیں، دن فلیٹ پر ہی رہتی تھیں۔ رات کو دس بجے کے بعد بار کا کاروبار چلتا تو وہ کام پر جاتیں اور علی الصبح لوٹتیں۔ جبکہ فلپینی لڑکیاں کسی سپر مارکیٹ میں کام کرتیں۔ صبح نو بجے جا کر ایک بجے آتیں اور آرام و استراحت کے بعد چار بجے جا کر رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے واپس آتیں۔ ایک کمرے میں ایک پاکستانی، غلام حسن رہتا تھا۔ غلام حسن۔۔۔۔ کالا کچیلا، کھردرے چہرے پر زخم کا نشان، ہر وقت نشے میں مخمور آنکھیں اور اس کا ترچھی نظروں سے دیکھنا، گھنی کالی مونچھوں میں سفید بالوں کا بگھار، عام طور پر میلی سی بنیان اور لاچے میں ملبوس رہتا مگر جب باہر نکلتا تو سفید یا کریمی کندورا اور سر پر توپ، لمبے قد پر خوب کھلتا۔ نوازش کو پاکستانیوں کا کندورا پہننا اچھا نہ لگتا تھا۔ کیونکہ یہاں پر قدیمی مقیم پاکستانی یہ لباس پہن کر خود کو عربی بتا کر نئے آئے ہوئے پاکستانیوں پر دھونس جتانے کی کوشش میں شہدے لگتے تھے۔ مگر غلام حسن اسے صرف اسی لباس میں اچھا لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس لباس نے اس کی تمام خامیوں کو اپنے اندر چھپا لیا ہو۔ اس کے نقوش اس کو چھٹا ہوا بدمعاش بتاتے تھے۔ کبھی کبھار آتے جاتے سر کی جنبش سے دونوں میں سلام کا تبادلہ ہوا تھا ورنہ دونوں میں کوئی بات چیت نہیں تھی۔ وہ کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔ مگر اس کے کمرے میں دن بھر میلہ لگا رہتا تھا۔ دراصل غلام حسن کاشی لگانے کا ماہر تھا۔ دس سال پہلے لانچ پر کراچی سے دبئی اور پھر ابو ظبی آیا یہاں ایک وطنی کا ولا بن رہا تھا جہاں اس نے اپنی کاشی کے کاری کے جوہر دکھائے اور اس وطنی کا کام اتنی خوبصورتی اور دلجمعی سے کیا کہ اس کو غلام حسن بھا گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے قبیلے کے تعمیراتی کام کی ٹھیکیداری اسی کے حوالے کر دی۔ اب وہ خود کام نہیں کرتا تھا بلکہ اپنی نگرانی میں کرواتا تھا اور اپنی طے شدہ کمیشن لے کر آرام سے بیٹھ جاتا۔ اس کے ہاں آنے

والوں میں تعمیراتی کام کے متعلقین، مثلاً سول انجینئر، ریت، سمنٹ، چھوٹی چھوٹی مقاولات کمپنیوں کے ٹھیکیدار، اور کارپینٹر، میسن وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ اس کا کمرہ کسی کنسٹرکشن کمپنی کا سیکریٹریٹ بنا رہتا۔ ڈرائنگ اور نقشے زمین پر بچھا کر وہ کبھی چوکڑی مار کر اور کبھی اکڑوں بیٹھ کر سول انجینئروں اور مستریوں ترکھانوں۔ کو ہدایت دے رہا ہوتا۔ کبھی ریت بجری والے کو فون کر کے گالیاں دیتا کبھی سیمنٹ کے بلاکوں کے لئے مصنع کے مالک کو ڈانٹ رہا ہوتا۔ کسی سے چیک کیش کروانے اور کمیشن اور مزدوری یا ٹھیکے کے باب میں گفتگو ہو رہی ہے۔ بہر حال اس کے کمرے میں دن بھر زندگی اپنی تمام تر سرگرمیوں کے ساتھ موجود رہتی۔ کبھی کمرے سے غلام حسن کی ڈانٹ یا گالی گلوچ کے جواب میں دوسروں کے معذرت خواہانہ جملوں کی آوازیں آتی رہتیں۔ بعض اوقات ننگی گالیوں کی آواز بھی اسکی سماعتوں سے ٹکراتی۔ عام طور پر باقی کمروں پر دن بھر خاموشی راج کرتی۔ صرف کھانا پکانے کے وقت کچن میں ان سلونی اور فلپینی لڑکیوں کو دیکھ کر پتہ چلتا کہ ان کمروں میں کوئی رہتا ہے۔ کبھی کبھار رات گئے جاوید خان بھی اپنی محبوبہ کے ساتھ نظر آتا مگر اس سے صاحب سلامت نہ تھی۔ البتہ سیلونی بار گرل کا سورین بوائے فرینڈ کبھی گزرتے گزرتے اسے عربی میں کیف الحال اور کیفک اخی کہتا نوازش اس کا جواب '۔۔۔ الحمد اللہ زین تمام' جو اس نے رٹا ہوا تھا۔۔۔ دیتا اور وہ مسکرا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتا۔ فلیٹ میں بس اس کی اتنی ہی بات چیت ہوتی تھی۔

اس کے ابوظہی میں آنے کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد شاہدہ بھی ایک سپیشل اسائنمنٹ پر شمالی امارتوں۔۔۔ دبئی، شارقہ، راس الخیمہ فجیرہ۔۔۔ چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ بیرون ملک پاکستانیوں کے سلوک سے آشنا ہوا تھا۔ کیونکہ بنک میں نوازش کے لئے کام کا ماحول کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ افسوس کی بات تھی کہ وطن سے باہر وطن کا علاقائی تعصب دندناتا پھرتا تھا۔ سٹاف کے اکثر لوگوں نے اسے یوں جانا تھا گویا وہ ان کا رزق بانٹنے آیا ہے۔ بات بے بات اس کی غلطیاں پکڑنا۔ 'باس از آلویز رائٹ' کا کلچر اس نے کب دیکھا تھا؟ کبھی کبھار تو وہ اتنا زچ ہو جاتا کہ اس کا جی چاہتا کہ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے۔ بنک میں وہ چھٹی کا انتظار کرتا رہتا اور جب چھٹی ہو جاتی تو سوچتا کہ۔ اب کیا کرے۔ چنانچہ وہ اپنے کمرے میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا رہتا۔ وی سی آر پر فلمیں دیکھتا رہتا۔ ایک دن کوئی پاکستانی فلم ڈھونڈ کر لایا۔ فلم چل رہی تھی۔ اس فلم میں اس وقت گیت چل رہا تھا۔

اس رنگ بھری محفل میں کریں کیا باتیں اجیاروں کی
ڈوبے سورج اندھی کرنوں اور ٹوٹے ہوئے تاروں کی
کوئی آ پھوہے خود اپنا کفن، تم نے بھی کبھی دیکھا ہے
تقدیر کا یہ بے رحم چلن تم نے بھی کبھی دیکھا ہے
پیاسی ممتا، بھوکا بچپن، تم نے بھی کبھی دیکھا ہے
دنیا سے گلہ کوئی، نہ تم سے شکایت ہے
تم لوگو کیا جانو، کیا چیز یہ غربت ہے
جو بھوک ستاتی ہے وہ کیسی لعنت ہے
پوچھو ان سے جن کو فاقوں کی بھی عادت ہے
روٹی کیلئے بک جائے بہن، تم نے بھی کبھی دیکھا ہے۔
حالات کی مجبوری کیا کچھ نہ کراتی ہے
دولت کی چوکھٹ پر، ذہنوں کو جھکاتی ہے
خود اپنی ہی نظروں میں، انساں کو گراتی ہے
نہ طوفاں اٹھتا ہے، نہ آہٹ آتی ہے
خوابوں کو لگے، یہاں روز گہن، تم نے بھی کبھی دیکھا ہے
ہم نے تو بہت دیکھے ہیں تم نے بھی کبھی دیکھا ہے

گانا ختم ہوا تو نوازش ٹائلٹ جانے کے لئے باہر نکلا۔ دروازے کے باہر کھڑا، غلام حسن لپک اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نوازش تھوڑا سا حیران ہوا مگر پھر وہ سمجھ گیا کہ غلام حسن یہاں کھڑا گانا سن رہا تھا۔ غلام حسن کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دیر تک یہ گیت سن کر روتا رہا تھا۔

ایک روز وہ اپنے فلیٹ والی بلڈنگ کے سامنے بنچ پر بیٹھا ہوا ماضی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''جی باویو (باوے او) کیا سوچوں وسوسوں میں پڑے ہو۔'' نوازش نے سر اٹھا کر دیکھا۔ غلام حسن اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ نوازش کے مزاج پر اپنائیت کا چھینٹا پڑا۔ اسے یوں لگا جیسے اس اجنبی ریگستان میں ایک دریچہ کھل گیا ہو۔۔ جس میں سے وطن کی مٹی کی مہک اور ہوا کی خوشبو بیک وقت اس کی روح میں سما گئی ہو۔'' نظور بتا رہا تھا آپ سادات ہو۔۔۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ غلام حسن نے کہا "بش شاواشے۔ باوا جی" اس نے نوازش کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "باویو! کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کرنا۔۔۔ تہاڈے جھنڈے تھلیوں لنگھنا اے باویو!!!" اس نے ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے کہا۔

نوازش ابھی تک چپ تھا غلام حسن ہی اب تک بول رہا تھا۔ "مولائی ہو باوا جی!"

"جی!!" نوازش نے سوالیہ نظروں اس کی طرف دیکھا۔۔ غلام حسن اس کی چپ اور چہرے کے نقوش سے اس کی الجھن بھانپ گیا۔ اور پیار سے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "باوا جی سنی ہو یا ۔۔۔" اب نوازش نے بڑے اعتماد سے کہا۔ پتہ نہیں بھائی۔ بس کلمہ مسلمانوں والا پڑھتا ہوں۔ باقی بات بلھے شاہ والی ہے۔

ع کیہہ جاناں میں کون؟ وے بلھیا، کیہہ جاناں میں کون!!

"اچھا چھارل گئی سمجھ، سنی ہو۔۔۔ کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں ہم تو مولا پنجتن کے ماننے والے ہیں اور سادات کے غلام ہیں۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "غلام حسن۔۔۔!!!" پھر سر کو ذرا سا جھکا کر بولا۔ "حکم پیرا بھاگیں بھریا حکم کر۔۔"

"کیا؟" نوازش نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور دل میں سوچا کیا حکم کروں۔ غلام حسن نے اسے چپ پا کر کہا چلو گرمی بہت ہے کمرے میں چل کر گپ شپ لگاتے ہیں۔ اور وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

فلیٹ میں پہنچ کر جب غلام حسن نے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک دم سگریٹ، الکحل اور پسینے میں لپٹے کپڑوں کی ملی جلی بدبو کا ایک بھبوکا اسکے نتھنوں سے رگڑ کھاتا ہوا اس کے حلق میں اتر گیا۔ اور وہ غیر ارادی طور پر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس جائے۔ اسی دوران غلام حسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھکر اسے اندر کمرے میں لے آیا۔

آج پہلی بار وہ غلام حسن کے کمرے میں آیا تھا۔ کمرے میں بچھا ہوا میلا سا ہلکے بادامی رنگ کا قالین جگہ جگہ سے جلا ہوا، اسکی بے پروائی کا اشتہار تھا۔ کونے میں ایک لکڑی کی الماری تھی۔ دوسرے کونے میں ایک پرانا سا ڈبل بیڈ اور چار پانچ تکیے اور قالین پر نیچے بیٹھنے والوں کے لئے دو گاؤ تکیے پڑے ہوئے تھے۔ دروازے کے پیچھے تین چار کیلوں پر کندورے اور شلوار قمیص لٹکے ہوئے تھے۔ کمرے کی یہ حالت دیکھ کر اور دن بھر اس کے کمرے میں ہونے والی کے لئے کار

گزاریوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے غلام حسن بہت بڑا ڈرامہ باز ہے اور دن بھر یہاں کسی ڈرامے کی ریہرسل ہوتی رہتی ہے۔ ورنہ یہ میلا گندا سا کمرہ، اگر وہ لاکھوں میں کھیلتا کھلاتا ہے تو کم از کم اپنے کمرے کی حالت۔۔۔'

کثرت شراب نوشی اور رات گئے شب زادیوں کی آمد و رفت، غلام حسن کے یہ دو معمولات نوازش کے اس سے میل جول میں مانع رہے تھے۔ مگر اب جبکہ وہ مسلسل تنہائی اور بے رخی کا مارا ہوا تھا اور غلام حسن نے پہل کر کے اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا تو اس کے لئے اس دم غلام حسن کا دم بھی غنیمت تھا۔

رفتہ رفتہ دونوں میں میل جول اور التفات اور اپنائیت نے وہ تمام مرحلے طے کر لئے۔ جو گہری دوستی کی بنیاد بنتے ہیں۔ چنانچہ دو ماہ بعد جب شاہدہ ابوظہبی واپس آئی تو وہ اچھا خاصہ یہاں settle ہو چکا تھا بنک میں بھی اس نے اپنے طریقے سے کام کرنے کا گر سیکھ لیا تھا۔ ایک غلام حسن، جھگڑالو۔ ان پڑھ۔ دیہاتی۔ جس کا بنک اور بنکنگ سے دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اس کے لئے بنک میں ٹھہرنے کا سبب بن گیا تھا۔ 'ایک آدمی بھی کبھار بیک وقت کسی کے لئے کتنا اہم اور کسی کے لئے کتنا غیر اہم بن جاتا ہے۔' اب غلام حسن اسے برا نہ لگتا تھا بلکہ بعض اوقات جب وہ کمرے میں اکیلا ہوتا اور غلام حسن شہامہ سائٹ پر گیا ہوتا تو وہ اسے miss کرتا تھا۔

رات کو ٹن ہونے والے غلام حسن اور دن بھر کاروبار میں بک بک کرنے والے غلام حسن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ رات کا غلام حسن ماضی کی محرومیوں کو یاد کر کے روتا۔ پاکستان اپنی ماں کو فون کرتا۔ اپنے آنے کا جھوٹا وعدہ کرتا اور پھر ہوٹل سے انواع و اقسام کے کھانے منگوا کر ذرا سا کھا کر باقی ڈسٹ بکس میں پھینک دیتا۔ اگر نوازش فلیٹ میں موجود ہوتا تو زبردستی اسے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتا۔ کھانے کے ساتھ وہ پانی کی جگہ وسکی کی بوتل سے گھونٹ بھرتا۔ ایک بار نوازش نے اسراف اور رزق کی بے حرمتی کرنے سے منع کیا۔ غلام حسن کی بھنویں تن گئیں۔ اس کھانے کا دستر خوان اٹھا کر اس نے ڈسٹ بکس میں دے مارا اور غصے سے نوازش کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں نفرت اور تحقیر کا زہر بھر گیا۔

''باوا جی! تم پڑھے لکھے لوگ ہو۔ تم نے یہی پڑھا ہوگا کہ رزق کی بے ادبی کرنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔۔۔ رزق اللہ کی نعمت ہے۔۔۔ مگر باوا جی رزق کتنا ظالم ہے یہ نہیں پڑھا

ہوگا۔ زرق بڑا ظالم ہے۔ بادا۔ بڑا ظالم ہے یہ رزق! میں ایک روٹی کے لئے ترسا ہوں میرے لئے ایک روٹی لانے کو میری ماں نے لوگوں کی جوتیاں چاٹی ہیں۔ ہم نے لوگوں کے کھائے ہوئے پھلوں کے چھلکے کھائے ہیں۔ چوری کروائی ہے اس رزق کی تانگ نے۔۔۔"

"چوری؟"

ہاں بادا میری ماں چودھریوں کی نوکرانی تھی۔ وہ جب ان کے لئے پھل کاٹتی تو اس طرح چھیلتی کہ پھل کا کچھ حصہ چھلکے کے ساتھ رہ جاتا۔ جب وہ چھلکا روڑی پر پھینکتی تو میں۔۔۔۔۔!!!

"اوہ!!" نوازش کے منہ سے شدتِ تاسف سے "اوہ" نکل گئی۔

نہیں بادا! ابھی نہیں۔۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، سنو! ایک دن ہماری چوری پکڑی گئی۔۔۔ چودھری نے مجھے ماں کے پھینکے ہوئے آم کے چھلکے اور گٹھلیاں چوستے ہوئے دیکھ لیا اور مارتا مارتا گھر لایا اور سارے گھر والوں کے سامنے میری ماں کو چورنی کہہ کر دھکے دے دے گھر سے، نوکری سے نکالدیا۔ اس وقت اس نے کہاں کہاں ہاتھ لگائے میری ماں کے جسم۔۔۔۔۔۔!! غلام حسن کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی چہرہ سرخ ہوگیا۔ اور آنکھیں آگ برسانے لگیں مگر پھر یہ آگ آنسوؤں میں اتر گئی۔۔

سال رواں کا آخری روز تھا۔ وہ اپنے کام میں بے طرح مصروف تھا جب ایک نیپالی چپراسی، بہادر نے اسے مخاطب کیا۔ "صاحب! میرے ہاں رات کو نیو ائیر نائٹ میں تھوڑا فنکشن ہے آپ آؤ تو ہم خوش ہو جاؤں گا۔"

"اچھا!" نوازش نے اپنے کام سے توجہ ہٹائے بغیر رسماً پوچھا۔ "اور کون کون آئے گا۔"

"صاحب اور لوگ تو بہت مصروف ہوگا۔ ہم چھٹی لیا بڑے صاحب سے۔ صاحب اگر آپ فارغ ہو تو آؤ نا۔ ہم۔۔"

نوازش نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "دیکھو وعدہ نہیں، اگر رات جلدی فارغ ہوا تو۔۔۔"

صاحب مہربانی۔۔" بہادر نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ نوازش نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو بہادر، وعدہ نہیں مگر کوشش ضرور کروں گا۔"

"بہت شکریہ صاحب" بہادر نے اس کی وضاحت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ نوازش نے پوچھا "اور کس کو مدعو کیا۔ میرا مطلب ہے، invite کیا؟"

"کسی کو نہیں صاحب بس آپ کو۔۔۔ اور کون آئے گا۔ ہمارا کچھ فرینڈ لوگ ہوگا" بہادر نے یوں

ڈرتے ڈرتے کہا جیسے نواز ش سے اجازت طلب کر رہا ہو۔
نوازش نے کہا۔ ''ہمیں بھی کسی دوست کو لانے کی اجازت ہے۔''
''کیوں کیوں نہیں صاحب ہم خوشی ہوگی۔'' بہادر نے کہا۔
رات دس بجے کے قریب جب وہ بنک سے نکلا تو آگے غلام حسن فٹ پاتھ پر لگے بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ''خیر ہے؟'' نوازش اسے وہاں دیکھ کر ذرا لمحے بھر کو ٹھٹکا غلام حسن قہقہ لگا کر اٹھا۔ ''باوا گھابر گیوں (بابا گھبرا گئے ہو)''
''نہیں دراصل تم کبھی ایسے۔۔۔''
''ہاں۔ مگر میں نے سوچا تم آج مصروف ہو گے اور آج سال کی آخری رات ہے۔'' غلام حسن نے اس کی بات کاٹتے کہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے چل پڑا۔ نوازش نے ذرا رک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یار میں نے تو بہادر کو کہہ دیا ہے۔ اس کے ہاں دعوت ہے۔ بلکہ میں نے تو تمہارے لئے بھی دعوت لے لی ہے۔''
غلام حسن نے کہا۔ ''میں تو اسی لئے تیرے بنک کے آگے سوالی بنا بیٹھا تھا مجھے پتہ تھا آج تمہیں کوئی نہ کوئی چھین لے گا۔''
'ارے میں تو تمہیں ساتھ لے کر جا رہا ہوں پھر چھیننے کا کیا۔۔؟ چلو تھوڑی دیر کے لئے روم میں چلتے ہیں اور فریش ہو کر اسکی طرف چلتے ہیں۔ اس کا دل رہ جائے گا۔ بیچارے نے بڑے خلوص سے دعوت دی ہے۔''
غلام حسن نے کہا۔ ''باوا کبھی ہمارا دل بھی رکھ لیا کرو۔''
نوازش نے کہا۔ '' ارے تمہارے ساتھ تو ہر وقت ہوتا ہوں، تمہارے لئے تو میں گھر کی مرغی ہوں۔ جب کہو گے جہاں کہو گے۔ چل پڑوں گا۔''
''ٹھیک ہے باوا، ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی، میں نے کب نہ کی ہے۔'' غلام حسن نے یہ کہہ کر ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور دونوں اس پر سوار ہو فلیٹ کی طرف چل دیئے
جب بہادر کے ہاں پہنچا تو سامنے شاہدہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نوازش اسے دیکھ کر کھل اٹھا مگر اس نے اپنی خوشی کو حیرت میں ڈھالتے ہوئے بہادر کی طرف دیکھا۔
''مجھے بھی نہیں پتہ تھا'' شاہدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
''مجھے تو تم نے کہا تھا کہ صرف میں۔۔۔'' نوازش نے بہادر سے کہا

بہادر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم سوچا آپ کو نوازئر کا سرپرائز دوں گا۔''
نوازش نے شوخی سے کہا ''بھولے بہادر! سرپرائز نہیں یہ سرکو پرائز ہے۔''
بہادر کو یہ باریک بات سمجھ نہ آئی۔ وہ ذرا سا کھسیا گیا۔ اور شاہدہ نے نظریں نوازش کے چہرے جماتے ہوئے کہا۔ ''خاصے سمجھ دار ہو گئے ہو۔
بنک سے باہر یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ !!دراصل چند ماہ پہلے جب بہادر کی ملازمت ختم ہو رہی تھی تو شاہدہ اور نوازش نے اپنی اپنی جگہ مختلف طریقوں سے اس کی مدد کی تھی جس کے باعث اس کی ملازمت بچ گئی تھی۔ جس کے بعد وہ ان دونوں کا ممنون رہتا تھا۔ مگر نوازش اور شاہدہ اپنی اپنی جگہ بہادر کے رویے پر غور کر رہے تھے اور اس کی روشنی میں اپنے رویوں پر بھی غور کر رہے تھے۔ کہ ان کے تعلقات کا وہ کون سا پہلو تھا جسے بہادر نے نوٹ کیا تھا۔ اس نے دونوں کی آمد کو ایک دوسرے سے مخفی رکھا تھا۔ وہ کون سے عوامل تھے جن کے تحت بہادر کا خیال تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو یوں پا کر خوش ہونگے۔۔۔ گویا ان دونوں کے رویوں کو بنک میں اسی طرح نوٹ کیا جاتا ہے۔ یقیناً! ایسا ہی ہوگا۔ اگر بہادر ان کے تعلقات کو خاص نظر سے دیکھ سکتا ہے تو سٹاف کے دوسرے لوگ کیوں نہ محسوس کرتے ہونگے۔ بلکہ نجانے ان کے متعلق کیا کیا قصے بنے ہوئے ہوں گے۔۔۔ یہ سوچ کر شاہدہ اور نوازش اپنی اپنی جگہ کچھ ڈسٹرب تھے۔ اور جب نوازش نے غلام حسن کا شاہدہ سے تفصیلی تعارف کروایا اور جواب میں غلام حسن نے اپنی سادگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''شاہدہ جی ویسے تو اس نے کبھی نہیں بتایا مگر وہ پنجابی میں کہتے ہیں۔۔۔ گھوڑی چڑھے نہیں مگر چڑھدے تے دیکھے ہیں نا۔۔۔۔ میں یقین سے کہتا ہو'' باوا آپ کو بہت یاد کرتا تھا۔'' غلام حسن یہ کہہ کر چپ ہو گیا اور نوازش نے اس کی باتوں کے تناظر کو ملا کر اپنے اور شاہدہ کے تعلقات کی جو تصویر بنائی تھی وہ بہادر کی بنائی ہوئی تصویر سے ہو بہو نہیں تو خال خال ضرور ملتی تھی۔

نوازش نے شاہدہ کو گہری سوچ میں ڈوبے دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ شاہدہ بھی یہی سوچ رہی ہے اور شاہدہ فی الواقعی یہ سوچ رہی تھی۔ نوازش نے صورت حال کی گمبھیرتا کو کم کرنے کے لئے اس سے پوچھا۔ ''تم کب شارجہ سے آئیں اور یہاں کیسے۔۔؟'' شاہدہ نے بتایا کہ وہ شارجہ سے سیدھی آج ہیڈ آفس آئی تھی جہاں بہادر سے اتفاقاً ملاقات ہوئی اور اس نے منت کی، میں نے سوچا کل چھٹی ہے، غریب آدمی خوش ہو جائے گا سو چلی آئی۔۔۔۔۔ اور تم؟

''میں بھی یہی سوچ کر چلا آیا۔مگر اس بے ایمان نے مجھے تمہارا نہیں بتایا تھا۔''

''مجھے بھی نہیں بتایا تھا کہ تم بھی آرہے ہو۔۔''

''ورنہ تم نہ آتیں۔؟'' نوازش نے اس کی بات کاٹتے ہوئے مذاقاً کہا۔'' خود کو under assess کررہے ہو۔''

نوازش اس کی یہ بات سن کر لاجواب ہوگیا مگر ایک طرح کی برتری کا احساس اس کے وجود میں سرایت کر گیا۔

اسی دوران بہادر کی گرل فرینڈ اور اس کے روم میٹ کی گرل فرینڈ اور اسکے برابر والے روم والی کیرالوی لڑکی ۔۔تینوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔اور بہادر نے سب کا تعارف کروایا۔ادھر ادھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔کچھ بہادر کی گرل فرینڈ کی۔۔کچھ بنک کی۔۔۔۔پھر وہ لمحہ آ گیا جس کا سال بھر سے انتظار رہتا ہے۔ہلکا ہلکا میوزک ہلکی ہلکی روشنی میں چمکتی ہوئی آنکھیں جن میں بیک وقت جانے والے لمحے کا سوگ اور آنے والے لمحے کی خوشی کا تاثر چھپا ہوا تھا۔آنکھوں میں امیدوں کے چرغ جل اٹھے۔شاید آنے والا لمحہ خوشیوں کی نوید لے کر آرہا ہوں۔یہ لمحہ، رخصتی کا لمحہ!!۔۔۔۔۔جانے والا ویسے ہی اچھا لگتا ہے۔اور جب چلا جاتا ہے یاد آتا ہے۔اور جس لمحے کے دامن میں کسی کی یادوں کی مالا آویزاں ہو، اس لمحے کی رخصتی کا لمحہ!۔۔۔۔

نوازش نے پہلی بار شاہدہ کو بڑے پیار سے دیکھا۔جو کسی سوچ میں گم تھی۔معاً شاہدہ نے اس کی طرف دیکھا۔تو اس نے نظریں چرانے کی کوشش کی مگر بسیار کوشش کے باوجود اس کا شاہدہ کو پیار سے دیکھنا شاہدہ کی نظر میں آ گیا۔دھیمی دھیمی دھن اور دھیمی دھیمی روشنی میں دونوں ایک دوسرے کو پا گئے، ایک دوسرے کو بھا گئے۔نوازش زیر لب بڑبڑایا۔

"Good bye جانے والے لمحے میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ welcome اے آنے والے لمحے! آ مجھے بتا تیرے دامن میں میرے لئے کیا پیغام ہے؟؟۔۔

میوزک تیز ہوا جام کا دور چلا کپل ڈانس ،جسم تھرتھرائے۔غبارے پھوڑے گئے ،قہقہے، چیخیں۔۔خوشی کی، دکھوں کو بھولنے والی کتھارسس کی آئینہ دار چیخیں۔پورا فلیٹ کچھ دیر کے لئے خوشیوں سے گونج اٹھا۔بہادر اور اس کے دوست ایک دوسرے کے گلے میں، بانہوں میں بانہیں ڈالے مست الست رقص و نغمہ میں محو ہو گئے۔۔بہادر کی گرل فرینڈ نے شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے رقص کی دعوت دی اسی طرح بہادر نے نوازش کو اور بہادر کے دوست نے غلام حسن کو۔مگر

تینوں نے ہاتھ کھینچ لئے وہ تالیوں اور مسکراہٹوں سے ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ جب یہ ہنگامہ تھما اور وہ بہادر سے رخصت ہوئے تو نوازش نے کلائی کی گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے کہا "اس وقت دو بج رہے ہیں۔ اب کیا پروگرام ہے۔"

"ارے نہیں یار میں ٹیکسی پر چلی جاؤں گی زیادہ دور تو نہیں۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔۔ پیدل چلتے ہیں۔ میں الیکٹرا سے نادی سیاح (tourist club) کی طرف نکل جاؤں گا۔"

بہادر کے ہاں سے رخصت ہو کر جب وہ نجدہ روڈ کے سگنل پر آئے تو غلام حسن کو اچانک کوئی کام یاد آ گیا۔ اور وہ ان کو پوچھے بغیر ان سے الگ ہو کر سڑک پار کر گیا۔ شاہدہ نے حیرانی سے نوازش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ تمہارے دوست کو کیا ہوا۔ یہ۔۔۔"

نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہے تو ان پڑھ مگر بے وقوف نہیں۔ خود کو کباب میں ہڈی سمجھ کر نکل گیا۔۔"

شاہدہ نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں سوال واستعجاب کا ملا جلا تاثر نمایاں تھا۔ نوازش کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ تجاوز کر گیا ہو۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ شاہدہ نے بھی مزید کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔

دونوں الیکٹرا روڈ پر شارع سلام کی طرف چل پڑے۔ رات کے کوئی سوا دو بجے کا عمل تھا۔ سڑکوں پر سال نو کے باعث خلاف معمول ٹریفک تھی۔ اکا دکا خواتین بھی، کوئی اکیلی کوئی دوکیلی کوئی جوڑا، جوڑا۔۔ سب اپنے اپنے مقام و مسکن کی طرف رواں دواں تھے۔ پاس سے پولیس کی پٹرول گاڑیاں بھی گزرتیں۔ مگر کوئی کسی کو نہیں روکتا، کوئی کسی کو نہیں ٹوکتا۔ ہر کوئی اپنے آپ میں مگن تھا۔ وہ دونوں بھی پیدل چلے جا رہے تھے۔

"رات کا بھی اپنا ہی لطف ہے۔" نوازش نے کہا۔

شاہدہ نے جواب دیا "مگر صرف امارات میں۔"

"ہاں تم بھی ٹھیک کہتی ہو۔۔۔ اب اس وقت ہم اگر اپنے وطن میں ہوتے تو نجانے کتنوں کی سننی پڑتی اور کتنوں کو جواب دینا پڑتا۔ اور اگر سب سے بچ کے نکل جاتے تو اپنی گلی کی نکڑ پر لٹ جاتے۔"

"ہونہہ!" شاہدہ نے ہنکھورا دیا۔ "بالکل درست۔۔"

چلتے چلتے وہ الیکٹرا کے آخری اشارے پر پہنچ کر رک گئے۔ نوازش نے کہا۔ ''لو بھئی تمہاری تو منزل آگئی۔۔۔۔۔ کیسی رہی آج کی رات، کیسا لگا؟۔''
شاہدہ نے گردن دائیں کندھے کی طرف جھکا کر سوچتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر نجانے کیوں اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ہاں! اچھا لگا۔ اپنے ماحول اور معمول سے باہر بھی نکلنا چاہئے، چلتی ہوں۔''
نوازش نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا اور شاہدہ نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ شاہدہ کے ہاتھوں کے لمس نے اس کے رگ وپے میں ایک سرور پیدا کر دیا تھا۔ چند لمحے یہی کیفیت رہی پھر شاہدہ نے ہاتھ چھڑایا اور لرزتی ہوئی آواز میں ''خدا حافظ!'' کہا اور اپنی بلڈنگ کی طرف مڑ گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ دیر تک بستر پر کروٹوں سے کھیلتا رہا۔۔۔۔۔ یہ لڑکی جو کبھی میری پریم گرو تھی۔ کبھی کھلنڈری، بے باک۔ آخری بار جدا ہوتے وقت یہ کتنی پر اعتماد تھی۔ اسے یقین تھا کہ ہم دوبارہ ملیں گے اور ہم مل گئے۔ کیا ہمارا ملنا، یوں ملنا طے تھا۔ اگر طے تھا تو شاہدہ کو کیسے پتہ تھا۔ اس بے باک اور بے دھڑک شاہدہ میں جو اسے نیلسن سے پیار کرنے کا ڈھنگ بتاتی تھی۔ آج وہ پہلے سے مختلف لگ رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ آج اتنی چھوئی موئی کیوں تھی۔ خدا حافظ کہتے وقت اس کی آواز کی لرزاہٹ ابھی تک اس کی سماعتوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔۔۔۔۔ شاہدہ کے ساتھ گزری ساعتوں نے اس کی ویران وتنہارات میں رعنائیاں بھر دی تھیں۔

اسے غلام حسن کے ساتھ اس فلیٹ میں رہتے ہوئے ڈیڑھ سال گزر گیا۔ غلام حسن کے معمولات وہی تھے۔ ہر رات کوئی نہ کوئی شب زادی اس کے بدبودار بستر پر موجود ہوتی تھی۔ ۔۔۔۔ آج غلام حسن شہامہ سائٹ پر گیا ہوا تھا۔

رات گئے اس کے در پر دستک ہوئی ایک نوجون مٹیار کہ قد بت اور ڈیل ڈول سے اور جس طرح اس نے بے جھجک پنجابی میں اس نے غلام حسن کے بارے میں پوچھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ مشرقی پنجاب کی (شاید سردارنی) ہے۔ غلام حسن کا دروازہ بند ہے، کہاں ہے۔'' وہ یہ کہہ کر اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے میں آگئی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا کوئی خیال ظاہر کرتا وہ نہایت بے تکلفی سے کرسی بیٹھ گئی۔ نوازش کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ اپنے کام میں

مصروف رہا۔ وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی ٹی وی دیکھتی، اور ریموٹ سے چینل بدلتی رہی۔ پھر اس نے نوازش کے ساتھ بات چیت شروع کردی نوازش کی باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد غلام حسن آگیا اور دروازہ کھلنے کی آہٹ پا کر نوازش کو کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔ غلام حسن نے اس کے کمرے کے اندر ادھ کھلے دروازے میں سے جھانکا۔ نوازش کے منہ میں سگریٹ اور شراب کی بو، اور پسینے سے بھیگے ہوئے کپڑوں کی سڑاند کی طرح کی بدبو آئی۔ غلام حسن نے مسکرا کر کہا۔ "یاد امیرے پراہنے نوں اپنے کمرے وچ بٹھاوندا ابھنو شکریہ۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

آج سے پہلے اسے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ یہ بازاری عورتیں کس طرح ہر بھدے برے اور بدبودار جسم کے ساتھ جسم جوڑتی ہیں اور کس حوصلے اور برداشت سے شراب اور معدے کی بدبو سے بھری ڈکاروں میں لب سے لب ملاتی ہیں۔!!! کیسے، کیوں۔۔۔؟ صرف پیسے کے لئے! اور پیسہ کس کے لئے۔۔ ان کا کون سا گھر بار سنسار ہوتا ہے۔ یہ پیسہ کس پر خرچ ہوتا ہے۔ ان کے خونی رشتے۔؟؟؟ بال بچے؟ کیا ان کے بھی بچے ہوتے ہیں، کیا یہ بھی اپنے بچوں کی پڑھائی لکھائی اور وداعی کے لئے فکرمند ہوتی ہیں۔۔۔۔ نہیں، بلکہ ان کی بیٹیاں تو جوان ہو کر ان کے بڑھاپے کا سامان کرتی ہیں۔ شاید اسی طرح جس طرح یہ کر رہی ہے۔ اس کا سب اندوختہ، ساری کمائی بھی ماں کی ہتھیلی پر جاتی ہوگی اور وہ جواباً اس کا منہ چوم کر بلائیں لیتی ہوگی۔ دعائیں دیتی ہوگی۔۔۔۔ کیا دعائیں دیتی ہیں؟ ایک جسم بیچنے والی اور بچوانے والی ماں، اپنی جسم فروش بیٹی کو کیا دعا دیتی ہوگی۔ .... پہلے اسے ایسی عورتوں سے گھن آتی تھی مگر اب ترس آتا تھا۔۔ اپنا آپ پالنے۔ اپنا آپ بیچنا پڑتا ہے۔۔۔۔ بے شمار بار!۔۔ کیا فرق ہوتا ہے لوگوں کی گندگی اٹھانے والی۔ بھنگن میں اور ان میں؟۔۔۔۔ بہت فرق ہے۔ اُن کے تو ہاتھ ہی ژولیدہ ہوتے ہیں جبکہ ان کا تو پورا وجود بلکہ روح بھی پراگندہ ہو جاتی ہے۔ ان میں کون قابل نفرت ہے۔۔۔۔۔ ضرورت کے تحت دونوں کو طلب کیا جاتا ہے اور پھر استعمال کے بعد دونوں قابل نفرت ہو جاتی ہیں۔

اب نوازش کا یہ معمول بن گیا تھا کہ جب بھی موقع ملتا وہ اسے شراب نوشی ترک کرنے پر اکساتا رہتا۔ اور غلام حسن اس کی ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اڑا دیتا۔ آج بھی جب وہ جون پر انڈین سکاچ وسکی کا آرڈر دے رہا تھا۔ نوازش نے کہا۔

مورکھ نوں کیہہ پند نصیحت، پتھر نوں کیہہ پالا
سو پانی وچ کمبل دھوتا، مڑ کالے دا کالا

(جاہل آدمی پر نصیحت اور پتھر پر سردی اسی طرح اثر نہیں کرتی جس طرح کالے کمبل کو جتنا مرضی دھویا جائے اس کا رنگ سفید نہیں ہو سکتا۔)

غلام حسن نے فون رکھتے ہوئے کہا باوا تمہارے ساتھ دل لگ گیا ہے۔ مورکھ کہو یا پتھر۔۔ جو مرضی کہہ لو۔ آخر تمہارے جھنڈے کے نیچے سے گزرنا ہے۔۔۔۔'' نوازش نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس نے اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''۔۔۔۔۔۔ دیکھنا کہیں اوروں کو جھنڈے سے اور ہمیں ڈنڈے سے نہ گزارتے رہنا۔۔۔۔ باوا جی، خیال رکھنا۔''

نوازش نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اگر تم باز نہ آئے تو ڈنڈے ہی سے کام لینا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے باوا، ٹھیک ہے!! یہاں پر نصیحتیں کر کر کے مارتے ہو۔ اور وہاں ڈنڈے مارنے کی دھمکیاں دیتے ہو۔'' غلام حسن نے ہنستے ہوئے گلہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک کالا کلوٹا مالاباری خاکی رنگ کے لفافے میں ملفوف انڈین سکاچ وہسکی کی بوتل لے کر فلیٹ میں داخل ہوا۔ غلام حسن نے اس سے لفافہ لے کر نوازش سے کہا۔ ''باوا میرے ساقی کو تمیں درہم دے دو۔ نوازش نے پیسے دیکر اسے چلتا کیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شاعر لوگ کہتے ہیں، پینے کا نشہ دراصل پلانے والے سے دوچند ہوتا ہے۔ تیرے ساقی کو دیکھکر تیری مے نوشی پر ترس آتا ہے۔'' غلام حسن نے کہا۔ ''یہ پلانے والا ساقی نہیں لانے والا ساقی ہے۔۔۔ پلانے والا ساقی رات کو آئے گا تو دیکھنا کیسا ہے۔''

غلام حسن بوتل کی سیل گھول رہا تھا نوازش نے کہا۔ ''لعنت بھیج اس انگور کی بیٹی پر۔''

''ناں ں ں باوا!'' اس نے وہسکی گلاس میں انڈیل کر گلاس کو پیار سے دیکھتے ہوئے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے، سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''کسی کی بیٹی پر لعنت نہیں بھیجتے!!'' اس نے گھونٹ بھرا اور بات جاری رکھی۔ ''اور خاص طور پر انگور کی بیٹی پر! توبہ توبہ، یہ تو ہونٹوں سے لگانے اور دل میں بسانے کی چیز ہے۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور ''اللہ معاف کرے!!'' کہہ کر گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

آج اسے شاہدہ کے ساتھ کسی تقریب میں جانا تھا۔ چنانچہ وہ اسے شغل مے نوشی میں

چھوڑ کر چلا گیا۔ رات گئے جب وہ واپس آیا تو غلام حسن کا در نیم وا تھا۔ میز پر خالی بوتل پڑی تھی۔ وہ فون پر اپنی ماں سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے، بوٹی کی طرح سرخ اشک آلودہ آنکھوں سے نوازش کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی انجانے کرب کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ فون بند کر کے باہر آیا اور نوازش کا بازو پکڑ کر اندر کمرے میں لے گیا۔ نوازش نے اس کی کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کھانا۔۔۔؟" غلام حسن نے کسی بے سہارا اور بے چارا بچے کی طرح دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں شرابی کی معصیت کے بجائے بچے کی معصومیت تھی۔ اس نے ہتھیلی سے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ "بادا بہت بھوک لگی ہے۔"

"میں نے بھی نہیں کھایا، چلو باہر چلتے۔" نوازش نے کہا۔ غلام حسن نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کسی شرطے نے گاڑی روک کر میرا منہ سونگھ لیا تو تم بلاش میں رگڑے جاؤ گے۔" غلام حسن کی بات میں وزن تھا چنانچہ نوازش نے ابراہیمی ہوٹل پر خان زمان کو فون کر دیا۔

غلام حسن منہ دھو کر واپس آیا تو نوازش کپڑے تبدیل کرنے کیلئے اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ چنانچہ غلام حسن بھی اس کے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ نوازش نے اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر منت آمیز لہجے میں کہا۔ "چھوڑ دو اس ظالم چیز کو، غلام حسن! میری جان اس دنیا میں ہر کوئی دکھی ہے۔ تم نے اپنے اردگرد کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ورنہ: نانک دکھیا سب سنسار!"

مجھے کسی سے کیا لگے۔ میں کسی کے بارے میں سوچوں بھی کیوں، میرے لئے کسی نے کیا کیا، کیا سوچا؟ میں نے کہا نا بادا۔ تم پڑھے لکھے لوگوں کو نصیحتوں کا نشہ ہوتا ہے۔ تم اپنی نصیحتوں کے نشے میں چور ہو۔ ہمارے لئے تو اس شراب کا نشہ ہی باقی رہ گیا ہے۔ اور تم اسے بھی چھین لینا چاہتے ہو۔ تم پڑھے لکھے لوگوں کے پاس نصیحتوں اور جھوٹی تسلیوں اور حشر کے دھاڑے کے بیاں کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے" اس دوران کھانا آ گیا اور نوازش نے بیرے کو پیسے دیتے ہوئے غلام حسن سے کہا۔ "اب اپنی یہ مکالمہ آرائی بند کرو۔ اور کھانا کھاؤ۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے زمین پر پرانے اخبار پھیلا کر کھانا سجا دیا۔ غلام حسن اپنے کمرے میں گیا اور بچی ہوئی شراب گلاس میں ڈال کر لے آیا۔ کھانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایک چسکی لیتا جاتا تھا۔ نوازش نے کہا۔ "تمہیں کبھی احساس ہوا کہ میں کس طرح تمہارے ساتھ نبھاتا ہوں۔ اب اسی وقت کو لے لو۔ اس وقت اگر کوئی میرے ملنے والا ابھی اسی وقت اگر آ جائے تو اس حالت میں ہمیں کھانا کھاتے دیکھ کر کیا کہے گا۔ اور اگر کہے گا نہیں تو سوچے گا کیا۔۔ کیا کبھی تم نے سوچا؟" غلام حسن نے احسانمندانہ نظروں سے اس کی

طرف دیکھا اور بولا۔ ''باوا تیری اولیائی ہے۔''
نوازش نے فوراً کہا۔ ''میری اولیائی نہیں تیری ڈھٹائی ہے۔'' جواباً غلام حسن خاموش رہا۔ نوازش نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑ دے!!!''
غلام حسن نے کہا۔ ''باوا شراب چھوڑی تو مر جاؤں گا۔''
''تمہیں دو ہارٹ اٹیک ہو چکے ہیں۔۔۔'' نوازش نے جتلانے والے انداز میں کہا۔ غلام حسن نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''باوا تمہیں کس نے بتایا؟''
''یہ چھوڑو کہ مجھے کس نے بتایا۔ تم کہو کہ میں سچ کہہ رہا ہوں نا؟'' غلام حسن نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''باوا میں ڈاکٹروں کی تو نہیں جانتا کیا کہتے ہیں مگر یہ مجھے پتہ ہے کہ مر جاؤں گا۔''
''شراب پی کر مرنے سے بہتر ہے انسان شراب چھوڑ کر مر جائے۔'' نوازش نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ غلام حسن نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بڑے آرام سے بولا۔ ''لو پھر، چھوڑ دی۔''
اور پھر واقعی غلام حسن نے شراب نوشی ترک کر دی گھنٹے، پہر، دن اور پھر ہفتہ بھر تک۔ غلام حسن کے منہ پہ شراب کا نام تک نہ آیا۔ نہ ہی اس نے احسان جتلایا۔ البتہ اب وہ چپ چپ رہنے لگا۔ اس کے سوا اس کی طبیعت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ حالانکہ وہ پانی کی طرح پینے کا عادی تھا۔ دن کے وقت نوازش بنک سے فون کر کے ناطور سے اس کے بارے میں دریافت کرتا رہتا۔ ناطور نے اسے بتایا تھا کہ اب وہ کمرے میں آنے والوں کے ساتھ بھی صرف کام کی بات کرتا ہے۔ اب اس نے گالیاں بھی دینا کم کر دی ہیں۔ نوازش اس کی اس کیفیت کو اپنی اخلاقی فتح سمجھتا تھا۔
اس نے بنک میں شاہدہ سے ذکر کیا تو اس نے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کہ یہ ٹھیک نہیں۔ تم نے اسے پابند کر کے اچھا نہیں کیا۔ اسے کرنے دو جو وہ چاہتا ہے۔ کرتا ہے۔ اب وہ بچہ تو نہیں نا۔ اپنا بھلا برا خود پہچانتا ہے۔'' اس نے شاہدہ کی سنی ان سنی کر دی۔ بلکہ جمعہ کی شام جب وہ لانگ ڈرائیو پر العین کی طرف جا رہے تھے۔ تو نوازش نے بڑے فخر سے اسے بتایا کہ، آج غلام حسن نے اس کے ساتھ جمعہ کی نماز بھی پڑھی ہے۔ شاہدہ نے کہا۔ ''تم جو لوگوں کو نصیحتوں سے مسلمان بنانے پر تلے ہوئے ہو، اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں ہوگا۔۔۔۔ کسی کی مجبوری کا فائدہ نہ اٹھاؤ۔''
''مجبوری؟۔۔۔۔ کیا مجبوری، میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔'' نوازش نے استعجابیہ انداز میں پوچھا۔ شاہدہ نے کہا۔ ''میں جتنی بار اسے ملی ہوں میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے محبت

اور احترام کا رنگ نمایاں دیکھا ہے۔،،ایک عجیب سی دکھ ہے اس کی۔جیسے ماں بیٹے کو دیکھے، یا دوست دوست کو یا پھر عاشق اپنے معشوق کو دیکھتا ہے۔مختلف اوقات میں میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے نت نئے رنگ دیکھے ہیں۔اور جیسے تم وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں بتاتے ہو۔ اس کا تمہاری ہر بات پر پہرہ دینا۔۔۔۔“شاہدہ نے تھوڑی دیر چپ رہ کر اس کو تصور میں محسوس کرتے ہوئے خیال آمیز لہجے میں کہا۔”عجیب سی چمک ہوتی ہے اس کی آنکھوں میں، جس وقت تم بات کر رہے ہوتے ہو۔ that I can't express .“اس نے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔اور نوازش سوچ میں پڑ گیا۔اس نے شاہدہ کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔شاہدہ کے چہرے پر ایک الجھن تھی۔اسے چپ الجھا ہوا دیکھ کر نوازش نے کہا۔”مگر شاہدہ! شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اسے دو ہارٹ اٹیک ہو چکے ہیں، زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔لیکن ایک دوست ہوتے ہوئے یہ میری اخلاقی ذمہ داری ہے کہ میں اسے مرنے سے بچاؤں۔۔۔کیا یہ محبت نہیں؟ “اب شاہدہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اگلے دن علی الصبح وہ نماز کے لئے کھڑا ہوا ہی تھا کہ در پر دستک ہوئی۔ناطور نے بتایا کہ رات غلام حسن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔میرے پاس آیا اور کہا مجھے ہسپتال لے چلو۔پھر تھوڑی دیر بعد اس نے کہا کہ اب وہ ٹھیک ہے چنانچہ جاتے جاتے ٹیکسی سے اتر کر واپس آ گیا۔نوازش نے پوچھا کہ اسے کیوں نہیں جگایا۔ناطور نے کہا غلام حسن نے منع کیا تھا کہتا تھا آپ تھکے ہوئے گہری نیند سو رہے ہو۔وہ شاید آپ کے روم میں آیا تھا۔نوازش نے کہا میں نماز پڑھ لوں۔دیکھتا ہوں۔ابھی اس نے دو سنت ہی ادا کی تھیں کہ در پر دستک ہوئی اور ناطور، غلام حسن کو سہارا دے کر اندر لایا۔نوازش نے کہا۔”خیر ہے۔غلام حسن کی آنکھیں خاموش تھیں۔چہرے پر پسینہ تھا۔رنگ اڑا اڑا سا۔سانسیں بے ترتیب۔

نوازش نے جلدی جلدی نماز مکمل کی اور دعا کے بعد کہا۔غلام حسن تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔میں نے دعا کی ہے۔“ اس کے بعد ناطور سے کہا اسے طلعت میڈیکل سنٹر لے جاؤ۔میں بنک جا کر ڈاکٹر طلعت کو فون کرتا ہوں۔وہ کپڑے بدل کر بنک کے لئے نکلا ادھر ناطور سہارا دے کر اسے لفٹ تک لے کر آیا۔غلام حسن کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے اس نے غلام حسن کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا”اللہ بہتر کرے گا۔میں نے فجر کی نماز کے بعد آج صرف تمہارے لئے دعا کی ہے۔“یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اتر گیا۔غلام حسن نے اس کے جانے کے بعد بمشکل مسکرانے کی

کوشش کی اور کہا۔ ''نہیں باوا جیونے دی دعا کیتی اُوئیا موت دی۔۔۔۔'' لفٹ میں اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ میزانین فلور سے نیچے گراؤنڈ فلور تک آتے وہ بے حال ہو چکا تھا۔ لفٹ میں موجود ایک فلپینو کی مدد سے ناطور نے اسے لفٹ سے نکال کر ٹیکسی تک لایا غلام حسن کی حالت لحہ لحہ غیر سے غیر تر ہوتی جا رہی تھی۔

بنک پہنچ کر اس نے ضروری کاموں سے نمٹنے کے بعد طلعت میڈیکل سنٹر فون کیا تو پتہ چلا کہ اس کی حالت تشویشناک تھی، نبض گم تھی چنانچہ اسے سنٹرل ہسپتال بھیج دیا گیا۔ بچنے کی امید کم ہے۔ فون بند کر کے وہ شاہدہ کے پاس آیا۔'' کیا بات ہے پریشان لگ رہے ہو۔۔ پاکستان میں سب خیریت تو ہے نا۔'' شاہدہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ نوازش نے غلام حسن کے بارے میں بتایا۔ شاہدہ نے پرس اٹھایا اور اسے کہا۔ ''چلو'' نوازش کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔

جب وہ سنٹرل ہسپتال پہنچے تو کہانی ختم ہو چکی تھی۔ جدید طبی آلات، سہولیات اور طبی لیاقت۔۔ سب مل کر بھی غلام حسن کو نہ بچا سکے تھے۔ طائر لاہوتی قفس عنصری کی تیلیاں توڑ کر فضائے لامحدود میں پرواز کر گیا تھا۔ اس کی لاش سردخانے کے ڈبے میں بند کر دی گئی تھی۔ ایک شرابی نے زندگی ہار کر ترک مےنوشی کا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ ناطور نے بتایا کہ ایمرجنسی میں آتے ہی اسے ہوش آیا تو صرف اتنا ہی کہا'' باوے سے کہنا اب تو جھنڈے کے نیچے سے گزرنے دو گے نا۔۔'' ناطور یہ کہتے کہتے رو پڑا۔ نوازش نے شاہدہ کی طرف دیکھا جو زہر خند آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا وہ اندر ہی اندر ضبطِ گریاں کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ تینوں سردخانے میں اس کی میت کا دیدار کرنے کے لئے پہنچے۔ سردخانے کے دروازے پر جا کر شاہدہ رکی۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ نوازش سے مخاطب ہوئی۔'' کہاں جا رہے ہو؟ اسے دیکھنے جا رہے ہو جسے تمہاری نصیحتوں نے مار دیا۔ جسے شراب نہ مار سکی اسے تمہاری نام نہاد پارسائی کے زہر نے مار دیا۔ نوازش میں نے تمہیں کہا تھا نا۔۔۔۔۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رو دی۔ نوازش اشکبار آنکھیں لئے گم صم کھڑا رہا۔ پاس سے گزرتے ہوئے مصری ڈاکٹر نے نوازش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اللہ کریم!!'' نوازش نے کچھ جواب نہ دیا اور اپنے آنسو پونچھ کر دو قدم پر کھڑی شاہدہ کی طرف بڑھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا مرنے والا اس کا کون تھا۔ ناطور نے نوازش کی طرف دیکھا نوازش نے دل میں سوچا تمہیں کیا بتاؤں کہ انسان کا انسان سے

کیا رشتہ ہوتا ہے۔ اس نے شاہدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھکر اس کا کندھا تھپتھپایا۔ شاہدہ نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر روتے روتے کہا۔ ''نوازش تم مانتے کیوں نہیں ۔۔۔۔۔'' ہر کسی کا غم کو محسوس کرنے کا اپنا انداز ہوتا ہے اسی طرح ہر کوئی اپنے غم کا اظہار بھی اپنے طریقے سے کرتا ہے۔ شاہدہ اظہارِ غم میں نوازش کو اپنے ناکردہ جرم کے اقبال پر اصرار کر رہی تھی۔ نوازش کیا کہتا ۔ناچار اس کے نارمل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کا کندھا شاہدہ کے آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

غلام حسن کی میت کی حوالگی کے لئے جو قانونی مراحل درپیش تھے نوازش ان سے مطلق بے خبر تھا۔ اس ملک میں جہاں کوئی ایک ماہ بھی غیر قانونی سکونت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ غلام حسن وہاں پچھلے سات سال سے بغیر ویزے اور بطاقے (لیبر کارڈ) کے رہ رہا تھا۔ بلکہ ویزے اور لائسنس والوں کا رزق بھی قسام رزق نے اس کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا۔ اب جب وہ نہیں رہا تھا تو کوئی اس کا لواحق بن کر اس کی پیروی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کی میت کے اخراجات وغیرہ کے بارے میں اس نے جب تعزیت کیلئے آنے والوں سے کہا تو ہر کسی نے مختلف حیلے بہانوں سے اپنی جان چھڑالی۔ کسی نے کہا حساب ہوگا تو پتہ چلے گا کہ وہ لیندار تھا یا دیندار؛ کسی نے کہا، مجھے تو اس کی وجہ سے اتنا نقصان ہوا ہے کہ ۔۔۔۔؛ ایک نے تو صاف کہہ دیا کہ وہ میرا مقروض تھا۔ ادھر قرض خواہوں کا یہ عالم تھا کہ ہر کسی نے اپنا حساب بھجوایا تھا۔ کیونکہ شراب کے علاوہ غلام حسن کا تمام کارِ خانہ ادھار پر تھا۔ جیسے جیسے پیسے آتے وہ سب کو بلا کر دے دیا کرتا تھا۔ باقی ماں کو پاکستان ہنڈی کر دیتا۔ اور پھر ادھار شروع۔ مگر اب اس کا کوئی والی وارث بننے پر تیار نہ تھا۔ جو لوگ اس کی زندگی میں سر جھکا کر اس کی گالیاں بھی سن کر بدمزہ نہیں ہوتے تھے۔ آج خود کو اس کا محسن بتا رہے تھے۔ ویسے تو وہ پردیس میں پاکستانیوں کے خبث، باطن سے بنک میں آگاہ ہوچکا تھا مگر ان کے کٹھور پن کا یہ مظاہرہ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ کسی کو موت یاد نہیں تھی۔

اس کی میت ہسپتال کے سلاجہ (سرد خانے) میں پڑے پانچ دن گزر گئے تھے۔ بنک سے آکر نوازش کہیں نہ جاتا۔ اپنے روم میں پڑا رہتا۔ اسے کسی سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک دو مرتبہ شاہدہ نے اسے کہا بھی کہ آؤ کہیں گھوم آئیں۔ مگر نوازش بہانہ کر دیتا کہ اسے غلام حسن کے سلسلے میں کسی سے ملنا ہے۔ ہر روز صبح وہ اسے ایک ہی سوال پوچھتی۔ ''کیا بنا' اور نوازش نفی میں سر ہلا دیتا۔ اور وہ چپ ہو جاتی۔ رات کے کسی پہر میں جب اس کی آنکھ کھلتی تو اسے غلام حسن کا خیال آجاتا۔ اس کی باتیں، حرکتیں اس کا نوازش کو پیار بھری نظروں سے دیکھنا اور کہنا۔

دیکھ باوا میں مرجاؤں گا۔۔۔‘ایک دم سے اس کے کانوں میں اپنا کہا ہوا جملہ۔۔۔تو مرجاؤ!!!!
ایک زنانے دار تھپڑ کی طرح لگتا۔کمرے میں آسیب زدہ اداسی ویرانی اور اسکے پورے وجود میں
ملال بھر جاتا۔اس پر لوگوں کی یہ بے رخی!! وہ تڑپ کر رہ جاتا۔ایک دن سلیم بنگش اسکے کمرے میں
آیا اور غلام حسن کی میت کے بارے میں پوچھا۔نوازش بھرا پڑا تھا۔سلیم نے کہا۔’’تم تو جانتے ہو
میرا غلام حسن سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔اس لئے مجھے اس کا اتنا دکھ بھی نہیں جتنا کہ تمہیں
ہے۔میں دیکھ رہا ہوں تم بہت پریشان ہو۔۔۔‘‘
نوازش کا جی چاہا کہ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رولے۔وہ سوچ رہا تھا۔شاہدہ نے تو اسی دن اپنا
کرب آنسوؤں میں بہا دیا تھا اسی لئے وہ نارمل ہو گئی تھی۔اس نے سلیم کی بات کا جواب نہ
دیا۔سلیم نے مہربان لہجے میں کہا۔’’میرے عزیز کہو میرے لائق کوئی خدمت؟‘‘
نوازش نے اسے سارا معاملہ اور الجھن کہہ سنائی۔اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔’’بس اتنی سی بات
،ذرا سی ، بے رخی دیکھ کر تمہارا جی انسانوں سے اچاٹ ہو گیا۔لو میں ابھی تمہاری اس پریشانی کا
حل نکال دیتا ہوں۔وہ اپنے کمرے میں گیا اور ایک فون نمبر دے کر کہا۔’’یہ اظہار حیدر کا نمبر
ہے۔اگر تم نے ریڈیو ابوظہبی کی اردو سروس سنی ہو تو شاید تم نے ان کا نام بھی سنا ہو۔یہ بلدیہ میں
انجینئر ہیں۔شاعر ہونے کیساتھ ساتھ رفاہی کاموں میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔انہیں فون
کرو۔۔۔اللہ حافظ‘‘ سلیم یہ کہہ کر چلا گیا اور نوازش نے بلا تاخیر اظہار حیدر کو فون کر کے اپنا مدعا
بیان کر دیا۔انہوں نے جواباً ایک پیجر نمبر دیا اور کہا کہ چودھری رشید آپ کو فون کریں گے۔۔انہیں
اپنی پرابلم بتایئے۔یہ ہمارے ہاں کے عبدالستار ایدھی ہیں۔۔۔نوازش کے پیجر کرنے کے چند
منٹ بعد ہی چودھری رشید کا فون آ گیا۔نوازش نے انہیں لوکیشن بتائی۔۔۔ابھی اس نے فون بند
ہی کیا تھا کہ جاوید خان کھلا دروازہ دیکھ کر اندر آ گیا۔آج وہ پہلی بار اس کے پاس آیا تھا۔ویسے تو
ان میں علیک سلیک بھی کم ہی تھی۔مگر اس موقع پر اس کے پاس پرسے کے لئے جو بھی آتا
تھا۔اسے بہت اچھا لگتا تھا۔وہ اٹھ کر اس سے ملا۔جاوید خان نے چھوٹتے ہی کہا۔’’بھائی برا نہ
ماننا۔ہم ان پڑھ پٹھان جنہیں تم پتہ نہیں کیا کیا کہتے ہو۔فلموں میں تم ہمارے ذریعے مذاق پیدا
کرتے ہو۔ہم پٹھان تم لوگوں سے ہزار بہتر ہیں۔ہمارے اندر کوئی نہ کوئی اتفاق تو ہے۔تم بتاؤ
تمہارا کس بات پر اتفاق ہے۔تم پنجابی پنجابی کا دشمن ہے۔ہمارے اندر بھی دشمنیاں ہیں۔پر ہمارا
برادری کا جو بڑا ہے نا ہم سب اس کا پابندی کرتا ہے۔تم لوگوں میں کوئی اتفاق نہیں۔۔۔۔۔۔‘‘

وہ پتہ نہیں کیا کیا کہتا رہا۔ نوازش چپ چاپ سنتا گیا کیونکہ کسی بھی تعصب سے قطع نظر اس کی باتیں غلط نہ تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''۔۔۔ ہماری ہر برادری میں دس روپے مہینہ ہر کوئی جمع کرواتا ہے۔ ماڑا یہ دس روپے کیا ہوتے ہیں۔ یہ قطرہ قطرہ اس وقت دریا بن جاتا ہے جب کوئی مشکل آتا ہے۔ کوئی مر جائے کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ پتہ ہے مرنے والے کے تمام اخراجات اسی دریا سے پورے کئے جاتے ہیں اور ادھر آدمی مرا ادھر اس کی میت باہر۔۔۔ اس کے ساتھ ایک سواری کا ٹکٹ اور دو لاکھ پاکستانی روپے۔۔ کا ڈرافٹ مرنے والے کے گھر پہنچ جاتا ہے۔۔ یرا (یار) دس روپے (درہم) کیا چیز ہے۔۔۔ یہ غلام حسن بدنصیب اتنے دن سے سلا جے میں پڑا ہے۔۔ اگر کوئی پٹھان ہوتا تو اس کی باڈی اب تک پاکستان میں بھی پہنچ گئی ہوتی۔'' پھر اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یرا تم لوگ تو پڑھا لکھا ہے سمجھتا کیوں نہیں۔ عقل کرو، کچھ کرو۔ آپس میں نہیں تو ہمارے ساتھ مل جاؤ۔ دس درہم مہینے کے دیو۔'' جاوید خان کی بات درست تھی۔ یہاں پر پختونوں کی مختلف برادریوں نے امداد باہمی کے تحت ہمیشہ پاکستانیوں کی دیگر قومیتوں کی نسبت زیادہ مستعدی دکھائی تھی۔ ائر لائنز کی طرف سے پاکستان تک میت کی بغیر کسی معاوضے کے ترسیل کی سہولت بھی انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ جاوید خان کے جانے کے بعد ایک کارپینٹر جمیل نے دروازے پر دستک دی۔ ''میں آج ہی پاکستان سے آیا ہوں تو غلام حسن کا پتہ چلا۔۔۔ بس اللہ کی مرضی' میرے لائق کوئی خدمت؟'' نوازش نے درپیش مسئلہ بتایا۔ اس کی باتیں سن کر وہ، ابھی آیا' کہہ کر اٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اس نے بتایا کہ غلام حسن کے ساتھ اس نے کام کیا تھا۔ اس کی کمیشن کی رقم چار ہزار درھم، میرے پاس ہے۔ اسی دوران چودھری رشید بھی آ گئے۔ اور ان کی مشاورت پر جمیل نے تین ہزار درھم چودھری رشید کے حوالے کئے اور نوازش نے باقی رقم پاکستان اس کی والدہ کو بھیجنے کیلئے ان کا پتہ دے دیا۔ یوں خدا خدا کر کے غلام حسن کی میت کے معاملات تمام ہوئے اور یہ غمناک باب بند ہوا۔

☆☆☆

ہفتے کی آخری شام تھی۔ وہ دونوں بغیر کسی پلاننگ کے شام خیزی کے لئے نکلے تھے۔ شاہدہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ابوظبی شہر سے کوئی دس بارہ کلومیٹر باہر زیر تعمیر نیو کارنش، شاطی الراحہ۔۔۔ کے قریب سے گزرتے ہوئے شاہدہ نے کہا۔ '' کتنا خوبصورت

ساحل ہے۔'' نوازش چپ تھا۔ شاہدہ نے اپنی بات جاری رکھی۔
''پیسے کی باتیں ہیں۔'' نوازش گاڑی چلانے میں منہمک تھا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاہدہ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ذرا دیر کے لئے یہاں رکیں؟''
نوازش نے کچھ کہے بغیر گاڑی سڑک کے کنارے ریل پر اتار کر روک لی۔
--------- ریت پر چلتے چلتے شاہدہ نے سمندر کنارے دور دور تک بکھرے تودہ نما پتھروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''تمہیں پتہ ہے یہ پتھر کہاں سے آئے ہیں۔۔''
''جنت سے!!''
مذاق نہیں۔۔۔ یہ پتھر راس الخیمہ کے پہاڑوں۔۔۔۔'' شاہدہ نے بھولپن سے کہا۔ ''ارے یار یہ پتھر بحری جہازوں اور ٹرالوں پر آئے ہیں۔۔۔ اتنے پتھر، سمندر کا کنارہ پکا کرنے کے لئے۔ یوں ہی سمجھو کہ یہ پتھر نہیں درہم ہیں۔ درہم!!۔۔۔'' وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔ نوازش اس کی یہ غیر رومانی، خالصتاً کاروباری گفتگو سن کر بور ہو رہا تھا مگر شاہدہ کو شاید اس امر کا احساس نہیں تھا۔ بالآخر نوازش نے کہا۔ ''یار مجھے ان پتھروں کی آمد و رفت سے کوئی، بلکہ قطعاً دلچسپی نہیں کیونکہ ہم کسی سٹڈی ٹور پر نہیں آئے اور نہ ہی ہم کوئی feasibility بنانے آئے ہیں۔''
''اچھا بابا۔۔۔'' وہ چپ کر گئی۔ نوازش نے چند لمحے اس کی چپ ٹوٹنے کا انتظار کیا۔ مگر وہ مسلسل چپ تھی۔ نوازش نے اسے منانے والے انداز میں کہا۔ ''بُرا مان گئی؟''
''نہیں تو۔'' شاہدہ نے عمومی انداز میں کہا اس کے لہجے میں کوئی ناراضی نہ تھی۔ نوازش نے کہا۔ ''پھر چپ کیوں کر گئی، کوئی بات کرو۔۔ کوئی خوشبو جیسی۔۔!!''
شاہدہ کو شرارت سوجھی اور اس نے اپنے پرس سے پرفیوم نکال کر اس کی طرف سپرے کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ پتھر تمہیں۔۔۔۔''
نوازش نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ ''شاہدہ ہ ہ!!'' وہ شوخی سے ہنس پڑی۔ ''تمہیں نے تو کہا ہے کہ کوئی خوشبو جیسی بات کروں۔۔۔ خوشبو آئی؟'' اس نے سر اس کے قریب کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ نوازش اس کی اس ادا پر مچل گیا اور بلا سوچے سمجھے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے کاسے میں لے لیا۔ اس کی ہتھیلیاں شاہدہ کے گالوں کا لمس لے رہی تھیں۔ شاہدہ ایک دم جھنجلا گئی۔۔۔ کیا کرے؟ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردعمل سوچتی، نوازش کو خود احساس ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ اس کے چہرے سے گرا دیئے۔ یہ سب کچھ چند ساعتوں

کے لئے ہوا۔۔۔ دونوں سمندر کنارے چل رہے تھے، آہستہ آہستہ، دونوں چپ تھے۔ نوازش سوچ رہا تھا کیا بات کرے۔ کیونکہ یہ چپ اس کے احساس پر بوجھ بنتی جا رہی تھی۔ شاہدہ نے ابھی تک کوئی ردعمل نہیں ظاہر کیا تھا۔ اس کا ردعمل کیا ہے؟ وہ یہ بھی جاننا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ بمشکل خفیف سے لہجے میں یہی کہہ پایا۔

"میرا خیال ہے یہیں جوتے اتار دیں" جواباً شاہدہ نے "ٹھیک ہے" کہہ کر جوتے اتار دیئے۔ کیونکہ اس کے پاؤں گیلی ریت میں دھنس رہے تھے۔ نوازش کی نظر غیر ارادی طور پر اس کے سفید دودھیا پاؤں پر پڑی اور جم گئی۔ ایک لمحے کو اسے یوں محسوس ہوا جیسے چاندنی اس کے پیروں میں اتر آئی ہو۔

"آپ کے پاؤں بڑے خوبصورت ہیں۔۔۔" نوازش نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"انہیں زمین پر مت اتاریئے گا میلے ہو جائیں گے۔!!" شاہدہ نے اسے لہجے میں جملہ آگے بڑھایا۔ اور ہنس دی۔ نوازش کو اس کی ہنسی پر معاً پیار آ گیا۔ اب وہ نارمل ہو چکا تھا بلکہ حوصلہ پا چکا تھا۔ اسی انداز کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "زمین پر تو اتر چکے ہیں اور میلے بھی ہو چکے ہیں۔ مگر وہ حسن ہی کیا جو میلا ہو جائے۔ حسن تو کنول کے پھول کی صورت ہوتا ہے۔ میلے کچیلے پانی میں، کیچڑ میں بھی اپنا حسن اور معصومیت یوں برقرار رکھتا ہے۔۔ لوگ مثالیں دیتے ہیں اس کی پاکیزگی کی، حسن کی۔" اب کے اس کا لہجہ گمبھیر اور رومان پرور تھا۔

"کیا پاؤں واقعی خوبصورت ہوتے ہیں۔" شاہدہ نے کسی نو آموز کی طرح بڑی معصومیت سے پوچھا۔ نوازش نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "دراصل جو پیارا لگتا ہے نا اس کے پاؤں ۔۔۔ بلکہ جو پیارا لگتا ہے اس کی ہر چیز، ہر ادا، ہر بات پیاری لگتی ہے۔۔۔ محبوب کی بات باتوں کی محبوب ہوتی ہے۔"

شاہدہ نے کہا۔ "یہ تو تم نے واصف صاحب کی بات کا چربہ کیا ہے۔ جیسے انہوں نے کہا ہے کہ پیغمبر کی بات باتوں کی پیغمبر ہوتی ہے۔"

"یہ واصف صاحب کون ہیں۔ میں نے پہلے بھی ان کا نام کہیں سنا ہے۔" نوازش نے دریافت کیا۔

"مجھی سے سنا ہوگا۔" شاہدہ نے کہا۔

"ہاں یاد آیا تم نے ایک دفعہ ان کا کوئی جملہ۔۔۔۔" نوازش نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں یاد

آ گیا۔ ان کا ایک جملہ سنایا تھا۔ ''جب نبی کی نبوت موروثی ہیں تو اولیاء کی وراثت کس طرح موروثی ہوئی؟ گدی نشینی کا تصور، غور طلب ہے۔''

''ہاں وہی واصف صاحب جن کا کہنا ہے کہ۔۔۔۔ اتنا پھیلو کہ سمٹنا مشکل نہ ہو۔ اتنا حاصل کرو کہ چھوڑتے وقت تکلیف نہ ہو۔''

''ویسے یہ صاحب کون ہیں۔؟'' نوازش نے بے چینی سے پوچھا۔

''کوئی انہیں ولی کہتا ہے کوئی انہیں قطب کوئی ابدال، کوئی غوث۔۔۔ علی ہذ القیاس ہر کوئی انہیں اپنے اپنے علم، اور اعتقاد اور عقیدت کے مطابق انہیں دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔''

شاہدہ نے جواب دیا۔ ساتھ چلتے چلتے نوازش نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا'' تمہارا کیا خیال ہے؟''

''واصف صاحب ایک دردمند اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔'' شاہدہ نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد اس نے مزید کہا'' واصف صاحب ایک نیک انسان ہیں۔۔ ہے نا؟'

''نیکی کا معیار ہر کسی کے نزدیک مختلف ہے۔'' نوازش نے فکر انگیز لہجے میں کہا۔

''مثلاً'' شاہدہ نے تفصیل چاہی۔

نوازش نے کہا'' مثلاً بعض لوگوں کے نزدیک نیک آدمی وہ ہے جو باقاعدہ نماز پڑھتا ہے حج کرتا ہے۔ زکوٰۃ دیتا ہے۔ لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتا ہے۔ مگر خود وہی کرتا ہے جو اس کا جی چاہتا ہے۔

شاہدہ نے کہا۔ ''مگر میرا خیال ہے کہ جو جنت کے لالچ میں اور دنیوی عزت کے لئے نیک کام کرتا ہے وہ ریاکار ہے، خود غرض ہے، ایسا انسان نیک نہیں ہوسکتا۔ میری فہرست میں صرف وہ انسان نیک ہے جو دردمند ہے، انسانوں کے دکھ اسے بے چین رکھتے ہیں۔ جو دامے درہے، قدمے سخنے، لوگوں کی مدد کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔۔۔۔۔ واصف صاحب نیک انسان ہیں۔ وہ لوگوں کو بکھرنے سے بچالیتے ہیں ٹوٹنے نہیں دیتے۔'' شاہدہ کے لہجے میں گداز اور آنکھوں میں نمی اتر آئی جسے نوازش نہ محسوس کر سکا اور شاہدہ نے اپنی کیفیت پر جلد ہی قابو پالیا۔

''گویا واصف صاحب تمہاری نظر میں نیک انسان ہیں۔''

نوازش نے پوچھا۔ شاہدہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے ان کا پتہ دینا۔۔۔۔ عجیب بات ہے۔۔ کتنے افسوس کا مقام ہے۔ لاہور میں رہتے ہوئے

بھی میں۔۔" نوازش کے لہجے میں تأسف سا تھا۔
شاہدہ نے کہا۔" میرا خیال ہے بات افسوس کی نہیں بلکہ اپنی دلچسپی اور ضرورت کی ہوتی ہے۔۔تمہیں دلچسپی نہیں ہوگی ایسے لوگوں سے، جن کی باتیں عقل ودانش کی گتھیاں سلجھاتی ہیں یا پھر تمہیں ضرورت نہیں پڑی ہوگی۔"
نوازش نے کہا۔"نہیں جان ایسی بات۔۔۔۔۔۔۔!" نوازش کے اس تخاطب پر شاہدہ ایک دم چونکی، اس کے قدم رک گئے۔اور نوازش کے چہرے پر ایکدم گھبراہٹ اور بے بسی کے آثار نمایاں ہوگئے وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔شاہدہ کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔اس لمحے میں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔وہ کوئی بھی فیصلہ کرسکتی تھی۔ابھی تک وہ جو پیش دستی کر چکا تھا وہ کم نہیں تھی۔۔مگر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے یا اس سے یہ سب کچھ کیوں سرزد ہو رہا ہے۔ایسی حرکتیں تو کبھی بھی اس کا شِعار نہیں رہیں۔وہ اپنے اندر ہی اندر الجھ کر رہ گیا تھا۔وہ اپنے آپ کو بے جان سا محسوس کر رہا تھا۔مگر یہ لمحہ۔۔۔اتنا پھیل گیا تھا کہ گزر ہی نہیں رہا تھا۔اس کے چہرے پر احساس مجرمانہ صاف جھلک رہا تھا۔۔۔۔اور پھر وہ لمحہ گزر گیا۔۔۔۔شاہدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ہنستے ہنستے دہری ہوگئی۔نوازش کو یوں لگا جیسے کہ اس کے احساس وجود سے پہاڑوں کا بوجھ سرک کر نیچے گر گیا ہو۔ایک لمبی سی سانس لے کر وہ گھٹنوں کے بل ریت پر گر گیا۔شاہدہ نے جھک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑی اپنائیت سے پوچھا۔"کیا ہوا؟ برسوں کے بیمار لگ رہے ہو۔ہوں؟۔اٹھو!" اور نوازش اٹھ کھڑا ہوا۔وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ شاہدہ نے کہنا شروع کیا۔"تم ایک سچے انسان ہو۔مگر تمہارا دل بڑا کمزور ہے نوازش۔سچ کو ہضم نہیں کرسکتا فوراً اُگل باہر کرتا ہے۔"
نوازش نے لہراتی نظروں سے اسے دیکھا، بہت پیارے، اس لمحے وہ اسے بہت پیاری لگی۔شاہدہ کی نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائیں، اور وہ ذرا جھینپ سی گئی۔نوازش بھی کچھ نہ کہہ سکا اور وہ بھی چپ رہی۔

اب دونوں گیلی ریت پر ننگے پاؤں چل رہے تھے سرد ہوا اور ڈوبتا سورج۔۔اچانک اس کا دل زور سے دھڑکا۔۔کس کے لئے؟؟۔۔اس نے خود سے پوچھا۔۔مگر خود نے کہا، مجھے کیا پتہ، دل سے پوچھو!۔۔۔اور دل نے شاہدہ کا نام لے دیا۔۔۔۔ریت پر وہ اپنے قدموں کے نشان چھوڑتے ہوئے دونوں اپنی اپنی سوچوں میں غرق تھے، ٹہلنا ان کا غیر ارادی فعل بن گیا تھا۔بالآخر نوازش نے خود کو سوچوں کے بھنور سے نکالا اور شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" کیا

سوچ رہی ہو۔"
مجھے یہ منظر بہت پسند ہے۔۔۔ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر"
اچھا۔۔کیوں؟"نوازش نے پوچھا۔
شاہدہ نے رخ سے اپنی ہوا میں اڑتی ہوئی زلفوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے کہا"بس یونہی"
"یہ یونہی، کیا بات ہوئی؟ پسند کی کوئی نہ کوئی تو وجہ ہوتی ہے۔" نوازش اب نارمل ہو چکا تھا۔ بلکہ شاہدہ کے رویے نے اسے نارمل کر دیا تھا۔
"ہاں مگر ضروری نہیں کہ ہر وجہ بتائی بھی جائے"شاہدہ نے کہا۔
نوازش نے کہا۔"ویسے یہ منظر مجھے بھی بہت پسند ہے۔۔۔لیکن اس پسند کی میرے پاس ایک وجہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاہدہ پوچھے گی۔ کہ کیا وجہ ہے۔ مگر اس نے کچھ نہ پوچھا۔ چنانچہ نوازش نے خود ہی کہنا شروع کیا۔"اس منظر میں زندگی کا فلسفہ پوشیدہ ہے"
"ہوں ں ں۔۔۔۔۔۔فلسفہ!" شاہدہ نے ناگواری کا اظہار کیا۔ مگر نوازش نے اسے نظر انداز کر کے بات جاری رکھی۔"تم دیکھ رہی ہو یہاں سے سیکڑوں، لاکھوں بلکہ شاید کروڑوں میل دور سمندر کا وہ کنارا جو در حقیقت ایک سراب ہے، مگر اس سراب میں ایک حقیقت یعنی سورج غروب ہو رہا ہے۔ کتنی حیران کن بات ہے کہ ایک حقیقت کتنی آمادگی اور سپردگی کے ساتھ ایک سراب میں گم ہو جاتی ہے۔"
شاہدہ نے پوچھا"تو اس میں سے تم نے کون سا فلسفہ کشید کیا ہے۔؟ شاہدہ نے حجت کی۔ نوازش نے گہری سنجیدگی سے کہا"یہی کہ انسان سراب کے بغیر حقیقت کا ادراک اور عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔"
"آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" شاہدہ میں روایتی بے باکی پھر سے عود کر آئی۔

اب سورج غروب ہو گیا تھا۔ سرمہ آسا شام دھیرے دھیرے رات کے آنگن میں اترتی جا رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ پارکنگ کے پاس چلے آئے۔ نوازش نے گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر آسمان کی طرف دیکھا۔"اب تم کہو گے کہ تمہیں شام کے ساتھ ساتھ چاندنی رات بھی بہت پسند ہے۔" شاہدہ نے شوخی سے کہا۔

نوازش نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''ہاں نا!! ساحل کی چاندنی رات مجھے بہت پسند ہے۔''
''اچھا! وہ کیوں بھئی؟ ۔۔۔'' شاہدہ کے لہجے میں شوخی برقرار تھی۔
''اس لئے میں کہ میں نے سنا ہے کہ چاندنی راتوں کو یہاں پر آسمان سے محبتوں کے آسیب اترتے ہیں اور کنواری لڑکیوں کے اعصاب پر طاری ہو جاتے ہیں''
شاہدہ یہ سنکر ایک بار پھر جھینپ کر ہنس دی۔ نوازش کو ایک پنجابی فلمی گیت کا مکھڑا یاد آ گیا۔

ہاے بلھیاں توں اُڈ کے تیرے نی عرشاں دے تارے بن گئے
جیہڑے نیویں پا کے ہسدی دے ڈلھ گئے اوچل پیارے پیارے بن گئے

وہ نوجوانی میں جب بھی یہ گیت سنتا تھا تو اس شعر کی تمثیل کا تصور کیا کرتا۔ یہ شعر آج سراپا بن کر اسکے سامنے شاہدہ کی صورت میں موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں شاہدہ کا پورا وجود رقص کر رہا تھا شاہدہ کی جھینپ کی لطیف سی کھنک اور پھر اس قہقہے ۔۔۔ اس کے من مندر میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ شام نے رات کے آنگن میں پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ اس کے روم روم میں ایک بھینی بھینی سے خوشبو رچ بس گئی تھی۔
''میرا خیال ہے چلیں۔'' شاہدہ نے کہا اور نوازش کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف اس کی طرف دیکھ کر، آگے بڑھ گیا۔
''کیا دیکھ رہے ہو؟'' شاہدہ نے انجان لہجے میں پوچھا۔ نوازش نے پھر اس کی طرف دیکھا ایک عجیب سی نظروں سے ۔۔ اُس کا اس طرح دیکھنا، شاہدہ نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

یہ کن نظروں سے تو نے آج دیکھا
یہ تیرا دیکھنا، دیکھا نہ جائے

شاہدہ نے کچھ بلکہ سب کچھ، سمجھ لیا ۔۔۔ عورت سب کچھ سمجھ لیتی ہے۔ مرد اس معاملے میں کم آمیز کم فہم واقع ہوا ہے ۔۔۔۔۔ مگر اس نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''بابا کیا دیکھ رہے ہو۔''
''میں حسن کی معصوم ادا دیکھ رہا ہوں۔'' نوازش نے خوابیدہ لہجے میں کہا۔
''اچھا جی ی ی ی!!!'' وہ چہکتے ہوئے بولی ۔۔۔۔۔
اب دونوں کے درمیان چپ تھی گاڑی میں بیٹھ کر ابوظہی تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔
سلیم خاں ۔۔ غلام حسن کے جانے کے بعد دوسرا پاکستانی تھا جس کے ساتھ نوازش کی

بات چلتی تھی، خاص طور پر جب سے اس نے نوازش کو غلام حسن کی میت کے سلسلے میں اظہار حیدر کی راہ دکھائی تھی تب سے وہ دونوں قریب آ گئے تھے۔۔۔۔ وہ شائستہ اور نہایت نستعلیق لہجے والا، دراز قامت، اکہرے بدن کا مالک تھا۔۔۔ مسلسل پان خوری کے باعث کتھئی ہونٹ ۔۔۔۔۔سب نے مل کر اس کی پشتونیت کو چھپا رکھا تھا۔ آباؤ اجداد کا وطن افغانستان تھا۔ اس کی پیدائش پشاور میں ہوئی تھی۔ میٹرک تک راولپنڈی میں رہا۔ ہیلی کالج، پنجاب یونیورسٹی سے بی کام آنرز اور آئی بی اے کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا۔ والد قالینوں کے تاجر تھے مگر تجارت اس کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ کراچی کے پوش علاقے ڈیفنس میں گھر تھا۔ اکثر اردو بولتا تھا مگر پنجابی کا لہجہ بھی ٹھیٹھ ایسا کہ کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ یہی صورت حال پشتو اور پوٹھوہاری کی تھی۔ اپنی اس مہارت کا وہ اس کا جائز و ناجائز۔۔۔ خوب فائدہ اٹھاتا۔ پنجابیوں میں پنجابی بول کر اور اردو والوں کے ساتھ اردو بول کر اور پٹھانوں میں پشتو بول کر اپنا کام نکالتا تھا۔ بعض اوقات اردو بولنے والے اس کے سامنے پنجابیوں کا اور پنجابی اسکے سامنے اردو والوں کا مذاق اڑاتے اور یہ تجاہلِ عارفانہ سے دونوں کا لطف لیتا۔

نوازش نے ایک دفعہ سلیم کو سرِ راہ چلتے ہوئے پوچھا۔ ''سناؤ پاکستانی سکول کا کیا حال ہے۔'' اس نے بغیر سوچے جواب دیا۔ ''وہی جو پاکستان کا ہے'' اس مختصر مگر جامع جملے نے اس کی نظر میں پاکستانی مدرسے کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ اور اسی جملے سے نوازش کو اس کے مزاج سے آگہی ملی۔

سلیم کبھی کبھار اسے ساتھ لے کر پاکستانی اداروں۔۔۔ مرکز پاکستان، پاکستانی سکول، پاکستان ایمبیسی۔۔۔۔۔۔۔ کی تقریبات میں لے جاتا۔ اس طرح نوازش کو یہاں پر موجود پاکستانیوں کے شب و روز کا پتہ چلا۔ شروع شروع میں تو وہ باقاعدہ وقت نکال کر ان تقریبات میں جایا کرتا مگر آہستہ آہستہ جب اس پر ان تقریبات کی غرض و غایت۔۔۔۔۔ خود نمائی اور خود افزائی۔۔۔ کھلی تو اس کو بیزاری سی ہونے لگی۔ خاص طور پر گھریلو نشستوں میں جانا اس نے بہت حد تک کم کر دیا تھا۔ شاہدہ بھی کہ مشاعروں کی شوقین تھی۔ وہ باہتمام مشاعروں میں جاتی تھی مگر ان مشاعروں کا ماحول اسے بھی بیزار کر گیا۔ البتہ کبھی کبھار، جب کوئی مشہور ادبی شخصیت پاکستان سے یہاں مہمان آتی تو وہ دونوں اسے سننے کے لئے چلے جاتے کیونکہ اس نے ڈرائیونگ لائسنس مل گیا تھا اس لئے شاہدہ بھی اس کے ساتھ چلی جاتی۔ جب سلیم خاں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بھرپور

گفتگو اور نشست ضرور ہوتی۔ شاہدہ اور سلیم کا مزاج بہت ملتا تھا۔ وہ فن و ادب میں درک رکھتا تھا۔ نوازش کبھی فرصت کے اوقات میں اس سے گفتگو کر کے فکری آسودگی محسوس کرتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کراچی میں مہاجر قومی موومنٹ نے سیاسی جماعت کا لبادہ نہیں اوڑھا تھا۔ کیونکہ نوازش کے والدین نے بھی پاکستان کے لئے اس علاقے سے ہجرت کی تھی جو کہ ہندوستان میں شامل ہو گیا تھا مگر اس نے اپنے آپ کو کبھی مہاجر نہیں سمجھا تھا اور نہ کبھی کسی نے اسے مہاجر کہا تھا۔ اس لئے وہ جن دنوں کراچی میں رہا تھا۔ اس نے پہلی دفعہ وہاں کے لوگوں کو اپنے آپ کو مہاجر کہتے سنا تھا۔ نوازش کو لفظ مہاجر پر شروع دن سے عتراض تھا۔، نوازش کو اندازہ تھا کہ سلیم بنگش اس موومنٹ کے بارے میں دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے۔ ایک دن جب کسی بات پر کراچی اور کراچی کے حوالے سے مہاجر کا تذکرہ آ گیا تو اس نے اپنے مؤقف اور مہاجر قومی موومنٹ کے بارے میں اپنے تحفظات کا ذکر کر دیا۔ چنانچہ سلیم نے مذکورہ تحریک کے نفسیاتی محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ ”نوازش بھائی آپ مہاجروں کی محرومیوں اور احساسات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔۔ پنجاب کے مہاجروں اور کراچی کے مہاجروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پنجاب پاکستان میں بھی ہے جس کی زبان پنجابی ہے جبکہ اتر پردیش، اودھ یا دہلی پاکستان میں نہیں۔ پاکستان میں ایک ایسا خطہ ہے جس کی زبان پنجابی ہے۔ مگر اردو پاکستان کے کسی خطے کی زبان نہیں ہے۔ چنانچہ مہاجروں کے پاس اس بھرم کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی زبان پاکستان کی قومی زبان ہے۔۔ البتہ ان کی یہ محرومی اپنی جگہ برقرار ہے کہ ان کے پاس کوئی خطہ ایسا نہیں جس کی زبان اردو ہو۔ دوسری طرف دیگر صوبائی قومیت کے حامل بعض طبقوں میں بعض ناعاقبت اندیشوں نے اس تعصب کو ہوا دی ہے کہ پاکستان میں اس زبان کو قومی کیوں قرار دیا گیا جو کسی خطے کی زبان ہی نہیں۔ چنانچہ یہ زبان وفاق پاکستان کو کمزور کرنے کا باعث ہے۔ اس مؤقف کی حمایت میں وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔!“

سلیم کی اناطول گفتگو میں اس کا پاکستانیات کا گہرا مطالعہ جھلکتا تھا۔ بات لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ذرا سانس لینے کو رکا تو نوازش نے گفتگو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ”مگر سلیم بھائی یہ تو مسائل ہیں اور مان لیا یہ ان وجوہات ساری کی ساری درست ہیں مگر ان حالات میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے۔“

سلیم نے فوراً جواب دیا۔ ”ان مسائل کا حل ہر ذی شعور شہری (پاکستانی) جانتا ہے۔“

''پھر مشکل کیا ہے۔؟''نوازش نے پوچھا۔
سلیم کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے نقوش ابھرے،اس نے کہا۔'' عدل، انصاف اور احسان۔۔۔اور بس!''
''کون کرے گا۔۔عدل قائم،کون انصاف کرے گا۔اوراحسان کیسے ہوگا۔''سلیم نے سوال کیا۔
''اس کا مظاہرہ اربابِ اختیار کی طرف سے ہونا چاہے کیا جائے گا۔''
'عوام کا اس میں کوئی کردار نہیں؟''نوازش نے پوچھا۔
اس نے چشمہ درست کرتے ہوئے کہا''نوازش بھائی!عوام اپنا کردار مسلسل ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔انہوں نے ہر مشکل اور آزمائش کی گھڑی میں اتحاد،ایثار،قربانی اور حق گوئی کی اعلیٰ وارفع داستانیں رقم کی ہیں۔اب گیند اربابِ اختیار کی کورٹ میں ہے۔انہیں اپنا قرض فرض سمجھ کر ادا کرنا ہوگا ورنہ تنگ آمد بجنگ آمد۔۔۔۔۔۔

پرانے سفیر کے تبادلے کے بعد جو نئے سفیر آئے وہ 'عزت مآب' کم اور عزت دار زیادہ تھے۔انہوں نے اپنی تقرری کی اسناد پیش کرنے اور باضابطہ قلمدان سنبھالنے سے پہلے ہی، سب سے پہلا دورہ اسی مدرسے کا کیا۔ان دنوں مدرسے میں ہفتہء تقریبات کے سلسلے۔کالج کے خوبصورت ہال میں مشاعرے کا اہتمام تھا۔سلیم نے شاہدہ اور نوازش کو بھی اس مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی تھی۔
اردو نظم کی مشہور شاعرہ شارجہ کی ڈاکٹر ثروت زہراء مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دے رہی تھی۔صدر مشاعرہ شفیق سلیمی اور مہمان خصوصی سفیر پاکستان تھے۔
کیونکہ پاکستان میں مارشل لاء کا زمانہ تھا اس لئے تسنیم کا یہ شعر بڑی داد کے ساتھ سنا گیا

بستیوں میں تھی اگر امن کی خواہش تم کو
فوج کو جنگ کے میداں ہی میں رہنے دیتے

پردیس کے کرب کے حوالے سے یعقوب تصور کا شعر بہت گونجا

عمر ہماری صحراؤں میں ریت ہوئی
گھر والوں نے تاج محل تعمیر کیا

پہلوان نما شاعر اسلام عظمی کا یہ شعر بھی سراہا گیا

بہت کر لیں تو گر کو یاد کر لیتے ہیں ہم جیسے
گھروں کو لوٹ جاتے ہیں جنہیں گھر یاد رہتے ہیں

منظور حسرت کا ئی شعر حاضرین کو بہت بھایا۔

کب تک فراق یار میں آنکھوں کو نم کریں
پڑھ کر درود پاک ہی سینے پہ دم کریں

خورشید خان کے اس شعر اپنا نظریہ فن یوں بیان کیا

خورشید بھوکوں مرتے ہم شاعری کے ہاتھوں
گر زندگی کے ہم نے سیکھے ہنر نہ ہوتے

میر تنہا یوسفی نے ہجر کا کرب یوں بیان کیا

گھر لوٹ کے جانے کی مسافت میں نہیں ہیں
ہم ہجر کے برزخ میں ہیں ہجرت میں نہیں ہیں

اظہار حیدر کا یہ شعر مکرر سنا۔

آنکھوں میں انتظار کی شمعیں جلائیے
کس نے کہا تھا گھر لب دریا بنائیے

سلیم کی فرمائش پر شفیق سلیمی نے خاص طور پر جو غزل سنائی اس کا یہ شعر حاضرین میں بہت مقبول ہوا۔

محبت پارسائی کی ردا اوڑھے ہوئے ہے
بنام عشق یہ سودا بڑا مہنگا پڑا ہے

اس شعر پر نوازش نے شاہدہ کو جتلا کر اور دکھلا کر شاعر کو داد دی۔

مشاعرے کے اختتام پر نئے سفیر نے اپنے خطاب میں مشاعرے کے معیار اور شعراء کی ذہنی اپچ کے ساتھ ساتھ حاضرین کے ذوق سخن کی تعریف کرنے کے بعد بتایا کہ وہ نو سال پہلے ایک عام expatriat کی حیثیت سے تین سال کے لئے یہاں قیام کر چکے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جب وہ ایک عام پاکستانی کی حیثیت سے یہاں اپنے بچوں کو داخل کروانے آئے تھے تو ان کے ساتھ سکول کی انتظامیہ اور اہل کاروں کا یہ رویہ تھا کہ اس سے دل برداشتہ ہو کر انہوں نے اپنے بچوں کو ایک ایسے پرائیویٹ سکول میں داخل کروا دیا تھا جس کی انتظامیہ پاکستانی نہیں بلکہ انڈین

تھی۔۔انہوں نے اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کہا" یہاں آنے سے پہلے تعلیمی معاملات کے نگران نے مجھے 'سب اچھا ہے' کی رپورٹ دی تھی میں نے انہیں کہا کہ آپ سے زیادہ اس ادارے کے بارے میں میں جانتا ہوں۔ میں خود جا کر اس دیکھتا ہوں۔تو خواتین حضرات! آپ اس ادارے کی بہتری کیلئے اس کے الجھے معاملات کو سلجھانے اور اسکی خامیوں کی نشاندھی کریں۔ان کی دعوت پر سٹاف میں سے رضا کارانہ طور پر سلیم نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر اپنی گزارشات پیش کرنا شروع کیں:

۔" جناب عالی! کسی بھی ادارے کی smooth running کے لئے right man for the right job ۔' بنیادی اصول ہوتا ہے۔فرمان ہے کہ کفر کی حکومت چل سکتی ہے۔ظلم کی نہیں۔۔۔مدرسے کے اساتذہ قلیل تنخواہ کے باوجود اپنے بچوں کی فیس دیتے ہیں مگر ایمبیسی کے عملے کے بچے بغیر فیس کے پڑھتے ہیں۔

یوم پاکستان پر پنڈال بھرنے کے لئے ،قومی ترانہ پڑھنے کے لئے، ٹیلی ویژن کیمرہ میں حاضری دکھانے کے لئے سکول کے معزز اساتذہ اور شام کے وقت فائیو سٹار ہوٹل میں ضیافت کے لئے معزز پاکستانی، ان کی بیگمات۔جبکہ ایسی ضیافتوں کیلئے رقوم اسی پاکستانی ادارے سے ادا کی جاتی ہیں۔۔۔نااہل اور نا تجربہ کاروں کو اپنی قربت کے پیمانے پر پرکھ کر مدرسے کا مدیر المہام بنا دیا جاتا ہے۔ٹیچروں کی تنخواہیں قلیل اور گروپ فور کے ملازمین کی تنخواہیں زیادہ ہیں۔

پرنسپل کو طلبہ کی تعلیم و تربیت اور ادارے کی بہتری سے زیادہ حکام کی خوشنودی وراپنی ملازمت کی فکر زیادہ بے چین رکھتی ہے۔کوئی فیصلہ میرٹ پر نہیں ہوتا۔۔۔!!سلیم کی گزارشات کے دوران تالیاں بجتی رہیں اس نے دل ہی دل میں کہا،تم لوگ صرف تالیاں بجانے کے لئے پیدا کئے گئے ہو' اور ایک ناپسندیدہ نظر پنڈال پر ڈال کر کرسی پر بیٹھ گیا۔۔سفیر محترم نے ایجوکیشن قونصلر سے اساتذہ کے بچوں کی فیس اور ایمبیسی ملازمین کے بچوں کے بغیر فیس پڑھنے کا جواز پوچھا۔ہے۔اس پر موصوف نے اٹھ کر پہلے تو گھور کر سلیم کو دیکھا اور پھر گلہ کھنگار کر صاف کرتے ہوئے بولا۔" ایکسی لینسی !دراصل حکومت پاکستان کی طرف سے ہر ملازم کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے بیرون ملک پانچ ہزار ڈالر الاؤنس ملتا ہے مگر جن ملکوں میں پاکستانی تعلیمی ادارے قائم ہیں وہاں پر یہ الاؤنس نہیں ملتا۔اس لئے۔۔۔۔"

سفیر محترم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔" مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اساتذہ کے بچے

صرف فیس دے کر ہی پڑھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔"

واپس جاتے ہوئے شاہدہ نے راستے میں نوازش سے کہا۔"تم بڑے بے ایمان ہوتے جا رہے ہو۔"

نوازش نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔"یہ انکشاف تم پر کب ہوا؟"

"جب تم شفیق سلیمی کے شعر کی داد دے رہے تھے۔"

نوازش نے ہنستے ہوئے کہا۔"ارے بابا میں نہایت ایمانداری سے داد دے رہا تھا۔۔۔"

"کسے؟"شاہدہ نے اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"شاعر کو!"

"ہوں"

شفیق سلیمی کو؟"

"ہاں ظاہر ہے!"

شاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔"اور دیکھ کسے رہے تھے؟"

"اوہ!۔۔۔"نوازش اپنی چوری پکڑے جانے پر ذرا شرمندہ سا ہو گیا۔

"اوہ ہ ہ"شاہدہ نے اس کی نقل اتارتے ہوئے بائیں ہاتھ سے اسکے دائیں بازو پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا"باز آ جاؤ، ٹھرک جھاڑنے کا کوئی موقع نہیں جانے دیتے۔تم پر امارات کا اثر ہو گیا ہے ۔جب تم پاکستان سے آئے تھے کتنے اچھے بچے تھے۔۔۔۔۔"

نوازش نے اس کی بات اچکتے ہوئے کہا۔"مگر اب تم بڑے ہو گئے ہو۔۔۔۔۔یہی کہنا چاہتی ہو نا؟"

شاہدہ نے مصنوعی ناراضی سے اس کی طرف دیکھا اس نے بھی سڑک سے نظریں ہٹا کر شاہدہ کی طرف دیکھا۔شاہدہ مسکرا پڑی اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا یا شاید وہ کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔

نوازش شاہدہ کی ان باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔شاہدہ کا بات کرنے کا انداز دلبرانہ نہیں تھا۔وہ مذاق بھی نہیں کر رہی تھی۔اس کے لہجے میں ناراضی کا تاثر نہیں تھا۔مگر وہ کیا تھا جو اچھا لگ رہا تھا۔۔۔کیا یہی محبت ہے۔

اگلی صبح بنک میں شاہدہ نے دیکھا۔نوازش کی گلابی آنکھوں کے کہیں دور بیدارشی کا شائبہ ہو رہا تھا۔دن بھر ان میں کوئی بات نہ ہوئی۔بلکہ دوپہر کا کھانا بھی دونوں نے الگ الگ

کھایا۔ "گویا ناراضی شروع؟" نوازش نے دل میں سوچا۔ مگر یہ اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اگلے ہی دن ایک عورت جو کار لیزنگ کے لئے آئی تھی شاہدہ نے اسے نوازش کی طرف بھیج دیا۔ اور انٹر کام پر کہا۔ "لو! فرسٹریشن دور کرو۔"

خاتون مطلوبہ معلومات لے کر رخصت ہوئی تو شاہدہ نے انٹر کام پر پوچھا "پٹنے کی امید بنی کچھ؟" نوازش نے ہنستے ہوئے کہا "ارے وہ پاکستانی تھی اتنی عجلت میں پٹنے کی نہیں البتہ پٹنے کی امید ضرور کی جاسکتی ہے"۔

"کیوں بھئی؟" شاہدہ نے حیرانی سے پوچھا

"ارے وہ پاکستانی تھی اور پاکستانی لڑکیاں اتنی آسانی سے نہیں پٹا کرتیں۔" نوازش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بڑا تجربہ ہے۔۔۔" شاہدہ نے اسے چھیڑا

"تجربہ نہیں دراصل میں آج کل اسی کیفیت میں مبتلا ہوں۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ میں کئی دنوں سے ایک لڑکی کو میں دل میں اتارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اترتی ہی نہیں" نوازش نے جملہ مکمل کرتے ہوئے شرارت سے شاہدہ کی طرف دیکھا۔

شاہدہ کا رنگ حیا سے سرخ ہو گیا۔ مگر جلد ہی اس نے نارمل ہوتے ہوئے کہا۔ "تم جیسے بدمعاش کے دل میں کون اترے گا۔"

"اچھا خیر چھوڑو۔" نوازش نے بات کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا "ویسے آج شام کا کیا پروگرام ہے؟"

"کوئی خاص نہیں!!" اس نے عام انداز سے اور دوستانہ لہجے میں کہا۔ نوازش نے کہا "تو پھر شام میں ملتے ہیں تم سے کچھ مسائل پر، اہم مسائل پر گفتگو کرنی ہے۔"

"مگر اس شام والی اول فول نہیں چلے گی۔" شاہدہ نے تنبیہ کے انداز میں اسے خبردار کیا۔ 'بیزاری ہوتی ہے مجھے ایسی باتوں سے۔' نوازش نے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں بلکہ بہت ضروری بات ہے۔" اس کے بعد دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

شام کے وقت دونوں کار میں بیٹھے ویسٹ کارنش پر گھوم رہے تھے نوازش اس وقت

سنجیدہ تھا۔ سڑک سے نظریں ہٹا کر اس نے شاہدہ سے پوچھا "کہاں" "چلیں؟"
شاہدہ نے کہا "کہیں چلو جہاں کوئی نہ ہو۔"
"تو پھر قبرستان چلتے ہیں"
"کیوں؟" شاہدہ مسکرائی۔
نوازش نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہاں کوئی نہیں ہوگا بشرطیکہ کوئی میت نہ آئی ہو۔"
شاہدہ نے شگفتہ لہجے میں کہا "تمہیں پھر شام والا دورہ پڑنے والا ہے۔"
"نہیں!" اس نے گاڑی وہی گارڈن کی پارکنگ میں کھڑی کرتے ہوئے جیب سے ایک خط نکال کر شاہدہ کو دیتے ہوئے کہا "اسے پڑھو!! تمہیں مذاق سوجھا ہے اور ادھر اپنی جان پر بنی ہوئی ہے۔
شاہدہ نے کچھ کہے پوچھے بغیر خط پڑھنا شروع کر دیا۔

عزیزی نوازش علی! طولعمرہٗ
السلام علیکم۔ کئی روز پہلے تمہارا فون جو آیا تھا تو تمہاری والدہ نے تمہاری شادی کے لئے اپنی شدید خواہش کا اظہارر کیا تھا۔ شبیر کی شادی کے سلسلے میں تمہاری خالہ کے ہاں بھی بات ہو چکی ہے۔ آئندہ ماہ (چاند کی) بائیس تاریخ طے ہوئی ہے۔ تمہاری شادی کا فریضہ بھی ادا ہو جائے۔ اس سے قبل بھی تمہیں متعدد مرتبہ خطوط میں بھی لکھا جا چکا ہے کہ اگر تم نے وہاں کوئی لڑکی پسند کر رکھی ہے تو چند ایک شرائط کے ساتھ اسے بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔۔ مگر تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ ایسی کوئی بات نہیں اور دوسری یہ کہ تم عملی زندگی سے فرار چاہتے ہو۔
پیارے بیٹے! شاید اس بات کا ابھی تمہیں احساس نہیں کہ کچھ لوگوں نے اپنی خواہشوں کی ڈوریاں تم سے باندھ رکھی ہیں۔ بہر حال تم ہماری اولاد ہو۔ رقعہ ہذا کی غایت یہی ہے کہ تمہاری جملہ ہمشیرگان نے ایک لڑکی پسند کی ہے اب تمہاری باری ہے۔ لڑکی کے والدین کا کہنا ہے کہ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں انہیں کوئی اعتراض

نہیں۔ شبیر صرف بیس روز کے لئے آ رہا ہے۔ پھر یا قسمت یا نصیب
! اگر تم چاہو تو تم دونوں بھائیوں کی ایک ساتھ شادی ہو جائے۔
چنانچہ اب تم جلد از جلد اپنی آمد کے پروگرام کے بارے میں لکھو۔

فقط!!

تمہارا ابو

شاہدہ نے خط پڑھ کر کہا۔ ''خاصی گاڑھی اردو ہے۔ پھر اس نے ذرا توقف کیا اور خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے چھیڑا'' ۔۔ چڑھ جا بچہ سولی، رام بھلی کرے گا۔ نوازش نے کچھ نہ کہا۔ کار سے نکل کر وہ دونوں گارڈن کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ ''شاہدہ جی آج ذرا سیدھی سیدھی اور کھری کھری ہو جائیں۔ بالکل سنجیدہ سنجیدہ۔۔۔ ہونہہ!''
شاہدہ کے چہرے پر سنجیدگی کے نقوش ابھرے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
نوازش نے تاکیداً کہا ''مذاق بالکل نہیں''
شاہدہ نے دھیمے سے کہا بات کرو۔'' اس کے چہرے پر سنجیدگی برقرار تھی۔''
نوازش نے کہنا شروع کیا: ''دو برس ہونے کو آئے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ اٹھتے، بیٹھتے، ملتے ملاتے، اس دوران میں نے تمہیں یا تم نے مجھے کیسا پایا؟۔۔۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔۔۔ مجھے تم سے یا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟۔۔۔ یہ سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔ اس لئے میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ شاید تمہارے پاس ہو۔؟ مگر میرا خیال ہے تمہارے پاس بھی نہیں یا ہے بھی تو اتنا کہ تم کہو، میں نے تو کبھی اس پہلو کبھی سوچا ہی نہیں۔ اور سچ پوچھو تو میرے پاس بھی اس سوال کا یہی جواب ہے۔۔۔ البتہ تمہیں مل کر مجھے جو تسکین یا تسلی ہوتی ہے وہ کسی اور سے مل کر نہیں ہوتی اور تم سے ملنے سے پہلے تمہارا انتظار بہت بے قرار کرتا ہے۔ اگر اسی کو محبت کہتے ہیں تو پھر میں برملا کہنے کو تیار ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اب تم بتاؤ''
شاہدہ کے چہرے پر سنجیدگی کے نقوش اور گہرے ہوتے گئے۔ اس نے پوچھا ''کیا بتاؤں؟''
نوازش نے گمبھیر لہجے میں کہا:

میں ترا کچھ بھی نہیں ہوں مگر اتنا تو بتا
دیکھ کر مجھ کو ترے ذہن میں آتا کیا ہے

شعر سن کر شاہدہ نے کہا۔ ''شاعروں نے شعر کہہ کر اظہارِ محبت میں کافی آسانی پیدا

کردی ہے۔۔" اس کے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ جھلکی مگر جلد ہی گہری سنجیدگی میں ڈوب گئی۔اس نے نوازش کی باتیں بڑے غور سے سنی تھیں۔اس کے الفاظ کی سادگی، لہجے میں تیقن تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی اور دلکشی تھی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔" نوازش! میرا خیال ہے مجھے تمہارے خیالات سے متفق ہونے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہئے۔ یہ عمر ہے جب کہ ہم نوجوانی سے نکل کر جوانی میں ہیں، لڑکی، لڑکا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمارے معاشرے میں کب تک چل سکتے ہیں آخر کو کسی نہ کسی کو تو یہ سوچنا ہی پڑتا ہے۔ پہل کرنا ہی پڑتی ہے۔ عام طور پر یہ کام لڑکا ہی کرتا ہے سو تم نے کوئی عجیب کام نہیں کیا۔ البتہ اظہار کا طریقہ بڑا غیر روایتی ہے۔۔۔ بہر حال مجھے اچھا لگا۔"

نوازش کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ ابھری اس نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر تشکر کا اظہار کیا۔

شاہدہ نے اپنی بات جاری رکھی۔"۔۔۔۔ وہ شام۔۔۔!!!" اس نے نوازش کی طرف دیکھا۔ نوازش کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اس نے ہاتھ کا اشارہ کر کے اسے بات کاٹنے سے روکا اور بات جاری رکھی۔"۔۔۔ اس شام کا تاثر میرے احساس میں آج بھی تر و تازہ ہے۔ میں اسے دھندلانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ میری زندگی کی اچھوتی اور انوکھی شام تھی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں اس سے قبل کبھی کسی کے ساتھ شام خیزی یا آؤٹنگ کے لئے نہیں گئی۔ ایسا بے شمار مرتبہ ہوا، گرل فرینڈز، میل فرینڈز کے ساتھ، اکٹھے دوستوں کے ساتھ۔۔۔ کئی شامیں دریا کنارے، ساحل سمندر پر، باغوں میں، پہاڑوں پر۔ مگر وہ شام۔۔ نجانے کیوں میری زندگی کی ایک عجیب اور انوکھی بلکہ اچھوتی شام تھی۔ جس کا تاثر ہر آنے والے دن میں شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس شام میں نے تمہیں اپنے دل میں محسوس کیا تھا۔ میں تمہیں اسی طرح اپنے احساس میں زندہ رکھنا چاہتی تھی۔۔۔ بن کہے، بن سنے! مگر آج کی شام نے اس شام کے تاثر کا سارا تانا بانا یوں بکھیر دیا ہے جیسے بچہ۔۔۔ کوئی شرارتی بچہ موقع پا کر ادھ بُنا سویٹر ادھیڑ دے۔۔۔" یہ کہہ کر وہ ذرا دیر کو رکی تو نوازش کو بولنے کا موقع ملا۔

"اسی لئے میں نے زندگی کے اس اہم موڑ پر تم سے مشورہ طلب کیا ہے۔ تاکہ ان ادھوری ملاقاتوں کو ہوشمندی اور سوچ بچار کے ساتھ منطقی انجام تک پہنچایا جا سکے۔ تاکہ پھر اس کے بعد کوئی پچھتاوا یا ملال نہ رہے۔"

شاہدہ نے سر کو نفی میں جھٹکتے ہوئے کہا۔'' ہوشمندی اور سوچ بچار کے ساتھ کاروبار کیا جاتا ہے۔ محبت میں سود و زیاں تلاش کرنے والوں کے لئے اکثر محبت ناکامی اور نامرادی کا پیغام لے کر آتی ہے۔'' نوازش نے ماحول کی گمبھیرتا کو کم کرنے کے لئے پہلو بدلتے ہوئے کہا'' اچھا مجھے مشورہ دو۔۔ خط تم نے پڑھ لیا۔۔۔ میں کیا کروں؟'' نوازش کا خیال تھا کہ شاہدہ یقیناً اسے وہی مشورہ دے گی جو اس وقت اس کے دل کی دھڑکنوں میں گنگنا رہا تھا۔۔۔ مگر یہ کیا۔۔؟

شاہدہ نے بڑی ملائمت سے جواب دیا۔'' والدین کی خواہش کا احترام کرو۔۔ جاؤ اور جا کر شادی کرلو۔'' نوازش نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر اس کے الفاظ میں کہیں مذاق کا عنصر تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس کے چہرے پر سپاٹ سنجیدگی تھی۔ نوزش نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔'' یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

شاہدہ نے کہا'' فیصلہ نہیں، یاد رہے کہ تم نے مجھ سے مشورہ طلب کیا ہے۔''

نوازش نے کہا'' اور اگر میں تمہارا فیصلہ پوچھوں؟''

'' تو اسے میرا فیصلہ سمجھ لو۔'' شاہدہ نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔

'' اوہ نو وووو!!!'' نوازش نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

جواباً شاہدہ نے نہایت نرمی سے کہا۔'' او یس'' اور مسکرا دی۔

نوازش نے نامراد نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

شاہدہ نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔'' دیکھو، نوازش ابھی تم نے زندگی کا وہ چہرہ نہیں دیکھا۔ جو میں دیکھ چکی ہوں۔''

نوازش نے چڑتے ہوئے کہا۔'' کیا دیکھا ہے تم نے۔ ایک بیوروکریٹ کی بیٹی جس نے عیش و آسائش میں آنکھ کھولی۔ جس کے زندگی روزنامچے میں کہیں محرومی اور نارسائی کا لفظ نہیں ہے۔ وہ کیا سمجھے گی ہم متوسط طبقے کے لوگوں کی ترجیحات کو چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو، آرزوؤں کو۔۔۔''

نوازش شکست خوردگی کے احساس سے زچ تھا اس لئے بولتا گیا اور وہ سنتی رہی۔

جب نوازش چپ ہوا تو شاہدہ نے کہنا شروع کیا۔'' کیا محبت؟ بار بار تم محبت کی رٹ لگائے جا رہے ہو۔ تم جسے پوری محبت کہتے ہو وہ شادی کے بندھن میں گھٹ کر مر جاتی ہے۔ کاروبار بن جاتی ہے۔ قانون کی کتابوں میں اس نام نہاد پوری محبت کے لئے یہی الفاظ درج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لو میرج ناکامی، نفرت اور طلاق پر ختم ہوتی ہے۔۔۔ اور یہ جو تم مجھے بیوروکریٹ کی بیٹی

ہونے کا طعنہ دینے پر اتر آئے ہو تو سنو۔ میں کسی بیوروکریٹ کی بیٹی نہیں۔۔۔ میں ایک لومیرج کے نتیجے میں دو جسموں کے اتصال کا نتیجہ ہوں۔ شدید محبت کرنے والوں نے محبت پوری کرنے کے بعد ایک دوسرے سے تنگ آکر خودکشی کرلی۔۔۔ میں نے اپنی ماں اور باپ کی رومان بھری ڈائریاں پڑھی ہیں۔ شاید رومیو جولیٹ، ہیر رانجھا اور سسی پنوں کے درمیان بھی ایسی رومانی مکالمہ آرائی نہ ہوئی ہو جو ان ڈائریوں میں درج تھی۔ کہانی طویل ہے مگر نتیجہ۔۔۔؟''

نوازش اس کی جیون کتھا سن کر افسردہ اور متجسس ہو گیا۔ تھوڑی دیر دونوں میں خاموشی رہی۔ پھر نوازش نے منفعل سے لہجے میں پوچھا۔ ''مگر وہ بیوروکریٹ، اور ایگزٹ کنٹرول لسٹ۔۔۔؟''
شاہدہ نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''دنیا یہی جانتی ہے۔ مگر حقیقت وہی ہے جو میں نے صرف تمہیں بتائی ہے۔ عابد سعید انکل میرے ابو کے پرانے دوست اور انکی محبتوں کے شاہد تھے۔ انہوں نے مجھے گود لے لیا۔ ان دونوں نے تو یہ بھی نہیں سوچا۔ کہ وہ ایک دوسرے سے چھٹکارا پا رہے ہیں مگر یہ جو ننھی سی جان جسے اس دنیا میں لانے کے ذمہ دار وہ ہیں۔ اس کا کون ہے۔۔۔ انسان کتنا خود غرض ہے۔ کتنا غصیلہ ہے۔ کتنا جلد باز ہے۔۔'' بالآخر وہ چھلک پڑی۔!!!!

اس کے بعد دونوں میں اس موضوع یا واقعے پر کبھی بات نہ ہوئی تھی۔۔ جیسے وہ شام ان کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہ تھی۔ البتہ اب ان کی ملاقاتیں بے ترتیبی کا شکار ہو کر رہ گئیں۔ مگر ان کے تعلقات میں تعطل نہیں آنے پایا۔ اب بھی وہ ایک دوسرے سے ہنستے بولتے، بنک میں، کام کے اوقات میں، فراغت کے لمحات میں، ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوتیں۔ جملے بھی کہے جاتے ایک دوسرے کی باتوں کا لطف بھی لیا جاتا۔ مگر جو اس شام دونوں کے درمیان ہو چکی تھی اس کا ذکر کبھی نہ آیا۔ نہ ہی شاہدہ نے کوئی صفائی پیش کی اور نہ ہی نوازش نے کبھی اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کے لئے کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے نوازش نے اس کے موقف یا فیصلے کو دل سے تسلیم کر لیا تھا۔ نوازش کے اس رویے نے شاہدہ کی نظر میں اس کی شخصیت کو مزید جاذب اور پُرکشش بنا دیا تھا۔ شاہدہ اپنے اندر ہی اندر اس کے پیار میں الجھ چکی تھی۔ مگر اس الجھن میں سلجھن کا ایک ایسا سواد تھا کہ وہ اسی الجھن میں دلی طور پر خود کو آسودہ محسوس کرتی تھی۔

جب نوازش کی چھٹی منظور ہو گئی اور وہ جانے کی تیاری کرنے لگا تو وہ پیش پیش تھی۔ اس نے ایک زیور کا سیٹ اور انگوٹھی نوازش کی ہونے والی کے لئے تحفہ دیا تھا۔ پہلا تحفہ!۔۔۔ اس

نے بہتیرا کہا کہ ''ابھی تو۔۔۔'' مگر شاہدہ نے کہا تھا کہ اسے یقین ہے کہ لڑکی والے اسے ضرور پسند کرلیں گے۔ کیونکہ ایسا لڑکا انہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی بمشکل ہی ملے۔ اور خط میں اس کی شادی کے لئے جو اہل خانہ کی بیقراری جھلکتی ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ چٹ نکاح اور پٹ بیاہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے شادی کے لئے مطلوب سامان کی چن چن کر خود خریداری کروائی تھی۔

اور پھر وہ اداس شام آگئی جب نوازش پاکستان کے لئے روانہ ہو رہا تھا شاہدہ اسے رخصت کرنے کے لئے آئی تھی۔ چیک ان ہونے سے پہلے اس نے بھرپور نظروں سے شاہدہ کی طرف دیکھا۔ جو عابد علی عابد کے شعر کی تصویر نظر آرہی تھی۔

دم رخصت وہ چپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

شاہدہ کے قدموں میں ہلکی لرزش پیدا ہوئی۔۔۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ نوازش کے قریب آگئی۔۔ یہاں تک قریب کہ سانسوں سے سانس ٹکرا گئے۔۔۔ اس نے نوازش کے کندھے پر لرزتا ہوا ہاتھ رکھا اور سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ ''ہر جذبہ ادھورا ہے۔ محبت ہمیشہ ادھورے پن میں سانس لیتی ہے اسے کبھی پورا کرنیکی کوشش نہ کرنا۔ اس کا دم گھٹ جائے گا۔ یہ مر جائے گی۔''،،،، اس کی آنکھوں میں یہ وارفتگی، خمار اور سپردگی نوازش نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں
وہ سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا

اس نے بے اختیار نوازش کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ اس غیر متوقع حملے پر حیران، بے جان مجسمہ بن گیا۔ اسی حیرانی میں اس کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے مگر یہ کیفیت شاید لمحہ بھر رہی پھر ہونٹوں سے ہونٹ ملے۔۔۔۔۔۔ چند لمحوں کا یہ لطیف لمس، صدیوں کے روحانی تسکین اور تلذذ پر محیط ہو گیا۔ شاہدہ نے اس سے الگ ہو کر محبت کے وفور سے پُر سرخ سرخ عرق بھری آنکھوں سے اسے دیکھا اور مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی مسافر لاؤنج سے باہر نکل گئی۔

اس نے اب کے بار بھی اپنا کوئی ایڈریس یا ملنے کے لئے کسی رسمی دعا اور خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ تو کیا ہم پھر ملیں گے، شاہدہ کو پہلے کی طرح یقین ہے۔ کہ ہم پھر۔۔۔۔۔؟ کس روپ میں؟۔۔۔ جہاز میں بیٹھا وہ کافی دیر تک یہی سوچتا رہا۔

☆☆☆

یہی ملا ہے نئی نسل کو بزرگوں سے
رواج تاج محل کا سماج پتھر کا

نوازش کا خاندان مختلف عقیدے رکھنے والے گھرانوں کا گلدستہ تھا۔ اس کے دادا نے اپنے بیٹوں کی شادیاں مختلف عقیدے رکھنے والے گھروں میں کی تھیں۔ کیونکہ وہ زندگی بھر مذہبی رواداری کے علمبردار رہے تھے اور "کسی کو چھیڑو نہ اور خود کو چھوڑو نہ" کے اصول پر چلتے ہوئے انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا تھا کہ وہ مسلمانوں میں پائے جانے والے تمام مسالک کو اپنی اپنی جگہ درست سمجھتے ہیں۔ ان کے اس نیک اقدام کا ہی نتیجہ تھا ان کے خاندان میں مذہبی رواداری کا دور دورہ تھا۔ امجد کی والدہ جو کہ اثنا عشری مکتبہ فکر سے تعلق رکھتی تھیں مگر ان کی اولاد میں بیٹیاں اہل سنت رشتہ داروں میں بیاہی گئی تھیں اب دو بیٹوں کی باری تھی جن میں سے ایک یعنی نوازش اور اس سے بڑا شبیر جو کہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں کیمسٹری کا لیکچرار تھا' اس کی نسبت اپنی خالہ زاد رابعہ سے طے تھی اور شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔ نوازش کے ماموں سید نزاکت علی، اپنے علاقے کی امن کمیٹی کے سربراہ تھے اور دونوں مسالک میں محترم اور معتبر سمجھے جاتے تھے ۔ملک کے کسی حصے میں، کسی شہر میں کہیں شیعہ سنی فساد ہوتا تو وہ محلے کے نوجوانوں کو اکٹھا کرتے اور انہیں اخوت اور یگانگت کا سبق یاد دلاتے اس موقعے پر وہ علامہ اقبال کا یہ مصرع ضرور دہراتے۔

ع

اے گرفتارِ ابوبکر و علی، ہشیار باش!!

علاقے میں کبھی شیعہ سنی فساد نہ ہوتا تھا بلکہ محرم کے دنوں میں سنی نوجوان جلوس کے راستے میں پانی اور دودھ کی سبیلیں لگا کر مثالی مذہبی یگانگت کا مظاہرہ کرتے۔ مگر انہی دنوں ملک میں فرقہ واریت کی جو لہر چلی تو یہ گھرانہ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ نزاکت علی، آج صبح ہی صبح آ گئے۔ بہن کے ہاں آنا جانا تو اکثر رہتا تھا مگر ان کا آج کا آنا نوازش کی والدہ کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ انہوں نے

بات شروع کی۔ ''دراصل زینت (رابعہ کی والدہ) نے مجھے تمہارے پاس ایک ضروری بات کرنے بھیجا ہے۔''

حکمت بی بی (نوازش کی والدہ) نے پوچھا۔ ''خیر ہے نا بھائی صاحب''

نزاکت علی نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کیا۔ ''زینت بی بی نے صاف صاف کہہ دیا کہ رابعہ کا رشتہ کسی ایسے لڑکے کے ساتھ نہیں ہو سکتا جس کے باپ کے عقیدے کا ہی پتہ نہیں''

حکمت بی بی کو پہلے تو سمجھ نہ آئی کہ بھائی کیا کہہ رہا ہے اور جب نزاکت علی نے جملہ دہرایا تو ان کا تو دماغ چکرا گیا۔ تقریباً چیختے ہوئے بولیں۔ ''کیا کہہ رہے ہیں بھائی صاحب!!!''

''دیکھو جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔'' نزاکت علی نے بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے لئے لڑکیاں بہت اور اس کے لئے لڑکے۔۔''

''مگر بھائی صاحب، شبیر اور رابعہ۔۔۔'' اس کا گلا شدید صدمے کی وجہ سے خشک ہو گیا اور ان کی بات گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ بمشکل خود کو گرنے سے سنبھال سکیں۔ اور برآمدے کی چھت کے ساتھ لپٹی ہوئی سرکنڈوں کی سرکی کا سہارا لے کر کھڑی ہوئیں۔ اور پھر نڈھال ہو کر پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اور بھائی کی طرف بیچارگی سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''بھائی صاحب آپ نے بھی زینت کو نہیں سمجھایا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔''

''بھئی حکمت! دیکھو بات تو سچ ہے نا دولہا بھائی صاحب کا کیا عقیدہ ہے، تم خود ہی دیکھ لو۔'' نزاکت علی کے لہجے میں زینت کی طرفداری کا بھرپور رنگ جھلک رہا تھا۔ ابھی تک تو حکمت، اپنے بڑے بھائی کو صرف ایک پیغام رساں سمجھ رہی تھی مگر اب کھلا کہ یہ سب کچھ تو انہی کی مرضی کا کیا دھرا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا۔ ''ان کا عقیدہ یہ ہے کہ انہوں نے آج تک آپ کی بہن کو اپنے مسلک پر چلانے کی کوشش نہیں کی۔ اور بتائیں کب میں نے آپ سے زندگی میں کبھی کوئی شکایت کی ۔کب میں لڑ کر آپ کے گھر میں آ کر بیٹھی!''

نزاکت علی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تمہاری اور بھائی صاحب کی بات اور تھی جو تم نے چاہا کیا اور انہوں نے بھی نہیں ٹوکا مگر اب۔۔''

''اب کیا ہے۔؟'' نوازش کی والدہ کا لہجہ قدرے تیز تھا۔ اس تیزی کو نزاکت علی نے بھی محسوس کیا۔ انہوں نے کہا۔ '' اب خیالات میں تبدیلی آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ تبدیلی فریقین کے درمیان کسی چپقلش یا ناچاقی کو جنم دے۔ اس لئے۔۔۔''

"بھائی صاحب -- آپ بات کھل کر نہیں کر رہے۔ آپ کے دلائل میں بھی وزن نہیں ہے۔۔۔ آپ یہ سب کچھ کیوں کہہ رہے ہیں، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔" نوازش کی ماں کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

نزاکت علی نے کہا۔ "اب دیکھو شبیر امریکن یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ اس کے خیالات۔۔۔۔"

"بھائی صاحب میرا شبیر الحمد للہ! مسلمان ہے اور مجھے فخر ہے کہ وہ امریکہ میں ہر سال محرم کی مجالس پڑھتا ہے۔ یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ اب تو وہ بیروت میں ہے جہاں پر۔۔۔"

نزاکت علی نے اس کی بات کاٹی۔ "۔۔۔ وہ زنجیر زنی ترک کر چکا ہے۔ اور وہ جب بھی پاکستان آتا ہے زنجیر زنی کی مخالفت میں دلائل دیتا ہے۔"

حکمت بی بی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں بھائی صاحب جیسی رابعہ آپ کی بھانجی ویسا شبیر آپ کا بھانجا۔ اگر آپ کو کوئی گلا یا شکایت ہے۔ تو آپ شبیر سے خود بات کر لیجئے گا۔"

"نہیں اب وہ زمانے نہیں رہے۔" اب اپنی عزت اور جان خطرے میں ڈالنے والی بات ہے۔ جسے کوئی سیدھی سچی بات کہو وہ آستین خنجر چھپائے بیٹھا ہے۔۔۔ تم اس رشتے کو ختم ہی سمجھو!"

حکمت بی بی کو رشتوں کا لحاظ تھا ورنہ بہت کچھ کہہ سکتی تھی۔ مگر سوائے اس کے کچھ نہ کہا۔ "زینت سے کہنا کہ وہ خود اپنے میاں کیساتھ آ کر بات کرے"۔

لیکن نزاکت علی نے واضح طور پر کہہ دیا۔ "اسے آنیکی ضرورت نہیں۔ مجھے اس کا نمائندہ ہی سمجھو۔"

"مگر بھائی صاحب بھانجے بھانجی کو تو چھوڑیں ہم دونوں بہنوں کے لئے تو آپ ایک ہی طرح ہیں نا!!"

"نہیں حکمت! تسلیم کے رشتے پہلے ہوتے ہیں خون کے رشتوں کی باری بعد میں آتی ہے۔"

جب یہ خبر خاندان میں پہنچی تو ہر طرف سے بھرپور مخالفت ہوئی۔ سب بڑے بوڑھوں نے خاندان کے بزرگوں نے نزاکت علی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ حکمت بی بی کو بھی دوبارہ کوشش کرنے کو کہا۔ انہوں نے بھائی کو واسطے دیئے کیونکہ انہیں بھانجی کو بہو بنانے کی شدید خواہش تھی اور اگلے ہفتے شبیر بھی امریکہ سے آ رہا تھا' تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ بہنیں اپنے بچوں اور نندوں سمیت شادی والے گھر میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھیں۔ مگر دوسری طرف، والدین کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ شادی والے گھر میں مرگ کی کیفیت تھی۔ نوازش اس ساری کیفیت سے بے خبر تھا۔ کبھی

کبھاراسے شبیر بھائی کی شادی کے ہنگامے یاد آتے وہ سوچتا کہ ان دنوں سب بہنیں' بچے' رشتہ دار عزیز اس کے گھر میں اکٹھے ہوں گے کتنا مزا آتا ہو گا اور خاص طور پر جب آ جائیں گے تو لڑکیاں انہیں کس کس طرح چھیڑیں گی تنگ کریں گی۔ شبیر بھائی چار سال بعد امریکہ سے آ رہے ہیں وہ کتنے بدل گئے ہوں گے...... پیشہ ورانہ ذمہ داریاں کس طرح انسان کی خوشیوں اور خواہشوں کی راہیں روکتی ہیں-- ان کیفیات سے وہ زندگی میں پہلی مرتبہ دوچار ہوا تھا۔ اس نے گھر میں مطلع کر دیا تھا کہ وہ شادی میں شریک نہیں ہو سکے گا۔

ادھر لاہور میں اس صورت حال سے نکلنے کے لئے اس کے والدین نے کافی سوچ بچار کرنے کیبعد یہ فیصلہ کیا کہ شبیر کے لئے کوئی اور رشتہ دیکھا جائے اور مقررہ تاریخ پر ہی شادی کر دی جائے۔ چنانچہ ایم بی بی ایس فائنل ایئر کی طالبہ ,فوزیہ جس کے ساتھ نوازش کے لئے بات چل رہی تھی' خوبصورت تھی۔۔۔ نوازش نہیں تو شبیر ہی سہی ۔۔۔۔طرفین کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ چٹ منگنی ہوگئی اور پٹ بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں کیونکہ ایم بی بی ایس کے امتحانات میں صرف ایک ماہ باقی تھا اور لڑکی کے والدین کا خیال تھا کہ شادی یا تو جتنی جلدی ہو بہتر ہے تا کہ ان کی بیٹی کو امتحان دینے کے لئے کچھ وقت مل سکے۔ یا پھر امتحانات کے بعد شادی ہو۔ مگر دوسری طرف شبیر کی چھٹی کا بھی مسئلہ تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ اس کی آمد کے دو دن بعد ہی یہ نیک کام انجام پا جائے۔ یوں شادی والے گھر میں خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں۔ اسکی سابقہ منگیتر رابعہ نے ایف ایس سی کے بعد نرسنگ کا کورس کیا تھا جبکہ جولڑکی اب اس کی بیوی بننے جا رہی تھی وہ چند ماہ بعد ڈاکٹر بننے والی تھی۔ مگر ان تمام باتوں سے قطع نظر شبیر اور رابعہ بچپن سے جس نسبت میں بندھے ہوئے تھے اس کی رو سے دونوں کا ایک دوسرے کو اپنے تصور میں بسانا فطری بات تھی۔ چنانچہ جب شبیر پاکستان پہنچا تو نئی صورت حال جان کر اس کا تصور کرچی کرچی ہو گیا۔ بہر حال سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے والدین کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ جس پر ہر کسی نے اسے آفرین کہا۔ ہر زبان اس کی تعریف کرتے نہ تھکتی کیونکہ امریکہ میں رہتے ہوئے اس نے اپنی روایات کی پاسداری کی تھی ورنہ نوجوان نسل تو امریکہ جانے کا تصور کر کے ہی اپنی روایات سے بغاوت کر دیتی ہے۔ بہر حال شبیر کی شادی مقررہ تاریخ سے ہفتہ بھر پہلے ہی ہو گئی۔

نوازش جب لاہور پہنچا تو گھر کا نقشہ ہی کچھ اور پایا۔ جلد ہی اسے سب کچھ پتہ چل گیا اور یہ بھی پتہ چلا کہ رابعہ کی شادی سابقہ مقرر کی گئی تاریخ کے مطابق کل ہو رہی ہے۔ کہاں' کس

سے، کسی کو کچھ نہیں پتہ تھا کیونکہ بہن بھائی کے رشتے میں دراڑ پڑ چکی تھی۔ کبھی نہ ملنے کی قسمیں اٹھائی جا چکی تھیں۔ اس لئے گھر میں سے کسی کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ رابعہ کی شادی کہاں ہو رہی ہے۔ نوازش کی اس وقت عجیب کیفیت تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جو کچھ ہو گیا تھا اس پر خوش ہونا چاہیے یا افسردہ۔ البتہ اسے اس بات پر افسوس ہو رہا تھا کہ وہ شبیر بھائی نے رابعہ کے لئے جو خواب دیکھے تھے چکنا چور ہو گئے تھے۔ شادی کے چوتھے دن ہی شبیر اپنی نئی نویلی دلہن کو ہنی مون پر لے گیا تھا چنانچہ نوازش اس کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔۔۔ مگر انتظار کہاں؟ یہ تو موقع غنیمت تھا سب بہنیں۔۔ ماں کے ساتھ اب اس کے لئے نئے رشتے کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں۔ گذشتہ دو دنوں میں انہوں نے تین گھر دیکھ لئے تھے۔ ہر چند کہ نوازش نے انہیں اس طرح رشتے دیکھنے اور لوگوں کی بیٹیوں کے نقص نکالنے سے منع کیا تھا۔ مگر شادی بیاہ کے سلسلے میں عورتیں کہاں سنتی، سوچتی ہیں۔ وہ تو بس یہ چاہتیں ہیں کہ ہمارے بھائی یا بیٹے کے لئے جنت سے کوئی حور مل جائے۔ آج اسے بادل نخواستہ گھر والوں کے ساتھ ایک جگہ رشتے کے لئے جانا پڑا تھا۔ لڑکی گڑھی شاہو کے ذیلی علاقے انجن شیڈ میں ریلوے کے کواٹروں میں رہتی تھی۔ نوازش کو فوراً نیلسن یاد آ گئی۔ وہ بھی تو انجن شیڈ میں رہتی تھی۔ کاش۔۔۔! مگر اب کیا فائدہ، نیلسن کہاں ہوگی۔ اس کی شادی ہو چکی ہوگی۔ شاید نیلسن اسی علاقے میں رہتی ہو۔ اگر آج اسے نیلسن مل جاتی تو۔۔۔۔!!! ،، وہ گھر آ کر کمرے میں اکیلا بیٹھا دیر تک بے ربط اور ناممکن سی باتیں سوچتا رہا۔ اسی گومگوں کی کیفیت پر دن بھر کی تھکاوٹ غالب آ گئی اور وہ سہ پہر کے وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔۔

جب شام کے وقت وہ بیدار ہوا تو گھر کی پرسکون فضا میں ایک ہلچل اور ہنگامے کی کیفیت تھی۔ ساتھ والے کمرے میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ غصہ، بے چارگی، منت سماجت اور پشیمانی میں ڈوبی ہوئی آوازیں آپس میں دست و گریبان تھیں۔ جلد ہی اسے پتہ چل گیا کہ اندر کمرے میں ماموں ممانی اور چھوٹی خالہ اور ابا جان، امی اور باجی کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ”تو گویا اب رابعہ کی شادی میں شریک ہونے پر اصرار ہو رہا ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اسی دوران ابا جان کا فیصلہ کن جملہ اس کے کان میں پڑا۔ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

پھر ممانی بولی ”بھائی جان میں آپ کو مولا پنجتن پاک کا واسطہ دیتی ہوں۔“

''چھوڑو ان باتوں کو، تم لوگوں کی نظر میں تو ہمارا صحیح النسل ہونا ہی مشکوک ہے پھر ہمارا مولا پنجتن پاک سے کیا واسطہ؟'' ابا جان کا سخت لہجہ پورے ماحول پر چھایا ہوا تھا۔
''شاہ جی! میں اپنی عزت آپ کے قدموں میں رکھتا ہوں۔'' ماموں کی روہانسی آواز پر نوازش چونکا کیونکہ ماموں جیسا آدمی محض بیٹی کی شادی کی دعوت دینے کے لئے ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یقیناً کوئی بڑی بات ہے۔ وہ کروٹ لے کر بستر سے اٹھا۔ نہا دھو کر تازہ دم ہونے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو ماموں نے پیٹھ تھپتھپا کر اپنی گہری اپنائیت کا اظہار کیا۔ اب ماحول کا تشنج کچھ کم ہو گیا تھا۔ ابا جان حقے کی نے منہ میں دبائے نہایت بے پروائی سے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ماں جی اور باجی آپس میں کوئی بات کر رہی تھیں۔ نوازش کو آتے دیکھ کر وہ بھی اٹھ کر اس کی طرف بڑھیں اور ماموں اور ممانی کی آؤ بھگت سے فارغ ہو کر نوازش جب صوفے پر بیٹھنے لگا تو اماں اسے بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ باجی بھی ان کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔ دوسرے کمرے میں آ کر اماں نے نوازش کے دونوں گال اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور اس کا ماتھا چوم کر کہا۔ ''نوازش بیٹا! -- میرا مان رکھ لے!''
''کیا؟'' نوازش نے کہا ''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی گھر میں کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے جا رہا ہے -- بات کیا ہے؟'' اس کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔
اس سے پہلے کہ ماں کچھ کہتیں باجی نے کہنا شروع کیا۔ ''بھائی! بات یہ ہے کہ ماموں نے رابعہ کی شادی جہاں طے کی تھی وہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ ہے بلکہ اس سے پہلے وہ دو لڑکیوں کو طلاق دے چکا ہے اور تیسری نے عدالت میں خلع کا کیس دائر کر رکھا ہے۔''
نوازش کے وجود میں نجانے کیوں ایک طمانیت کی لہر دوڑ گئی اس نے لمبی سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''پھر!''
''پھر یہ کہ رابعہ اس وقت دلہن بنی بیٹھی ہے --- بارات کا انتظار ہو رہا ہے۔'' اب کے اماں نے جواب دیا۔
نوازش نے حیرانی سے پوچھا ''مگر یہ آپ کے بھائی صاحب -- اصلی اور خالص سید -- اور ان کا پریوار یہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے -- جا کر بارات کا استقبال کریں۔''
''بیٹا اب وہ چاہتے ہیں کہ رابعہ کی شادی تمہارے ساتھ.....''
''Impossible!'' نوازش سپرنگ کی طرح اچھلا پھر فوراً اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نرمی

سے بولا "آپ نے کیا کہا۔ ابو نے کیا کہا؟"

اماں نے شکستہ لہجے میں کہا "ہم نے تو......!" اماں نے ادھورا چھوڑتے ہوئے پہلو بدل کر کہا "مگر بیٹا گھر کی عزت ہے۔ آخر کو تمہاری ماموں زاد...... میرے بھائی کی بیٹی ہے......"

"کیا!" نوازش چیخ پڑا۔ "یعنی آپ مان گئیں ابو بھی مان گئے۔"

"بیٹا تمہارے ماموں نے اپنی پگڑی تمہارے باپ کے قدموں میں رکھ دی تھی وہ تو پھر بھی نہیں مانے مگر بڑی مشکل سے انہوں نے صرف اس صورت میں ہامی بھری ہے کہ اگر تم راضی ہو تو......"

"اونو! اماں۔۔۔نیور۔۔۔نیور۔۔۔نیور!" نوازش نے نہایت جذباتی انداز میں کہا اور باجی کی طرف دیکھا جو اس ساری گفتگو کے دوران خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی۔ وہ چاہتا کہ باجی ہی کم از کم اماں کو سمجھائے مگر وہ بھی رابعہ کے لئے آنکھوں میں نمی لئے کھڑی تھی۔ اس نے نوازش کو بڑے پیار سے کہا "میرے بھائی ہم نے رابعہ کو اپنی بھابھی بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ اگر شبیر بھائی نہیں تو تم ہی سہی ہماری نظر میں تو تم دونوں ایک جیسے ہو۔"

"مگر باجی۔۔تم بہن کی نظر سے دیکھ رہی ہو رابعہ کی نظر سے نہیں اور پھر بھائی جان کیا سوچیں گے۔" نوازش نے احتجاجی لہجے میں جواب دیا۔ مگر باجی اور اماں دونوں جی میں ٹھان چکی تھیں کہ وہ رابعہ کو اس گھر میں لانے کا یہ موقع ہرگز جانے نہ دیں گی۔

چنانچہ اماں نے کہا "تم شبیر کی چھوڑو وہ بھی میرا بیٹا ہے۔ وہ سمجھدار ہے اور پھر اس کی شادی تو ہو چکی ہے۔ وہ میرا سعادت مند بچہ ہے تمہاری جگہ اگر وہ ہوتا تو اب تک......!" اماں نے رونا شروع کر دیا۔

نوازش نے کہا "مگر اماں یہ تو سوچو کہ وہ ایک انسان بھی ہے صرف آپ کا بیٹا ہی نہیں جب انہیں یہ پتہ چلے گا کہ جس لڑکی سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا اس کی شادی اس کے چھوٹے بھائی سے ہو گئی ہے تو اس کے دل پر کیا بیتے گی۔"

اماں نے موقعے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فوراً پینترا بدلا اور بحث وتمحیص کے بجائے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے اپنا دوپٹہ اس کے قدموں میں ڈال کر فلموں والا ڈرامہ کر ڈالا اور نوازش کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ نوازش کے پاس اب اور کوئی راستہ نہ رہا تھا۔ بالآخر اسے ہاں کرنا پڑی۔

چنانچہ اسی شام رابعہ اسی شام نوازش کی بیوی بن کر اس گھر میں آ گئی۔ جس کو وہ اپنے بڑے بھائی

کی سہاگ رات کے لئے تصور کر رہا تھا اس کے ساتھ وہ خود سہاگ رات منا رہا تھا۔ چنانچہ جب وہ دلہن کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے سیج پر رابعہ کو اپنی بیوی کے طور پر بیٹھے دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے بھائی کی عزت سے کھیل رہا ہے۔ وہ بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رو دیا۔ اور روتے روتے اس پر ایک بے خودی سی طاری ہو گئی اور یہ بھول ہی گیا کہ آج اس کی سہاگ رات ہے۔ اسے احساس ہی نہ ہوا کہ کب رابعہ پہلی رات کی دلہن کا حزم وحجاب بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے پاس آئی اور کب وہ ایک بچے کی طرح اس کی بانہوں میں اس سے لپٹ کر سو گیا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو رابعہ اس کا سر اپنے زانوں پر رکھے اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔ وہ ایک دم رابعہ سے اس طرح الگ ہوا جیسے کہ وہ کوئی غیر عورت ہو۔ رابعہ اس کی اندرونی کیفیت بخوبی سمجھ رہی تھی۔ مگر خود اس کے اندر کیا مچ مچا ہوا تھا اس کا اندازہ کون کرتا ،کون اس کا تاؤ اور تپش محسوس کرتا ب۔ اس طرف کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ حالانکہ وہ بھی نوازش کی طرح مظلوم تھی۔ اس کے جذبات کا بھی مذاق اڑایا گیا تھا۔ اسے بھی بے جان بکاؤ جنس کی طرح حق مہر اور اپنی عزت کے عوض بیچ دیا گیا تھا۔ نوازش اب اس سے دور صوفے پر بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ کمرے کے افسردہ خاموشی میں اس کے تصور میں شبیر بھائی کا سوالیہ اور نفرت سے بھرپور چہرہ اسے اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے تھا۔ اور وہ لرز رہا تھا۔ بھائی کے سامنے وہ کیا منہ لے کر جائے گا۔ وہ کیا سوچیں گے۔۔۔ عجیب عذاب میں زندگی الجھ گئی تھی' کمرے کا دروازہ بند تھا اور وہ دونوں اپنی اپنی ذات کے ڈربے میں بند تھے۔ رات جیسے آئی تھی افسردہ' بے رونق سی...... ویسے ہی گزر گئی۔

شام کے وقت شبیر اور فوزیہ گھر پہنچے تو نوازش کے ولیمہ کے لئے شامیانے تنے ہوئے تھے اور ایک ایک کر کے مہمان بھی آتے جا رہے تھے۔ ہر کوئی دبے دبے لفظوں میں اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا تھا کوئی اسے تقدیر کا کیا دھرا قرار دے رہا تھا تو کوئی اسے مذہبی انتہا پسندی کی شکست اور ماموں کی ہزیمت قرار دے کر توبہ توبہ کر رہا اور زنان خانے میں ہر عورت رابعہ کو مظلوم اور اس کے والدین کو ظالم اور نوازش کو با ادب بانصیب قرار دے رہی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا' شبیر کو جب پتہ چلے گا کہ وہ لڑکی جس کے والدین نے اسے ٹھکرا دیا تھا اس لڑکی کی شادی اس کے بھائی سے ہو گئی ہے تو اس کا ردعمل کیا ہو گا وہ کیا سوچے گا۔۔۔!!!

شبیر کی آمد کے بعد اس ڈرامائی کیفیت پر ہر کوئی اس کے ردعمل کا منتظر تھا۔ ادھر شبیر نے

جملہ حالات جاننے کے بعد نہایت تحمل اور تدبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاملے کی سنجیدگی کو مسکرا کر مقدر کا کھیل کہہ کر اڑا دیا۔ اور دونوں میاں بیوی نے تمام مہمانوں سے اس خوشگوار رویے کا مظاہرہ کیا کہ کسی کو ان کے سامنے اس ہونی کو انہونی کہنے کا موقع نہ ملا۔

رات گئے گھر مہمانوں سے خالی ہو گیا' رابعہ کے والدین بھی رسم کے مطابق اپنی بیٹی کو لے کر رخصت ہو گئے۔ دور سے آئے ہوئے رشتہ دار دن بھر کی تھکن سے چور اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ اور نوازش کے والدین تینوں بہنیں اور ان کے شوہر ڈرائنگ روم میں بیٹھے آج کی تقریب کے بارے میں اظہار خیال کر رہے تھے۔ اسی دوران شبیر اور فوزیہ بھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ابا جان نے اٹھ کر اسے گلے لگایا اور کہا ''شبیر بیٹا! مجھے تم سے اسی تحمل اور بردباری کی امید تھی۔''

اس نے ابا سے الگ ہو کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا ''مگر مجھے آپ لوگوں سے یہ امید نہیں تھی۔'' اس کی یہ بات سن کر سب چونکے اور وہ شبیر جو ابھی تک چپ تھا اور سب سے مسکرا مسکرا کر مل رہا تھا۔ وہ ایک دم پھٹ پڑا ''مجھے بتائیے کہ آپ نے میرے ساتھ اتنی بڑی زیادتی کیوں کی۔''

شبیر نے بڑے سرسری انداز میں نوازش کی طرف دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی ''آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا میں نے سر جھکا کر برداشت کر لیا۔ میں نے آپ کے اور آپ کے رشتہ داروں کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ مگر آپ نے اتنا بڑا فیصلہ......! آپ نے میرا انتظار بھی نہیں کیا اور یہ نوازش......'' اس نے بازو لہرا کر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''......اسے بھی شرم نہ آئی......'' اس کی آواز کا ارتعاش بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اس وقت جوالہ مکھی بنا ہوا تھا۔ نوازش سر جھکائے ہوئے سب سن رہا تھا۔ اسے بھائی کی ہر بات سے اتفاق تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اسکی باتیں اس کے دل کی آوازتھیں مگر بھائی کے دل میں اس کے لئے جو بدگمانی پیدا ہو چکی تھی وہ اس کا حق دار نہ تھا۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ چیخ چیخ کر بھائی کو بتائے کہ وہ سراسر بے گناہ ہے۔ مگر بھائی اس سلسلے میں most effected پارٹی تھا اس کے بعد رابعہ کا نمبر آتا تھا اور خود نوازش اس سانحے میں تیسرے درجے پر فائز تھا۔ مگر شبیر جذبات میں آ کر سب کو رگید رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ''......میں نے سنا تھا کہ گھروں سے دور جانے والے دلوں سے دور ہو جاتے ہیں مگر آج میں نے دیکھ لیا ہے کہ آپ سب ایک ہیں' سب بہنیں نوازش کی ہیں اور آپ دونوں بھی اسی کے والدین ہیں اور مجھ سے زیادہ تو اماں! آپ کو اپنے بھائی کی عزت کا خیال ہے......''

''نہیں بیٹا! ایسی بات...... '' اماں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔
شبیر نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''نہیں اماں!...... آپ...... آپ لوگوں نے میرے احساس کو تار تار کر دیا ہے' میری انا زخمی...... '' اس کا جی بھر آیا اور اس کی آواز اس کے آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ چپ ہو گیا۔
چند لمحوں کے لئے کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ امی اور ابا جان معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے بیٹے کی دلجوئی کرتے اور حالات کی کروٹ اور اپنی مجبوری کا ذکر کر کے اسے اپنی بے بسی کا احساس دلاتے مگر ابا جان نے والدین کے حقوق کا بھرپور مگر بے محل فائدہ لیتے ہوئے جو آمرانہ رویہ اختیار کیا اس نے صورت حال کی سنجیدگی کو پوائنٹ آف نو ٹرن پر پہنچا دیا۔
انہوں نے کہا۔ ''والدین اپنی اور اپنی اولاد کے مفاد میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کی مجاز ہیں اس کے لئے انہیں کسی سے اجازت لینے یا کسی کو قائل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم نے جو بہتر سمجھا کر دیا۔ ہمارے فیصلے کو تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کرو اور بس!''
ابا جان کے بعد اماں نے جو اپنے احسانات جتلاتے ہوئے اپنے مجازی خدا کی ہمنوائی کی اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ نوازش کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ماں ہے یا وہ کہ جو کل شام اپنے سر کی چادر اس کے پاؤں میں رکھ کر بھانجی کے لئے بر کی بھیک مانگ رہی تھی۔ کل وہ اپنے آپ کو گنہگار سمجھ رہا تھا کہ ماں جیسی عظیم ہستی نے سر کی چادر اس کے پاؤں میں ڈال دی تھی مگر آج اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کل وہ بے وقوف بن گیا تھا۔ اس نے اماں کو مخاطب کر کے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ اماں نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ''...... تم لوگوں کو اپنا خون پلا پلا کر پال پوس کر اسی دن کے لئے جوان کیا تھا کہ آج تم ماں باپ سے مجرموں کی طرح بات کرو......''
نوازش کے لئے اب یہاں بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں طوفان مچل رہا تھا شبیر تو کچھ بول کر ہلکا ہو چکا تھا مگر نوازش کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو اس بیٹھک میں سرے سے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔
رات گئے تک وہ شہر کی سڑکوں پر بے مقصد پھرتا رہا۔ یہ شہر جس کی مٹی سے اس کی نمو تھی جس کی خوشبو اس کی سانسوں میں بسی ہوئی تھی۔ آج یہ شہر اسے کتنا اجنبی اور ویران

محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ سب چھوڑ چھاڑ کر گزرے ہوئے زمانوں کے تعاقب میں نکل جائے۔ جہاں اس نے زندگی کا آزاد ترین' سنہرا وقت گزارا تھا۔ جب خوشیاں ہی خوشیاں تھیں قہقہے تھے رشتوں کی سطحیت کا سراب کتنا خوبصورت تھا۔ رشتوں کی گہرائی میں چھپی اذیت سے زندگی آگاہ نہیں ہوئی تھی تب زندگی کتنی خوبصورت تھی۔۔۔۔اس کے ذہن میں گزرے لمحوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔۔۔مگر گزرا ہوا وقت بھی تو ایک خواب ہی تھا ورنہ گزرتا کیوں!! سچائیاں تو اٹل ہوتی ہیں قائم و دائم ہوتی ہیں' وہ یہ سوچ کر مزید پریشان ہو گیا۔

اس نے خود سے سوال کیا' تو کیا یہ خوشیاں غم' وعدے وعید' رشتے ناتے' سب خواب ہیں سراب ہیں' جھوٹ ہیں۔۔اور اگر یہ جھوٹ ہیں تو پھر ہم اس جھوٹ پر مطلق سچائی کو کیوں قربان کرتے ہیں۔ شاید.....شاید بلکہ یقیناً ''انسان خسارے میں ہے'' اس نے زیرلب دہرایا۔ شاید یہ عرفان کی گھڑی تھی وہ ایک دم شانت ہو گیا۔ اب اس کے قدم گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

اگلے ہی روز شبیر اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر چپ چاپ گھر سے چلا گیا۔ نوازش نے بھائی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ قرآن و احادیث کے حوالے دیئے۔ ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ خود شبیر کی اپنی پڑھی ہوئی مجالس کے حوالے دے کر ایثار اور قربانی کا جذبہ ابھارنے کی کوشش کی مگر شبیر نے اس کی تمام باتوں کے جواب میں ایک ہی بات کہی۔ ''کیا تمام اخلاقیات مجھی کے لئے ہیں۔'' نوازش نے بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے نوازش کو یہ کہہ لاجواب کر دیا۔ ''میرے الفاظ سے مجھے باندھنے کی کوشش مت کرو۔ میرے لئے تم نہیں رہے۔۔۔۔'' شبیر اپنا سامان لے جانے کے لئے سواری کا انتظام کرنے نکل گیا۔ ادھر فوزیہ کی جو شامت آئی۔ وہ اپنی ساس کے پاس آئی تا کہ اس ساری صورت حال پر ان کی دلبری کرے اور ان کے ساتھ اپنی وابستگی واضح کرے۔ مگر اسے دیکھتے ہی ماں نے ہاڑ اڈالنا اور اسے کوسنا شروع کر دیا۔۔۔ ہائے ناگن آتے ہی میرے گھر کو ڈس گئی۔ لے گئی میرے جگر کا ٹکڑا۔ ہائے دل نکال کے لے گئی۔۔۔ تو نے میرا و بیڑا و یران کر دیا۔۔۔ جا میری بد دعا ہے تیرا و بیڑا کبھی نہ وسے۔۔۔۔۔۔۔!!!''

''بس کرو ماں! اس میں بھابی کا کیا قصور۔'' نوازش نے ماں کو چپ کروایا اور فوزیہ کو اشارہ کیا کہ منظر سے ہٹ جائے۔ نوازش تھوڑی دیر ماں کے آنسو پونچھتا رہا پھر شبیر کے کمرے میں چلا گیا

جہاں فوزیہ بیٹھی رو رہی تھی۔ نوازش کو دیکھ کر اس نے اپنے آنسو پونچھے اور کچھ کہنے لگی ہی تھی کہ نوازش نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ''کوئی ضرورت نہیں اپنی صفائی پیش کرنے کی ۔مجھے پتہ ہے آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔۔''

''مگر نوازش۔۔۔۔'' فوزیہ نے پھر بولنے کی کوشش کی نوازش نے پھر اس کی بات کاٹی۔ ''ماں نے زیادتی کی ہے؟ ،۔۔ہاں کی ہے، شبیر بھائی کی طرح اب وہ آپکی بھی ماں ہے۔ بہرحال میں ان کی طرف سے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔''

''مگر نوازش بھائی اس سارے معاملے میں میرا قصور کیا ہے۔'' اس کے لہجے میں الجھن اور سوال تھا۔ نوازش نے بھائی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوزیہ کی مدد لینے کا خیال آیا۔ اس نے کہا۔ بھابی جی، سب جانتے ہیں، شاید ماں بھی۔۔۔ کہ آپ کا کوئی قصور نہیں مگر۔۔۔۔'' نوازش نے منت آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ ان کے فیصلے پر اثر انداز تو ہو سکتی ہیں نا۔۔''

''بھیا! مجھے کیا پتہ آپ کے بھائی کا مزاج کیا ہے۔ ابھی تو ہفتہ عشرہ ہی گزرا ہے۔ مجھے کیا پتہ ان کے ردعمل کے پیچھے کون سا جذبہ ہے اور اس کی gravity کیا ہے، پس منظر کیا ہے۔ میں کیا جانوں۔ اسے میرا نصیب کہہ لیں کہ آتے ہی گھر میں یہ کشمکش ہے۔ بھائی آپ شاید نہیں جانتے کہ ہمارے معاشرے میں ہزار قباحتوں اور خامیوں خرابیوں کے باوجود نئی نویلی سہاگن کے لئے دیور، نندیں ساس سسر ایک مقام رکھتے ہیں، ایک وزن ہوتا ہے ان کا، ایک تحفظ کا احساس ہوتا ہے ان کی موجودگی میں۔۔۔ اور خاص طور پر جب شادی کے ابتدائی عرصے میں تو میاں بیوی کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو ان رشتوں کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔۔ اور ہمارا تو ابھی آغاز ہے۔۔۔'' فوزیہ کے لہجے میں خدشے اور اندیشے اتر آئے۔

''اللہ بہتر کرے گا۔ آپ صاف دل ہیں ان شاءاللہ آپ سکھی رہیں گی شبیر بھائی بہت اچھے ہیں۔'' اس نے مزید اصرار مناسب نہ سمجھا اور اسے دعائیں دے کر واپس آ گیا۔

شبیر چلا گیا، ہمیشہ کے لئے۔۔۔!!!! اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ جیتے جی دنیا کے رشتوں سے جان کہا چھوٹتی ہے۔ ہم پھر ملیں گے۔۔ اس نے اپنے آپ کو آسرا دیا۔ بہنوں کے ہوتے ہوئے ایک دو روز تک اماں اور ابا نے اپنے رویے سے کچھ محسوس نہ ہونے دیا۔ مگر چند ہی دنوں بعد جب سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں تو ان کے اندر کی ویرانی، آسیب کی طرح ان کے اردگرد پھیلتے پھیلتے سارے گھر پر طاری ہو گئی۔ اسی طرح ایک ماہ گزر گیا۔ اس دوران اماں اور

ابا، دونوں نے سمدھی اور سمدھن کو بھی بیچ میں اپنا مثبت کردار ادا کرنے درخواست کی مگر ان کا مؤقف بھی اپنی بیٹی، فوزیہ سے مختلف نہ تھا۔ اسی ادھیڑ بن اور پریشانی میں ۔۔۔۔ رسم و رواج کے مطابق انہیں رابعہ کو اس کے میکے سے لانے کا بھی چاؤ نہ رہا تھا کیونکہ ابھی تک گھر میں معاملات الجھے ہوئے تھے اس لئے نوازش نے بھی یہی سوچا کہ بہتر ہے رابعہ کچھ دن اور میکے میں رہے یہاں آئے گی تو ہو سکتا ہے اسے سامنے دیکھ کر کسی کے منہ سے کوئی ہونی شدنی نہ نکل جائے۔ ادھر اماں نے بھی نوازش کو یاد نہ دلایا۔ ورنہ اگر عام حالات ہوتے تو اماں کی طرف سے ضرور تحریک ہوتی۔ اس دوران ایک دو مرتبہ ادھر سے اشارے بھی ملے مگر ادھر سے خاطر خواہ پیش رفت نہ پا کر وہ لوگ بھی چپ ہو رہے۔ جب مزید پندرہ بیس دن گزر گئے اور خاندان میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو ایک دن ماموں نزاکت رابعہ کو لے کر خود ہی چلے آئے۔ اس وقت اتفاقاً نوازش اکیلا ہی گھر میں تھا۔ ماموں نے سلام دعا کے بعد کہا۔ ''لو بھئی اپنی امانت کو سنبھالو'' نوازش نے ''تشریف رکھئے'' کے علاوہ اور کچھ جواب نہ دیا اور رابعہ کے ہاتھ سے بیگ لے کر کمرے میں رکھنے چلدیا۔ رابعہ بھی اس کے پیچھے کمرے میں آ گئی۔

''آپ ناراض ہیں؟'' رابعہ نے دبی سی دھیمی سی آواز میں پوچھا۔

نوازش نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ماموں باہر بیٹھے ہیں آؤ باہر ان کے پاس چلتے ہیں اماں ابا بھی گھر میں نہیں ہیں ۔۔۔ اچھا نہیں لگتا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا اور رابعہ بھی کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی باہر بیٹھک میں آ گئی۔

ماموں نے بات شروع کی۔ ''نوازش بیٹا! یہ جو کچھ بھی ہوا ۔۔'' وہ چند لمحوں کے لئے رکے۔ اور پھر گویا ہوئے۔ ''بیٹا بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی معافی سے تلافی نہیں ہو سکتی ۔۔۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔''

''جی ماموں جی، میں سن رہا ہوں۔ آپ بات کریں'' نوازش نے عاجزی سے کہا۔

''تو بیٹا، میں خود اس لئے رابعہ کو لے کر آ گیا کہ شاید ۔۔۔''

نوازش نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''نہیں ماموں جی ایسی کوئی بات نہیں، جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''اللہ پنجتن پاک تمہیں خوش رکھے۔ امام زماں تمہاری حفاظت کرے۔'' ماموں کے چہرے پر تفکر اور پریشانی اور ایک طرح کی بے یقینی کے جو اثرات تھے۔ نوازش کی ایک ہی بات سے دور ہو

گئے۔ان کے لہجے میں اب تشکرانہ تسکین تھی۔ ”بیٹانہ جرم دار تم ہو نہ رابعہ۔۔۔ زندگی تم دونوں کی ہے۔ جو بھی کیا ہم تینوں کا کیا دھرا ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں اس باب میں حکمت بی بی بھی بے قصور ہے اس نے تو ہم لوگوں کی عزت بچانے کے لئے اپنی ممتا بھی داؤ پر لگادی۔۔۔ بیٹا جو بھی ہوا۔اس میں رابعہ۔۔۔“ ماموں کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی مگر انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔” ۔۔۔بیٹا، رابعہ بھی تمہاری طرح ہی بے قصور اور مظلوم ہے۔تم لوگوں پر اس ظلم کا۔۔۔“ ماموں کی آواز پر آنسوؤں کی روانی غالب آگئی۔انہوں نے روتے ہوئے کہا۔” ۔۔۔میں یہ ہاتھ جوڑ کر تمہیں التجا کرتا ہوں غازی کا واسطہ دیتا ہوں۔رابعہ میری بیٹی ہے۔اس کو۔۔۔۔۔۔“

”ماموں آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔۔۔ یہ سب کچھ۔۔۔ مجھے سب احساس ہے، پتہ ہے۔پلیز آپ۔۔۔ بے فکر ہو جائیں۔“ نوازش سامنے صوفے سے اٹھ کر ماموں کے پاس بیٹھ کر انہیں دلاسا دینے لگا۔رابعہ کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔اس نے سر کے اشارے سے اسے رونے سے منع کیا۔اور ماموں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔” آپ کی دعائیں درکار ہیں۔ان شاءاللہ میری طرف سے رابعہ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔بس یہ نئی نئی پریشانی ہے۔اور یہ نئی نئی دلہن ۔۔۔اسی لئے میں نے سوچا چند دن اور۔۔۔۔ ورنہ جو سوسے آپ یا خالہ جان کے دل میں ہیں ایسی کوئی سرے سے بات ہے ہی نہیں۔“

آتے وقت جس چہرے پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی جاتے ہوئے ماموں کے اس چہرے پر اطمینان لہرا رہا تھا۔یہی کیفیت رابعہ کی بھی تھی۔اس کے چہرے پر بھی اب بے یقینی اور اندیشے کی جگہ ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔اچانک نوازش نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔” ارے! ماموں بغیر چائے پانی کے چلے گئے۔باتیں اتنی گمبھیر تھیں کہ یاد بھی نہیں رہا اور تم نے بھی۔۔۔۔۔“ اسے یاد آگیا کہ رابعہ ان کے ساتھ ہی آئی تھی اور ابھی وہ بھی تو مہمان ہی تھی۔اس لئے وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر بولا۔” آپ بیٹھئے! میں چائے بناتا ہوں۔“

رابعہ نے کہا۔” آپ بیٹھیں، میں بناتی ہوں۔“

”ارے آپ کیسے بنائیں گی، آپ کو کیا پتہ پتی کہاں، دودھ کہاں اور شکر کہاں۔“ نوازش نے بے تکلفانہ اپنائیت سے کہا۔

”آپ بیٹھئے میں ڈھونڈ لوں گی۔۔۔ بیٹھئے میں بناتی ہوں۔“ اس کے چہرے پر باوقار مسکراہٹ تھی۔مگر نوازش کا اصرار تھا کہ چائے وہ بنائے گا۔رابعہ نے بڑی ملائمت سے کہا۔” اچھا نہیں

لگتا۔۔۔میں نے کھانا میں بناتی ہوں۔۔۔آپ بیٹھیے۔"

"ایک شرط پر۔" نوازش نے کہا۔ رابعہ نے حیران کن سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں نوازش کی نظروں سے ٹکرا گئیں۔ نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔" اگر آپ مجھے تم کہہ کر مخاطب کریں۔"

"مگر ایک شرط پر۔۔۔۔" اب رابعہ کی باری تھی۔ نوازش نے پوچھا۔" وہ کیا؟"

رابعہ نے کہا۔" آپ بھی مجھے۔ آپ، آپ کی تکرار چھوڑ کر مجھے تم کہہ کر بلائیں تو۔"

"بھئی آپ مجھ سے بڑی ہیں۔۔ اور میں آپ سے چھوٹا ہوں۔"

"وہ۔۔وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔۔۔"

"مگر کیا؟"

"اچھا۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ آپ۔۔۔" رابعہ چپ ہوگئی۔ ماحول ذرا سنجیدہ سا ہوگیا۔ نوازش نے بڑے شگفتہ انداز میں کہا۔" آپ مجھے شروع سے تم کہتی رہی ہیں۔ اور میں نے ہمیشہ آپ کہہ کر بلایا ہے آپ کو۔"

"تو پھر میں جب تم سے آپ پر آگئی ہوں اور آپ کیوں 'تم' پر نہیں آسکتے۔" رابعہ کے لہجے میں دلیل کا اعتماد تھا۔

نوازش نے کہا۔" دیکھیں آپ اگر میری بھابی ہوتیں تو میں۔۔۔۔۔۔"

"نوازش ش ش پلیز ززززز!!" رابعہ ایک دم تڑپ اٹھی۔ نوازش کو بھی فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ دراصل گفتگو اس طرح رواں تھی اور اس نہج پر تھی کہ وہ اس بدلتے رشتے کی احتیاط اور نزاکت کو بھول ہی گیا تھا۔

"رابعہ! وہ۔۔۔! دراصل میں مذاق کر رہا تھا۔" اس نے وضاحت کی۔

"مذاق دل بہلانے کے لئے کیا جاتا ہے، دل دکھانے کے لئے نہیں۔" رابعہ کے لہجے میں ناراضی، دکھ اور گلہ تھا۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔" I am sorry"

رابعہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ اس نے انگلی کی پور کن اکھیوں پر پھیری اور کہا۔" ok its، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔ نوازش دروازہ کھولنے کے لئے اٹھا اور رابعہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

موسم یہ اداسی کا برسوں سے نہیں بدلا
ویسے تو سبھی موسم ہر سال بدلتے ہیں

یہ مکان جسے کھولی کہنا زیادہ مناسب لگتا تھا۔۔ڈھائی کمروں پر مشتمل تھا۔ غسل خانہ اور لیٹرین اس کے علاوہ تھی۔ایک کمرہ پرانی وضع کی چار کرسیوں ایک میز اور نیواڑی پلنگ کی مدد سے ڈرائنگ روم بنایا ہوا تھا۔ دو تین پرانے کیلنڈر جن کے کنارے مکھیوں کے بسیرے کے نشانات تھے دیوار پر لٹکے ہوئے مکینوں کی قدامت پسندی کی چغلی کھا رہے تھے۔کمرے کے دونوں کونوں پر یا اللہ یا محمد کے فریم شدہ قطعے ماحول کو اسلامائز کئے ہوئے تھے۔سال خوردہ لکڑی کی چھت جگہ جگہ سے دیمک کو رزق فراہم کر کے اللہ کی رزاقی کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ پتھر پر رینگنے والے کیڑے ہی کو نہیں بلکہ لکڑی میں پیدا ہونے والے کیڑے کو بھی رزق فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ میز کے بائیں حصے میں چند ایک نئے اور پرانے میگزین اور ڈائجسٹ گھر میں رہنے والے کی علم دوستی کے عکاس تھے۔کمرے کا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوتھا اور نیچے سے اینٹیں جھانک جھانک کر اپنی مفلسی اور برہنگی کی شکایت کر رہی تھیں۔شہتیر کے ساتھ ایک بیمار سا بلب لٹک رہا تھا۔دوسرے کمرے میں ایک کونے میں ایک انگیٹھی بنی ہوئی تھی جس میں مٹی کے تیل کا ایک چولہا رکھا تھا۔اس کے ساتھ ہی ایک الماری نما شیلف ، جو فرش سے لے کر چھت تک چلی گئی تھی۔اس میں روزمرہ ضروریات کے لئے برتن نہایت قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔اس کے سامنے ایک کونے میں دو لمبی لمبی مٹکیاں تین تین اینٹوں پر ٹکائی ہوئی تھیں۔تا کہ پانی نکالتے وقت زمین بوس نہ ہو جائیں۔اسی کمرے کے دوسرے کونوں میں دو چارپائیاں سفید حاشیہ دار چادروں سے ڈھنپی بچھی ہوئی تھیں۔یعنی یہ کمرہ بیک وقت کچن اور بیڈروم کا کام دیتا تھا۔پورے مکان میں بس ایک ہی پکی ، پتھر کی دیوار تھی۔جس کا فائدہ اٹھا کر اس میں کیل ٹھونک کر پردہ لگا کر اس کے پیچھے ہینگروں میں کپڑے اس سلیقے سے لٹکائے ہوئے تھے کہ نظر نہ آئیں۔مکان کی باقی دیواریں لکڑی

کی بنی ہوئی تھیں جن پر گھی کے خالی کنستروں کی چپیاں لگا کر ان کو زنگ سے بچانے کے لئے ان پر وقتاً فوقتاً رنگ کیا جاتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ آدھا کمرہ جو کہ سٹور کے لئے مخصوص تھا۔ اس میں پرانے دو ٹرنک، دو لاچاری چارپائیاں اور کپڑے چیتھڑوں کی طرح دیواروں سے لپٹے ہوئے تھے۔ یہ سٹور عام طور پر بند ہی رہتا تھا۔ کمرے کا دوسرا دروازہ ایک لمبی سی تنگ بالکونی میں کھلتا تھا۔ جو شاید دھوپ سینکنے کے لئے خاص طور پر بنوائی گئی تھی۔ اس کے کونے پر غسل خانہ اور لیٹرین تھی۔ شاید مکان چھوٹا اور موسمی اثرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بند بند تھا اس لئے تعفن سے بچاؤ کے لئے لیٹرین باہر بنائی گئی تھی۔ غسل خانے کی چھت پر ایک ڈرم پڑا ہوا تھا۔ جس میں بارش کا پانی جمع رہتا تھا۔ اس ڈرم میں ایک ربر پائپ کا ایک سرا پانی میں ڈوبا رہتا اور دوسرا سرا نیچے لٹکتا رہتا۔ ضرورت کے وقت یہ سرا منہ میں لے کر سانس کی مدد سے پانی پائپ میں اتار کر مطلوبہ برتن بھرنے کے بعد پائپ کو ذرا نیچے کھینچ کر پانی کی سطح سے اٹھا دیا جاتا۔ آب رسانی کا یہ طریقہ ---ضرورت ایجاد کی ماں ہے-- کا نتیجہ تھا۔

شوہالہ-- مری مال روڈ کے پار دائیں طرف کا زیریں علاقہ------ میں نصر کا آبائی مکان ہوا کرتا تھا۔ یہ اس سے ملحقہ سرونٹ کواٹر تھا۔ مگر اب یہ رہائش گاہ فریدہ بی بی کے تصرف میں تھی۔ جو اُن کی پرانی خادمہ تھی۔ کشمیر کے ہندو ڈوگرا خاندان سے تھی۔ ایک مسلمان لڑکے سے عشق ہوا۔ شادی کر لی اور جموں سے یہاں آ گئی پاکستان بنا تو خاوند ہنگاموں میں مارا گیا اور یہ بے سہارا رہ گئی۔ اس کے خاندان کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو کیا کرتی، کیا کہتی کہ کون ہے۔ میکے واپس جانے کے دروازے بند کر آئی تھی۔ بس لٹتی لٹاتی، حاجی عرب خاں، نصر کے والد کے پاس آ گئی اور انہوں نے گھر رکھ لیا۔ خود دار تھی، نوکرانی نہیں رکھا تھا مگر اس نے ساری زندگی نوکر اور مالک کے رشتے کو نبھاتے نبھاتے کاٹ دی۔ نصر اس کی گود میں کھیلا تھا۔ وہ اسے بچپن میں بی کہا کرتا تھا۔ چنانچہ فریدہ بی بی کا یہی نام پڑ گیا۔ نصر، بی کا ماں کی طرح احترام کرتا تھا۔ جب وہ یہاں سے مکان بیچ کر اپنے بنگلے میں بانسرہ گلی شفٹ ہوا تو منع کرنے کے باوجود بی نے سارا گھر کا کام سنبھال لیا مگر بوڑھی اتنی ہو گئی تھی کہ ذرا سا کام کر کے ہانپ جاتی مگر باز نہ آتی، کہتی تھی کہ اسے کام کی عادت پڑی ہوئی ہے اس لئے من خود بخود ہی کام کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ اسی لئے نصر نے بی کو یہاں واپس بھیج دیا تھا۔ مگر وہ اس کی ہر طرح کی ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ اس کو ہر چیز گھر پر ہی مہیا ہوتی تھی۔

نیلسن، چند دن تو ان کے ہاں رہی اور پھر الگ سے رہائش کا سوال پیدا ہوا۔ شہروں میں تو لوگ کرائے پر مکان دی ہی دیتے ہیں مگر مری کے علاقے میں ایسا ناممکن نہیں تو قدرے مشکل تھا۔ پھر اکیلی لڑکی! پسماندہ لوگوں کی چہ میگوئیاں، اور کوئی ناخوشگوار واقعہ۔۔۔۔ یہ سب باتیں نصر نے اس کی تقرری کے وقت شاید نہ سوچی تھیں مگر اب یہ مسئلہ پیش نظر تھا۔ آخر نصر اور سمیعہ نے تمام امکانات اور مشکلات کو نظر میں رکھتے ہوئے یہی مناسب سمجھا کہ نیلسن کو بی کے ساتھ شفٹ کر دیا جائے۔ یوں بی کو بھی ساتھ مل جائے گا اور یہ نصر کا آبائی محلّہ تھا۔ سب کو پتہ ہوگا کہ یہ لڑکی ان کے سکول کی ٹیچر ہے۔ نیلسن کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے بھی ان کا خیال تھا کہ اس کا یہاں جی لگا رہے گا۔ اور ان کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔

نیلسن کا حسن اخلاق اور اس کی شستگی نہ صرف اہل محلّہ کے بلکہ نصر کے سکول کے بہت کام آئی۔

لوگوں نے اپنے بچوں کو دوسرے سکولوں سے اٹھوا کر اس سکول میں داخل کروا دیا جس میں کہ نیلسن جیسی استاد تھی۔ تعلیم یافتہ، ہمدرد، ملنسار اور لوگوں کی مشکلات میں ان کی مدد کرنے والی۔

دراصل مری کا ہل سٹیشن صدی بھر سے انگریز کا مسکن رہا اس حوالے سے اس میں مالی آسودگی تو آئی۔ مگر یہاں کے لوگوں کے فرسودہ افکار اور روایت پرستی پر انگریز نے کوئی کام نہیں کیا۔ کیونکہ انگریز کو برصغیر میں صرف ان علاقوں یا ان لوگوں کو ترقی دی جو کہ اس کے اپنے مفاد میں تھے۔ مثلاً ریل اور سڑک لوگوں کی سہولت کے لئے نہیں تھی بلکہ ذرائع نقل و حمل ان علاقوں تک ہی گئے جہاں سے خام مال بندرگاہ تک لانا اور پھر اسے انگلستان برآمد کرنا مقصود تھا۔ اسی طرح تعلیم و تہذیب پر بھی انہی علاقوں میں توجہ دی گئی جہاں اسے رہنا اور تعلیمیافتہ یا ہنر مند افراد کی ضرورت تھی۔ برصغیر میں بڑے بڑے انگریز کے کارناموں کا سیاق و سباق اگر ملاحظہ کریں تو اس کے پیچھے انگریز کا یہی مقصد اور مفاد نظر آتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے مری کو بھی اتنی ہی ترقی دی جتنی کہ ان کے مفاد میں تھی۔ یہی باعث ہے کہ اس علاقے کو جسے کہ تحصیل کا درجہ حاصل رہا۔ ابھی تک نہ تو یہ شہر ہوا اور نہ ہی یہ قصبہ یا دیہہ۔ اس علاقے کی نوجوان نسل، بالخصوص لڑکیاں نفسیاتی سطح پر جس قرب سے گزرتی ہیں اس کا ادراک ان پڑھ اور قدامت پسند والدین کو نہیں ہوتا۔ مری کا شہر، خاص طور پر دارالحکومت سے قریب ہونا اس کی اصل رونق کا ذریعہ ہے ورنہ پاکستان میں صحت افزا اور حسین پہاڑی مقامات کی کمی نہیں مگر آسان ذرائع آمدورفت

اور اشیائے صرف کی آسان فراہمی کے باعث یہاں پاکستان بھر کے ہر طبقے کے ہر عمر کے لوگ کبھی برف باری کے لئے اور کبھی چند دن گرمی سے محفوظ رہنے اور پہاڑی مناظر سے محظوظ ہونے کے لئے جب یہاں آتے ہیں تو اپنے ساتھ وہ کلچر اور ماحول بھی لاتے ہیں۔ جو یہاں کے نوجوان لڑکے لڑکیوں نے شاید خوابوں میں بھی نہ دیکھا ہو۔ جس کے نتیجے میں ان کے اندر ایک ہیجان او ربغاوت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے مگر کیونکہ خاندانی نظام اتنا مضبوط اور طاقتور ہے کہ اس کا قدغن یا تو اخلاقی بیماریوں یا پھر نفسیاتی عارضوں کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ اکثر والدین کا خیال ہوتا ہے کہ ان کی بچی پر جن عاشق ہو گیا ہے۔ یا چڑیل چمٹ گئی ہے۔ چنانچہ وہ ان کے لئے دم درود اور ٹونے ٹوٹکے سے آگے ہی نہیں بڑھتے۔ سکول کے کام کے بعد اس کے پاس کافی وقت بچ رہتا تھا۔ نصر نے یہ بات بہ اہتمام قرب وجوار کے لوگوں کو بتا دی تھی کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے وہ اپنے خاندان سے کٹ گئی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ اہل محلہ ہر چھوٹا بڑا اس کا خیال رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ محلے کے نوجوان اور جوان لڑکے بھی سامنا ہونے پر سلام کر کے سر جھکا کر گزر جاتے تھے۔ وہ سارے محلے کی نیلی باجی تھی۔ ادھر سکول میں اس نے سٹاف سے کہا تھا کہ نیلسن ہماری سکول ٹیچر ہی نہیں بلکہ وہ ہماری مہمان ہے۔ ہمارے مذہب میں نئی نئی آئی ہے۔ اسے کسی لمحے یہ احساس نہیں ہونا چاہئے کہ وہ غلط راستے پر آ گئی ہے۔ اس پر نیلسن نے کہا۔ آپی اب یہ آپ کا نہیں یہ میرا مذہب ہے۔ مجھے سب کچھ قبول ہے۔ مجھے کسی سے رعایتی نمبر نہیں چاہئیں۔ سمیعہ نے کہا۔ تمہیں اپنی جگہ یہی سوچنا چاہئے۔ مگر یہ ہماری سوچ نہیں ہونی چاہئے۔ اس محلے میں ایک عالمہ تھی جس کے پاس وہ دین کے علم کے لئے جاتی تھی۔ یہیں سے اس کا محلے کے دیگر افراد سے ملنا گلنا شروع ہوا۔ اس کی شخصیت میں ایک ایسی کشش تھی کہ محلے کی لڑکیاں اس کی طرف کھنچی چلی آئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ enxiety اور depression کی وجہ سے یہ لڑکیاں اندر ہی اندر ٹوٹتی رہتی ہیں۔ والدین اپنے تجربے کی روشنی میں ان کے اس مرض سے بے خبر ہوتے تھے۔ ان میں صرف ان پڑھ ہی نہیں بلکہ جھیکا گلی کالج میں پڑھنے والی لڑکیاں بھی اسی طرح کے جملہ امراض میں مبتلا تھیں۔ ایک دفعہ ایک ان پڑھ لڑکی نے اسے پوچھا۔ ”نیلی باجی اگر ہم لڑکیاں ہیں تو وہ جو اوپر مال روڈ پر آتی پھرتی ہیں وہ کون ہیں۔ وہ کوئی اور مخلوق ہیں۔ نیلسن ہنس پڑی اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس لڑکی نے بات جاری رکھی، اس کا تجسس برقرار تھا۔“ ------ یہ کتنی آزاد ہیں۔ جو چاہتی ہیں کرتی ہیں۔ جیسا چاہتی ہیں بنتی ہیں پہنتی ہیں۔ کیا ان کے بھی لالے اور بھاپے

ہوتے ہیں۔؟ نیلسن نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ لڑکی کی بات جاری رہی۔''۔۔۔۔انہیں کوئی روکتا ٹوکتا نہیں۔ جو چاہتی ہیں کرتی ہیں، جہاں چاہتی ہیں جاتی ہیں۔۔۔۔ایک ہم ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے تو نہیں لگتا کہ یہ بھی ہماری طرح عورتیں ہی ہیں۔ یہ تو کسی اور دنیا کی مخلوق لگتی ہیں۔۔۔''نیلسن نے کہا۔''تم میں اور ان میں تعلیم کا فرق ہے۔ ان کے گھرانوں میں تعلیم ہے جو تمہارے ہاں نہیں ہے۔''نیلسن کی یہ بات سب کو اپیل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے۔ لوگ تعلیم کی طرف راغب ہونے لگے۔ خاص طور پر گھر کے مرد جو عورتوں کی تعلیم کے مخالف تھے ان کا خیال تھا کہ اسلام نے جس تعلیم کا حکم دیا ہے وہ صرف مذہبی تعلیم ہے اور دنیوی تعلیم سے لڑکیاں گمراہ ہوتی ہیں، مگر نیلسن کو تعلیمیافتہ اور باحیا پا کر ان کا دنیوی تعلیم پر اعتبار بیٹھ گیا تھا۔ ادھر نصر اور سمیعہ بھی اس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ عید شب برات یا کوئی بھی تہوار ہوتا۔ وہ اسے کبھی بھی اپنوں کی کمی محسوس نہ ہونے دیتے۔۔۔

محبت انسان کو کتنا باوقار بنا دیتی ہے۔۔۔!!!!!!! کبھی کبھی اسے اس کا احساس ہوتا تو اس کی نظر میں محبت کی وقعت بڑھ جاتی۔ نیلسن اپنی تنخواہ سے مستحق لوگوں کی چھپ چھپا کر مدد بھی کرتی رہتی کیونکہ اس نے حدیث کی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک ہاتھ سے یوں دو کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ گزشتہ تین سالوں میں کتنی ہی لڑکیاں اور عورتیں اپنی اپنی نجی زندگی میں اس بات کا اعتراف کرتی تھیں کہ نیلی باجی نے ہمیں گمراہ ہونے، تباہ ہونے سے بچا لیا۔ اس نے کئی گھر سے بھاگتی ہوئی لڑکیوں کو اپنی حکمت اور معاملہ فہمی سے گھروں کو واپس بھیجا تھا اور اس کی وجہ کو دور کرنے کے لئے ان کے والدین کو راضی کر کے ان کی باعزت رخصتی کا سامان کیا تھا۔ زندگی بڑی خوشگوار اور قرینہ پرور تھی کہ حالات نے کروٹ بدلی۔

پہاڑ پر تعلیمی ادارے موسم سرما کی تعطیلات میں تھے۔ وہ فجر کی نماز اور قرآن کی تلاوت کے بعد کچن والے کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا کہ بی ہاتھ میں تسبیح لئے چولہے کے پاس بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔ مٹی کے تیل کی ہلکی ہلکی بو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے بی کو تسبیح میں بلانا مناسب نہیں سمجھا اور چپ، بغیر قدموں کی آہٹ پیدا کئے بالکونی کی طرف بڑھ گئی۔ باہر ہلکی ہلکی برف باری جاری تھی۔ دور پار پہاڑوں پر اور نیچے تاحدِ نظر کھائی میں، ہر طرف برف ہی برف تھی۔ اس نے بالکونی میں پڑی برف کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔ تازہ تازہ برف۔۔۔خشک، دانے دار پاؤڈر کی طرح دودھیا برف۔۔ اس نے اندر آ کر بی سے کہا۔''بی میں

تھوڑی دیر کے لئے باہر جا کے آتی ہوں"۔
"کوئی کام ہے؟" بی نے پوچھا۔
"نہیں، بس یونہی!"

بی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔" بیٹا۔ یہ سردی تو نمونیہ کو۔۔۔۔۔" مگر نیلسن نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔" میں یونہی تھوڑی جاؤں گی۔۔۔ گرم جیکٹ پہن کر دستانے پہن کر ٹوپی پہن کر ڈھانپ ڈھوپ کر جاؤں گی۔" بی کو پتہ تھا کہ نیلسن بہت کم گھر سے باہر نکلتی تھی۔ بی کو اپنی جوانی یاد آ گئی۔ جوان لمحوں میں بارش اور برف باری اسے بھی بڑی مرغوب تھی۔ میکے میں اپنے کسی بھائی کو لے کر اور شادی کے بعد اپنے میاں کو لے کر وہ اکثر برف باری دیکھنے، اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے نکل جایا کرتی تھی۔ اس لئے اس نے جوانی کی امنگوں کا احترام کرتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

نیلسن نے گھر سے نکلنے سے پہلے گرم کپڑوں میں خود کو خوب محفوظ کر لیا تھا۔ اور گھر سے نکل کر ٹیڑھی میڑھی راہوں سے گزر کر لوئر بازار میں داخل ہو گئی۔ یہاں تازہ اور گرم گرم کلچوں اور نانوں کی خوشبو نے اسے یاد دلایا کہ اس نے تو ناشتہ بھی نہیں کی۔ چند لمحوں کے لئے رک کر اس نے دوبارہ اسی اشتہا آفریں مہک کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ مگر اب کے بار کثیف دھوئیں میں ادھ پکی ہنڈیا کی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرا کر اس کے حلق میں اتر گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ابھرے اور وہ بیزار سی ہو گئی مگر اس کی بیزاری اس کے سامنے معصوم بچے کے پھیلے ہوئے سردی سے نیلے، ننھے ننھے ہاتھ اور بھیک طلب نظروں میں ڈوب گئی۔ وہ کچھ پیسے نکال کر اسے دینا چاہتی تھی مگر سردی میں جیب سے ہاتھ نکال کر خیرات کرنا۔ اسے کافی مشکل سا لگا۔ اور وہ اسے مسکراہٹ کی خیرات دے کر لوئر بازار سے چڑھتے چڑھتے مال روڈ پر آ گئی۔ مال روڈ پر سب دکانیں بند تھیں۔ البتہ کھانے کے تمام ہوٹل کھلے تھے۔ جن کے کارندے سیاحوں اور راہیوں کو زبردستی اپنے اپنے ہوٹلوں کی طرف گھیر کر اپنی کاروباری مہمان نوازی کا شرف بخشنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کو بھی دو تین اسی طرح کے میزبانوں نے گھیرنے کی کوشش کی مگر اس کی نظروں کی ناگواری ان کے اصرار کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔ اس نے ارد گرد نظر دوڑائی، اور پیچھے مڑ کر نیچے اترتے ہوئے لوئر بازار کی طرف دیکھا۔ مری کا ایک رخ کتنا بدحال اور شکستہ اور دوسرا کتنا تابناک اور بے باک ہے۔ وہ آگے چل پڑی اس کا رخ نیچے سنی بنک کی طرف تھا۔ یہ موسم کی

پہلی برف باری تھی۔ جو ہلکی رفتار میں جاری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وقتی طور پر سردی کی شدت میں کمی آگئی تھی۔ اس وقت ماحول پر عجیب سحر طاری تھا۔ ملکہ کوہسار اپنے دام میں عجز و نیاز کے لمحے سمیٹے وہ تھی۔ روئی کے مہین گالوں کی طرح برف کے معصوم معصوم ننھے ننھے گالے آسمان کی بلندیوں سے پہاڑ کی پستی میں اتر رہے تھے۔

سنی بنک تک پہنچتے پہنچتے اس کے سامنے بہت سے بھکاری آئے اور گزر گئے۔ اس کی نظروں میں ابھی بھی وہی بھکاری بچہ تھا۔ معصوم برف کے گالوں کی طرح معصوم سردی سے لال گال، سردی سے بے پرواکسب رزق کے لئے سرگرداں۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی کمائی حرام ہے۔۔ بھکاریوں نے اپنے شکار کے لئے کہیں غباروں، کہیں کنگھیوں اور ماچسوں اور دیگر معمولی چیزوں کے جال بچھائے ہوئے تھے۔ وہ ہر گزرتے کو یہ چیزیں پیش کرتے۔ مگر ہر کوئی ان سے خریدے بغیر ہی کچھ نہ کچھ انہیں دے دیتا۔۔۔۔۔

وہ سنی بنک سے اتر کر چٹہ موڑ کی طرف آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔۔۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ البتہ کبھی کبھار کسی نچلی سڑک پر چڑھائی چڑھتے ہوئے کسی لدے ہوئے ٹرک کا پہلا گیئر چیخ چیخ کر سمع خراشی کرتا تو خاموشی میں دراڑ پڑتی محسوس ہوتی۔ مگر پھر یہ آواز کم ہوتے ہوتے کسی دوسرے پہاڑ کے پیچھے جاکر دم توڑ دیتی۔ اور پھر وہی خاموشی۔۔۔ میدانوں سے آئے ہوئے برفباری کے شوقین لوگوں کے لئے یہ مواقع بڑے دل افروز اور جانفزا ہوتے ہیں جب انہیں برف باری کے لئے طویل انتظار نہ کرنا پڑے۔ ورنہ عام طور پر تو یہ لوگ انتظار کرتے کرتے بھاری اخراجات کے بعد نامراد ہی لوٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ فطرت کے حسین مناظر کو اپنی آنکھوں کے حرکی کیمرہ سے ذہن کے سلولائیڈ پر منتقل کرنے میں معروف اور مسرور و مست تھے۔ وہ انہیں دیکھتے دیکھتے اپنی دھن میں مگن چلی جارہی تھی۔ کدھر کس سے ملنے۔؟ وہ تو کسی ایسی بے چین روح کی طرح جس کا ریموٹ قدرت کے ہاتھ میں ہو، چلتی جارہی تھی۔ ابھی تک برف باری کے باعث ہوا معطل تھی۔ سپیدہ سحر فضا سے اتر کر برف کی صورت میں ہر جانب پھیل گیا تھا۔ اس نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا دن کے گیارہ بج رہے تھے مگر صبح صادق کا گمان غالب تھا۔ اس رومان پرور موسم میں اس کے مزاج نے فوراً کروٹ بدلی اور اسے کسی کی کمی محسوس ہوئی مگر کس کی۔۔؟ جسے وہ چھوڑ آئی تھی۔ یا جس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ سوچ کر اس کے مزاج کی رنگینی پھیکی پڑ گئی اور حسن نظارہ حسرت و محرومی میں ڈوب گئی۔

نصر نے گاڑی روک کر سمیعہ کی توجہ نیلسن کی طرف دلائی۔ جو چند موڑ سے بانسرہ گلی کی طرف مڑ رہی تھی۔ "یہ اس برف بھرے موسم میں کدھر جا رہی ہے۔" سمیعہ نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔ نصر نے اس کی بات سن کر کہا۔ "پریشان روح ہے۔ ایسی روحوں کے لئے ایسے موسم بڑا اضطراب لیکر آتے ہیں۔ پھر اس نے سمیعہ سے پوچھا۔ "تم نے بات کی نیلسن سے" سمیعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "سوچتی ہوں کس طرح بات کروں اور پھر کوئی لڑکا بھی تو نظر میں ہو۔!!" نصر نے جواب دیا "بھئی تم بات تو کر دیکھو پہلے۔ امید ہے لڑکا بھی اچھا ہی ملے گا۔" رینگتے رینگتے ان کی جیپ نیلسن کے پاس پہنچ گئی۔ نصر نے ہلکا سا ہارن دیا تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ نصر نے اسے جیپ پر سوار ہونے کو کہا۔ اور نیلسن کچھ پس وپیش کئے بغیر ہی جیپ میں بیٹھ گئی۔

"کہاں جا رہی تھی۔" سمیعہ نے اگلی سیٹ سے گردن اس کی طرف پیچھے موڑ کر پوچھا۔

"کہاں جانا ہے بس یونہی۔۔۔"

"موسم کا لطف لے رہی تھی" نصر نے اس کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور نیلسن ذرا شرما گئی۔

"آپ لوگ کدھر جا رہے ہیں"

"ہم بھی۔۔۔ بس یونہی۔۔" سمیعہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر نصر سے مخاطب ہوئی۔ "میں پیچھے نیلی کے ساتھ جا رہی ہوں۔" اور پچھلی سیٹ پر آ کر نیلسن کے ساتھ بیٹھ گئی۔ نصر نے سمیعہ کے لئے آسانی سے بیٹھنے کے لئے اپنی سیٹ کو ذرا سا آگے کر لیا اور پیچھے مڑ کر پوچھا۔ "کدھر؟"

سمیعہ نے نیلسن کی طرف دیکھا اور سر کو جنبش دے کر پوچھا۔ نیلسن نے کہا۔ "میں تو۔۔ بس۔۔۔"

"میں تو بس یونہی۔۔۔" اس بار نصر نے اس کے الفاظ دہرائے اور دونوں ہنس پڑے۔

سمیعہ نے کہا۔ "بات ہو گئی ایک بار۔ آپ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں اور۔۔۔"

"پھر پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔" نصر نے ہنستے ہوئے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

سمیعہ نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔ "۔۔اور کیا!"

نصر مذاق کے موڈ میں تھا۔ فوراً بولا۔ "یہ بات تو ہے دیکھو! کب سے تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔۔ بلکہ اب تو تمہارے پیچھے پیچھے لگا ہوا ہوں۔" سمیعہ شرما گئی۔ "اب چلئے بھی ی ی! ۔۔آپ کو بڈھے وارے جوانوں والے مذاق سوجھ رہے ہیں۔"

اس دوران نیلسن بھی کچھ ریلیکس ہو چکی تھی۔ فوراً بولی۔ "موسم کا اثر ہے۔"

سمیعہ قہقہائی۔ نصر ذرا سا کھسیانا ہو گیا۔ اور کچھ کہے بغیر اس نے گاڑی گیئر میں ڈال دی۔ ایک معمولی

سے جھٹکے سے جیپ چل پڑی۔

"پہلے گھر چلتے ہیں، وہاں سے شاہ جی کو فون کرتے ہیں کہ گرم گرم پکوڑے بنوایئے۔ ہم آ رہے ہیں۔" سمیعہ نے پروگرام بتا دیا اور نیلسن سے پوچھا۔ "کیوں نیلی۔۔؟" نیلسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ ٹیلی فون ڈیڈ ہے۔ سمیعہ نے بچوں کی طرح افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔"ہائے اتنا جی چاہ رہا تھا آج شاہ جی کے گھر جا کر پکوڑے کھانے کو۔۔۔"

"نصر نے کہا اپنی خواہش واضح کرو۔ پوری کرنے کا اہتمام کر دیا جائے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم پکوڑے کھانا چاہتی ہو، تو گھر میں بن سکتے ہیں۔ اور اگر شاہ جی کی طرف ہی جا کر کھانا چاہتی ہو تو پھر چلتے ہیں۔ شاہ جی کی گاڑھی اور گہری باتیں بھی سنیں گے اور۔۔۔۔"

"یہ ٹھیک ہے۔۔۔" سمیعہ نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "کیوں نیلی۔۔؟"

"مگر کیا بغیر اطلاع اور اس برف باری میں۔۔۔ مناسب رہے گا؟" نیلسن نے خیال ظاہر کیا۔ نصر نے کہا۔ "درویشوں کے ڈیرے بلا تکلف ہوتے ہیں۔ جاؤ تو خوش، نہ جاؤ تو گلہ نہیں! فون کرنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ پکوڑوں کے بننے کا انتظار نہ کرنا پڑے۔۔"

جب سے وہ یہاں آئی تھی صرف ایک دو بار ہی ان کے ہاں گئی تھی؛ ایک بار سال بھر پہلے، ان کی منجھلی بیٹی، نادرہ کی شادی پر جسے چند ماہ پہلے طلاق ہو گئی تھی اور ایک دو مرتبہ اسی طرح سمیعہ کے ساتھ۔۔ اسے شاہ جی کی باتوں میں بڑا آنند ملا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کبھی اکیلی ان کے پاس آئے۔ ان کے تبحر علمی سے ان کی حقیقت پسند باتوں سے اور اسلام کے بارے میں ذہن میں ابھرنے والے سوالات کے جوابات دریافت کرے۔ مگر کبھی موقع ہی نہیں ملا تھا اور نہ ہی کبھی موقع بنا، کہ موڈ بنا کر ان کے پاس جائے۔ حالانکہ ان کی بڑی بیٹی ام کلثوم، جس کی لاہور میں شادی ہوئی تھی۔ اس کی ایک سہیلی افشیں جو مری میں ایڈووکیٹ تھی۔ وہ جب بھی لاہور سے آتی تو اس سے ملنے مری آتی تو نیلسن سے بھی ضرور ملتی۔ نیلسن کو اس سے مل کر ایک گونہ تسکین اور مسرت ہوتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ اس روک لے اور اس کے ساتھ بہت سی باتیں کرے۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے رات یہیں ٹھہر جانے کے لئے کہا بھی مگر وہ آئندہ کسی موقعے پر آنے کا کہہ کر چلی گئی، کئی مرتبہ اس نے بھی نیلسن کو لاہور اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اور نیلسن نے اسے کہہ رکھا تھا کہ

جب لاہور آئے گی تو اس کے ہاں ہی ٹھہرے گی۔ ہر بار وہ جب آتی تو اس سے پوچھتی کہ لاہور کیوں نہیں آئی۔ نیلسن ٹال ٹول دیتی۔

آج بھی جب وہ شاہ جی کے ہاں پہنچے تو ام کلثوم آئی ہوئی تھی۔ وہ نیلسن سے لپٹ کر ملی۔ ایک تسکین کی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ کچھ لمحے اور اوہ یونہی اس کے سینے سے لگی رہے۔ مگر گلے لگانے اور الگ ہونے کا عمل اسی کی طرف سے شروع اور ختم ہوا۔ ام کلثوم نے حسب سابق لاہور نہ آنے کا گلہ کیا۔ نیلسن نے سمیعہ کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میں اسے کیا بتاؤں کہ جس شہر میں میرا سب کچھ چھن گیا۔ وہاں میں کیا لینے آؤں؟

''ہاں بیٹا کبھی ہو آؤ، تمہارا شہر ہے'' شاہ جی نے بڑے پیار سے کہا۔ جواباً نیلسن نے شاہ جی کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو، شاہ جی آپ کا فرمانا درست مگر۔۔۔'' وہ چپ کر گئی۔ شاہ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہماری بیٹی یہ سوچ رہی ہے کہ جس شہر نے اس۔۔۔۔۔'' نیلسن نے چونک کر شاہ جی کی طرف دیکھا۔ شاہ جی نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر میز پر پڑے گلاس میں جگ سے پانی انڈھیلا اور گلاس ہاتھ میں لے کر بولے۔ ''تم یونیورسٹیوں کے پڑھے لکھے ہو اس لئے تمہیں تمہاری پڑھی ہوئی مثال ہی دینی پڑتی ہے۔۔ اس گلاس کی کیفیت کو بیان کرنے کے دو طریقے ہیں۔۔۔'' نصر اور سمیعہ اور ام کلثوم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جبکہ نیلسن سر جھکائے بیٹھی نیچی نظروں سے گلاس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کی سوالیہ خاموشی کے بعد شاہ جی کی آواز گونجی۔ ''یہ perception اور acceptance کی بات ہے۔ مگر اس کا تعلق بھی perceive کرنے والے کے aptitude اور attitude سے ہے۔

چنانچہ optimist اس سچائی کو یوں بیان کرے گا کہ آدھا گلاس بھرا ہوا ہے۔ جبکہ pessimist کہے گا کہ آدھا گلاس خالی ہے۔۔۔ دونوں کے بیانات درست ہیں۔ دونوں نے سچائی بیان کی ہے مگر۔۔۔۔۔۔! شاہ جی نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کہا۔ ''سچائی کا ایک رخ یہ بھی تو ہے نا۔ کہ جس شہر نے تمہیں ایمان کی دولت سے نوازا۔ تم اسے اپنا قبلہ نما بھی تو کہہ سکتی ہو۔ جس شہر نے تمہیں شہرے سے دور وقعت اور اعتبار عطا کیا۔ یہ سب اسی شہر کا فیض ہے بیٹی۔ شہروں کا شہر۔۔ زندہ دلوں کا، زندہ لوگوں کا شہر۔۔۔ میاں میر کا شہر، شاہ محمد غوث کا شہر، شاہ زنجان کا شہر، اور سید ہجویر کا شہر۔ جن کے فیض سے لاہور خلدِ بریں ہے۔۔۔۔'' شاہ جی نے لفظ شہر کی تکرار کے بعد گونج دار لہجے میں علامہ اقبال کا شعر پڑھا۔

خاک پنجاب از دم او زندہ گشت
صبح ما از مہر او تابندہ گشت

تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی پھر شاہ جی کی چھوٹی بیٹی گرم گرم چائے اور پکوڑے لے کر اندر داخل ہوئی۔ نصر نے کہا۔''شاہ جی دراصل ہم آپ کو فون کر کے آنا چاہتے تھے ----'' شاہ جی نے کہا۔'' چلو بغیر فون کے کام ہو گیا۔'' شاہ جی کی بیٹی جو ٹرے لے کر آئی تھی اس نے کہا۔'' پئی جان! (بھائی جان کا مقامی لہجہ) شاہ ابو نے ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی گھر میں آواز دے دی تھی کہ پکوڑے بناؤ۔ مہمان آرہے ہیں۔'' نیلسن دوسری بار چونکی اور اس نے سمیعہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ سمیعہ نے فخر سے سر اٹھا کر، ہلا کر کہا۔'' ہمارے شاہ جی کو سب پتہ ہوتا ہے--''

''--نا بیٹا ---مجھے کچھ نہیں پتہ ہوتا۔-وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے----کچھ پتہ نہیں ہوتا۔'' تھوڑی دیر چپ رہ کر شاہ جی نے بڑے آزردہ لہجے میں کہا۔-'' اگر مجھے پتہ ہوتا کہ چند ماہ بعد نادرہ گھر واپس آجائے گی تو کیا میں اس کی شادی وہاں کرتا؟ ---میں نے کتنے گرتے گھر سنبھالتے مگر اپنی بیٹی کا گھر نہ بچا سکا-------'' اب ایک باپ بول رہا تھا۔ جس کے لہجے میں اس کے دل کا سارا درد اتر آیا تھا۔ باپ کو دکھی دیکھ کر نادرہ کی آنکھیں بھر آئیں، سمیعہ بھی اشکبار تھی۔ شاہ جی کا یہ روپ انسان کے مختلف درجوں اور پرتوں کے راز کھول رہا تھا۔ نیلسن بڑے غور اور اشتیاق سے انہیں سن رہی تھی۔-وہ کہہ رہے تھے۔''--انسان جتنا بھی مدبر کیوں نہ ہوں مقدر کا والی نہیں ہو سکتا۔'' اب پھر ان کے اندر کا درویش بول رہا تھا۔

کر نہیں سکتی رفو تقدیر کا دامانِ چاک
سوزنِ تدبیر گر ساری عمر سیتی رہے

مغرب کی نماز کے بعد یہ لوگ شاہ جی کے ہاں سے نکلے تو شاہ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہماری جوانی کے دور میں ایک گانا بڑا مشہور ہوا تھا۔ زندگی کے سفر میں گزر جاتے ہیں جو مقام، وہ پھر نہیں آتے------اس کا ایک مصرع تھا-------

آدمی ٹھیک سے دیکھ پاتا نہیں اور پردے پہ منظر بدل جاتا ہے

اس لئے جس سے ملو، یوں ملو کہ یہ آپ کی اس سے آخری ملاقات ہے----زندگی کی ہر ملاقات آخری ملاقات ہوتی ہے۔ جانے کل کو یا جانے پل کو کیا ہو جائے---کیا پتہ کب پردے پر منظر

بدل جائے اور آدمی دیکھتا رہ جائے، ہاتھ ملتا رہ جائے۔

فی امان اللہ۔ کہہ کر شاہ جی نے انہیں گھر سے رخصت کیا۔ راستے میں سمیعہ نے برسبیل گفتگو کہا۔ "چلو اچھا ہو گیا۔ تم بھی مل گئیں، شاہ جی سے ملاقات ہو گئی۔ دن اچھا گزر گیا۔" نصر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ غور سے آگے دیکھ رہا تھا جیپ کی رفتار آہستہ تھی۔ حالانکہ برف باری تو سر شام ہی تھم چکی تھی مگر برف جمنے کی وجہ سے سڑک پر پھسلن تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ شاید سمیعہ تو نہیں مگر نیلسن نے خاص طور پر محسوس کیا تھا کہ شاہ جی کے ہاں سے نکلتے وقت ہی سے اس کا چہرہ بند بند سا لگ رہا تھا۔ ایک دو بار وہ دوران گفتگو وہ مسکرایا بھی تھا تو مگر یہ مسکراہٹ بھی سرسری تھی۔ پہلے وہ اکثر اسے جھیکا گلی کے راستے مال روڈ پر اور بعض دفعہ تو لوئر بازار تک بھی چھوڑا کرتے تھے کیوں کہ نصر کے پاس مال روڈ پر جانے کا پرمٹ تھا۔ مگر آج نصر نے نیلسن کو نیچے مری بس سٹینڈ کے پاس ہی ڈراپ کر دیا۔ اس وقت شام کے سات ساڑھے سات بجے تھے۔ برف پڑنے کے بعد ہوا چلنے سے سردی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ جبکہ سڑک پر پھسلن اور کم روشنی کے باعث وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہی تھی۔ اکا دکا گزرتے عباسی نوجوان اسے مڑ مڑ کر عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر اس کی بے تعلقی پر وہ کچھ کہنے نہ پا رہے تھے۔ اسے اوپر مال روڈ تک آنے میں کوئی دس منٹ لگے۔ مگر یہ دس منٹ تھے بہت بھاری۔ مال روڈ پر پہنچ کر دلکشا ہوٹل کے سامنے چند لمحوں کے لئے رک کر اس نے اپنی سانسیں درست کیں۔ مال پر قدرے رونق تھی۔ لوگ جی پی او سے پنڈی پوائنٹ تک مٹر گشت کرتے نظر آ رہے تھے۔ جانے کیوں اس کا بھی جی چاہا کہ کچھ دیر مال روڈ پر چہل قدمی کرے۔ ایک آس سی بندھ رہی تھی کہ لاہور سے آنے والوں میں ہو سکتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔!! وہ اپنی اس خوش خیالی پر یوں مسکرا دی جیسے کوئی بڑا کسی چھوٹے بچے کے بچگانہ سوال پر مسکرا دے۔ وہ مال روڈ پار کر کے لوئر بازار کی طرف اتر گئی۔

گھر پہنچنے تک وہ بری طرح تھک چکی تھی۔ بی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی۔ اس نے بی کا انتظار کرنے کے بجائے کمرے میں پہنچ کر بے دلی اور تھکاوٹ کے باعث خود کو پلنگ پر دھڑام سے گرا دیا۔ جس پر سال خوردہ پلنگ نے چیخ کر اس کی بدلحاظی پر شدید احتجاج کیا مگر وہ اس قدر تھک چکی تھی کہ اسنے اس احتجاج کا کوئی نوٹس نہ لیا۔۔ جلد ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ شاید سوئی بھی تھی کہ نہیں۔ اسے یوں لگا جیسے بی نے اسے سونے سے پہلے ہی جگا دیا ہو۔۔۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اس لئے پڑی رہی مگر جب بی اسے جھنجھوڑا تو وہ ایکدم گھبرا کر اٹھ

گئی۔بی نے اسے کبھی سوتے میں نہیں جگایا تھا۔خدا خیر کرے۔"بی کیا بات ہے۔"اس نے نیند بھری آواز میں پوچھا۔مگر بی نے جواب دینے کے بجائے اس کے گلے لگ کے سسکنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!!!

جب سمیعہ اور نصر اسے ڈراپ کر کے واپس گھر جا رہے تھے تو چند موڑ سے مڑتے ہوئے ان کی جیپ سامنے سے آنے والی ایک بس سے ٹکرا گئی اور۔۔۔۔۔ پردے پہ منظر بدل گیا۔شاہ جی کے الفاظ اس کے ذہن کے گنبد میں گونج رہے تھے۔۔۔۔جس سے ملو، یوں ملو کہ یہ آپ کی اس سے آخری ملاقات ہے۔۔زندگی کی ہر ملاقات آخری ملاقات ہوتی ہے۔نجانے کل کو یا جانے پل کو کیا ہو جائے۔شاہ جی کے ہاں سے آتے ہوئے نصر کے مزاج کی تبدیلی، اس کا نیلسن کو مال کے بجائے نیچے ڈراپ کرنا۔۔اس کا فکر مند چہرہ۔۔سمیعہ کا کہا ہوا جملہ۔۔۔چلو اچھا ہو گیا۔تم بھی مل گئیں، شاہ جی سے ملاقات ہو گئی۔دن اچھا گزر گیا۔۔سب ایک فلم کی طرح اس کی سوچوں کے کینوس پر آ گیا۔۔۔۔!!!

شاہ جی نے ٹھیک کہا تھا۔وہ سمیعہ سے ساتھ اس کی آخری ملاقات تھی۔شاہ جی نے ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سمیعہ کا جنازہ پڑھایا۔اور ان کے گھر کے اوپر جس قبرستان سے گزر کر وہ کل السلام علیکم یا اہل القبور کہ گزری تھی۔اسی قبرستان میں سمیعہ کو منوں مٹی تلے دفن کر دیا گیا۔ساری زندگی ساتھ رہنے والا، ساتھ نبھانے والا جاتے ہوئے اسے الوداع بھی نہ کہہ سکا۔وہ تو سول ہسپتال مری میں بستر پر بے ہوش پڑا تھا۔اس کے بائیں بازو اور ٹانگ پر تین جگہ فریکچر تھے۔

کوئی تین ماہ کا عرصہ تو وہ ہسپتال ہی میں رہا۔اس دوران شاہ جی کی طرف سے کوئی نہ کوئی فرد ہر روز آ کر نصر کی تیمارداری کرتا۔کبھی کبھار ساہ جی بھی آ جاتے۔تو ہسپتال میں ایک سماں بندھ جاتا۔ایم ایس سے لے کر وارڈ بائے تک، ہر کوئی ان کے نیاز حاصل کرنے چلا آتا۔پھر نیلسن اسے گھر میں لے آئی۔یہاں اس کی دیکھ بھال کے لئے نیلسن نے نائل کو لکھا۔وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر یہاں آ گئی۔۔کیونکہ ان حالات میں نصر کی دیکھ بھال اور گھر میں میڈیکل ٹریٹمنٹ کے علاوہ اس کی موجودگی کا احساس ہی نیلسن کے لیے بھی ہمت افزا تھا۔شاہ جی کے گھر کے افراد کا یہاں بھی آنا باقاعدہ رہا۔اب اکثر ان کا بڑا بیٹا کیپٹن محسن شاہ جی کی باری دیتا۔وہ ہفتے میں دو تین بار نصر کو پوچھنے آتا۔نائل کی چھٹی ختم ہو گئی تو نصر کی تیمارداری کے لئے بی اور نیلسن ہی رہ گئے مگر

اس کے بعد بھی وہ ہر ویک اینڈ پر یہاں آجاتی۔ تاآنکہ نصر بستر سے اٹھ کر گھر سے باہر آنے کے قابل ہو گیا۔

نصر کو بحال ہونے میں ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ گیا۔ اس دوران اس نے اور بی نے مل کر گھریلو اور سکول کے سارے معاملات کو سنبھالا۔ وہ صبح گھر سے نکلتی۔ سکول جاتی، پڑھانے کے علاوہ سکول کے انتظامی معاملات کو دیکھتی۔ چھٹی کے بعد وہ نصر کے ہاں آتی جہاں بی اور نصر کھانے پر اس کا انتظار کر رہے ہوتے۔ کھانے کے بعد وہ نصر کو سکول کے معاملات کے بارے میں آگاہ کرتی۔ اور سہ پہر کو بورڈنگ میں چلی جاتی اور بورڈنگ کے تمام امور کی نگرانی کرتی۔ وہ رات کا کھانا بوجوہ بورڈنگ میں کھاتی۔ اس کے لئے اس نے میس مینجر سے کہہ رکھا تھا کہ اس کے کھانے کا حساب رکھے اور ہر ماہ اس کو بل بھیج کر رقم وصول کیا کرے۔ اس طرح اسے ایک تو کھانا پکانے کی مصروفیت کا وقت بورڈنگ میں صرف کرنے کا موقع مل جاتا تو دوسرا، نصر کی غیر موجودگی میں بھی کھانے کا معیار بھی برقرار تھا۔ کیونکہ میس کے ملازمین کو پتہ تھا کہ نیلسن یہیں کھانا کھاتی ہے اور وہ وقتاً فوقتاً بچوں اور ان کے دیگر لواحقین سے بھی ازخود بورڈنگ کے بارے میں ان کی شکایت یا تجاویز دریافت کرتی رہتی تھی۔ وہاں سے واپسی پر وہ سکول کا چکر لگاتی۔ اور رات گئے وہ گھر جا کر کپڑے بدل کر اگلے دن کے لئے اپنا لباس تیار کر کے بستر پر لیٹ جاتی۔ پھر جب نصر نے ویل چیئر پر گھر سے باہر نکلنا شروع کر دیا

تو اس کے معمولات میں ذرا تبدیلی آگئی۔ ہر چند اس کی مصروفیات تو کم نہ ہوئیں مگر ذمہ داری کا بوجھ ضرور بٹ گیا۔ اب وہ بورڈنگ سے نصر کے ہاں جاتی کیونکہ اور اسے ویل چیئر پر لے کر گھر سے باہر نکلتی۔ بانسرہ گلی کے اردگرد لارنس کالج کی ہموار سڑک اور گراؤنڈ کا چکر لگواتی اور کچھ دیر اس کے ساتھ ادھر ادھر کی اور سکول کے معاملات کے بارے میں باتیں کرتی۔ پھر اسے گھر واپس چھوڑ کر بورڈنگ میں آتی اور وہاں سے ڈرائیور اسے شوہالہ، اس کے گھر چھوڑ دیتا۔ پھر آہستہ آہستہ ،ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق اس نے کبھی کبھی سکول اور بورڈنگ میں بھی جانا شروع کر دیا۔ اس طرح نیلسن کی ذمہ داری ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ البتہ وہ تمام وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ نصر کے لئے یہ بات بڑی حوصلہ افزا بلکہ انتہائی خوشی کا باعث تھی کہ اس کی بیماری کے دوران نیلسن نے تمام معاملات بڑے احسن طریقے سے چلائے تھے۔ اسے کسی طرف سے اس کے بارے میں، کسی قسم کی شکایت نہیں ملی تھی۔ تمام حسابات کے رجسٹر update تھے۔ پھر وہ

ویل چیئر سے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق بیساکھیوں پر آ گیا۔ جس دن وہ بیساکھیوں پر سکول آیا۔ تو ہر کسی نے اسے اس پیش رفت پر مبارکباد دی۔ اس نے ڈاکٹر کی ہدایت کے بارے میں نیلسن کو نہ بتایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نیلسن کو سرپرائز دے گا۔ اور وہ یقیناً یہ دیکھ کر خوش ہوگی۔ مگر نیلسن نے اسے بیساکھیوں پر آتے دیکھ کر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔۔۔

انسان ہمیشہ کسی نہ کسی منفی رویے کی زد میں رہتا ہے۔ چنانچہ نصر نے نیلسن کی تمام خدمات کو یکسر فراموش کرتے ہوئے سوچا کہ شاید اسے اپنی supremacy کے ختم ہو جانے پر دھچکہ لگا ہے کیونکہ وہ اب اس قابل ہو گیا ہے کہ خود سارے معاملات کو دیکھ سکے۔ اب وہ اس کا دست نگر نہیں رہا۔ مگر پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے اس کا یہ خیال غلط ہو۔ ہو سکتا ہے نیلسن کا دھیان ہی اس طرف نہ گیا ہو۔ لیکن اس کا دل اپنی اس دلیل سے مطمئن نہ ہوا۔ وہ سکول میں جتنی دیر رہا الجھا سا رہا۔

شام میں نیلسن جب اس کے ہاں آئی تو اس نے پوچھا۔ ''نیلی تم مجھ سے ناراض ہو۔''

''جی!'' نیلسن نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو کس نے کہا؟''

''کہا تو کسی نے نہیں۔'' نصر نے دیکھا کہ بی چائے لے کر آ گئی۔ وہ چپ کر گیا۔ بی نے چائے رکھی۔ نصر نے کہا۔ ''بی! چائے ہم آ کر پئیں گے۔۔۔ چلو نیلی پلیز ذرا باہر چلیں!'' یہ کہہ کر اس نے اپنی بیساکھیاں پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا مگر نیلسن نے بڑھ کر کونے میں رکھی ویل چیئر کھینچ کر آگے کر دی۔ نصر نے بیساکھی کے سہارے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ok its''

نیلسن نے غیر ارادی طور پر کہا۔ ''ok not its sir no'' اس کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔ نصر نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کرسی آگے کر دی، اس کی نظروں میں التجا تھی۔ نصر مسکرا کر کچھ کہے بغیر کھسک کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بیساکھیاں نیلسن کو پکڑا دیں مگر اس نے بیساکھیوں کو نہایت ناپسندیدگی سے دیوار کے ساتھ گرا دیا اور چیئر کھے کر باہر آ گئی۔۔۔۔ وہ اپنے روزمرہ، مقررہ رستے پر چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ نصر نے اسے رکنے کو کہا۔ وہ اس کے غیر معمولی رویے پر اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر رکتے ہی نیلسن نے کہا۔ ''سر ایک بات کہوں''

''کہو!''

''آپ یہ بیساکھیوں پر۔۔۔'' اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ چند لمحے چپ رہنے کے بعد اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ میرے سامنے ان بیساکھیوں پر مت۔۔۔۔! پتہ نہیں کیوں

مجھے تکلیف ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔آپ کو ان بیساکھیوں پر چلتے دیکھ کر۔۔۔آپ برا مت مانئے گا۔مگر۔۔۔!!"

نصر نے اس کا لہجہ، اس کا ایک ایک لفظ تول کر سنا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ صبح نیلسن کے رویے کا سبب کیا تھا۔اس نے اپنی الجھن دور ہونے پر سکون کا سانس کھینچا اور ہنستے ہوئے بولا۔"ٹھیک ہے۔ جیسے تم کہو۔آئندہ تم مجھے۔۔۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔"میں سر آپ کو اپنے پاؤں پر چلتا دیکھنا چاہتی ہوں۔حالانکہ یہ ویل چیئر بھی تو۔۔مگر شاید یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے I can't see "
نصر نے اسے پیار اور احسانمندی کے ملے جلے رنگوں سے بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔"میں سمجھتا ہوں نیلی، ایسا ہوتا ہے۔" پھر اس نے دل ہی دل میں کہا۔ 'یہ دل کے رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ سانس لینے سے بن جاتے ہیں اور سانس لینے سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اسے یاد آیا کہ وہ اور سمیعہ پہروں دھوپ میں یہاں بیٹھے رہا کرتے تھے بے اختیار اس نے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

انہی راستوں نے جن پہ کبھی گامزن تھے دونوں
مجھے روک روک پوچھا، تیرا ہمسفر کہاں ہے؟

نیلسن نے پوچھا۔"سر آپ کو سمیعہ آپی یاد آرہی ہے نا۔ مجھے بھی بہت یاد آتی ہے۔" نیلسن کا لہجہ بھی بھر گیا۔

"مجھے تو وہ بھولتی ہی نہیں۔ یاد تو اسے کرتے ہیں جسے بھول گئے ہوں۔۔مگر کبھی کبھی بہت یاد آتی ہے۔اس آنکھیں خشک تھیں مگر لہجہ آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ نیلسن کا دل بھر آیا۔ کچھ دیر تک دونوں اپنی اپنی دنیا میں سمیعہ کو دیکھتے رہے۔ پھر نصر نے کہا۔"چلیں نیلی! شام ہو رہی ہے۔ تمہیں گھر بھی جانا ہے۔" اور نیلی نے کچھ کہے بغیر چیئر کو موڑ کر گھر کی طرف کھینا شروع کر دیا۔

چند ماہ بعد نصر مکمل طور پر صحت یاب ہو کر باہر آگیا۔ تو نیلسن کو کچھ فرصت ملی۔ زندگی اسی طرح چل رہی تھی۔ بس دو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ اول یہ کہ سمیعہ منظر سے ہٹ گئی تھی۔ دوم نصر کا رویہ اب اس کے ساتھ مالک ملازم کا نہ تھا۔ بلکہ وہ اسے سکول کے اور دیگر معاملات میں بطور مشیر شریک کرتا۔ کبھی کبھار نائل بھی ایک آدھ روز کے لئے آجاتی تو نیلسن کا ویک اینڈ اچھا گزر جاتا۔ جب نائل آتی تو وہ تینوں کبھی نتھیا گلی، ایوبیہ کبھی اپر ٹوپہ، بھور بن اور کوہالے، دریائے جہلم کی طرف نکل جاتے۔ اور کبھی وہ شاہ جی کی طرف چلے جاتے۔ ان سے، ان کی، سنتے اپنی کہتے۔ اس

طرح وقت اچھا گزر جاتا۔ بلکہ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ نائل کا انتظار کرتے رہتے۔ بعض دفعہ وہ اپنی ڈیوٹی شیڈیول کے باعث نہ آپاتی تو نیلسن گھر میں پڑے پڑے بہت بور ہوتی۔ کیونکہ وہ اکیلی کبھی نصر کے ساتھ نہ گئی تھی اور نہ ہی شاید نصر نے کبھی اسے کہنا مناسب سمجھا کہ وہ اسے سیر کے لئے اس کے ساتھ جانے کو کہے۔ نائل بھی یہاں ایسے آتی جیسے بیٹی میکے آئے۔

ایک دن جب وہ سیر کے لئے نکلے تو نصر نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یاد آیا کہ شاہ جی نے کہا تھا کہ جب نائل آئے تو اسے لے کر آنا'' نائل نے سوالیہ نظروں سے نصر کی طرف دیکھا۔ نصر نے کہا ہوسکتا ہے کوئی کام ہو۔''

نیلسن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔'' کیا کام ہوسکتا ہے۔۔۔ اللہ والوں کو کسی سے کیا کام ہوسکتا ہے؟''

''کیوں اللہ والے انسانوں والے نہیں ہوتے۔؟'' نصر نے کہا اور پھر پوچھا۔'' کیا خیال ہے ،موڑوں؟''

نیلسن اور نائل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بیک وقت دونوں کے منہ سے نکلا۔''چلیں'' اور نصر نے کلڈنہ سے گاڑی جھیکا گلی کی طرف موڑ دی۔ نیلسن نے کہا کہ یہ تو آپ جھیکا گلی کی طرف جا رہے ہیں۔۔''

نصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔''مری کے پہاڑ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے اردگرد سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہم جھیکا گلی سے دائیں طرف مال کی طرف جانے کے بجائے اگلی سڑک پر پڑ جائیں گے وہ سیدھی بانسرہ گلی سے نکل کر مری روڈ پر جا ملتی ہے۔''

''شاہ جی کو نائل سے کیا کام ۔۔۔'' نیلسن کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ نصر نے ہنستے ہوئے کہا۔'' اکبری منڈی لاہور سے چھوہارے منگوانے ہیں۔'' نائل قہقہ لگا کر ہنسی اور نیلسن کھسیانی سی ہوگئی۔ نصر نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔'' میرا خیال ہے ان کی بیٹی ام کلثوم بھی لاہور میں رہتی ہے شاید ہسپتال کے حوالے سے کوئی کام ہو۔۔۔'' اسی طرح وہ قیاس آرائیاں کرتے جب وہ فارسٹ ریسٹ ہاؤس سے گزر رہے تھے تو نیلسن نے دیکھا کہ ام کلثوم اپنے سال بھر کے بیٹے کو گود میں اٹھائے ہوئے بلیچھاں کی دیہی ڈسپنسری سے نیچے اتر رہی تھی۔ اس نے نصر کو گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ اور ام کلثوم کو بھی گاڑی میں بٹھالیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے بچے کی بخار کی دوا لینے کے لئے آئی تھی۔ نیلسن نے ام کلثوم کا اس سے تعارف کروایا اور نائل کو بتایا کہ شاہ جی کی اسی

بیٹی کا وہ ابھی ذکر کر رہے تھے ام کلثوم نے بتایا کہ لاہور میں وحدت کالونی میں سرکاری رہائش گاہ میں رہتی ہے اور اس کا شوہر گورنمنٹ ایف سی کالج میں پروفیسر ہے۔ نیلسن کو بھی آج ہی پتہ چلا تھا کہ وہ وحدت کالونی میں رہتی ہے۔ نوازش بھی تو وحدت کالونی ہی میں رہتا تھا اور وہ نیو کیمپس یہیں سے گزر کر جایا کرتی تھی۔ یونیورسٹی کی بس کا یہی روٹ تھا۔ اولڈ کیمپس سے نیو کیمپس براستہ اچھرہ، مسلم ٹاؤن، وحدت روڈ اور پھر نہر کا وہ پل۔ جس کے بارے میں نوازش یہ شعر پڑھ کر اسے چھیڑا کرتا تھا۔

وہ چلی جائے گی ڈگری لے کے اپنی ماں کے گھر
اور تو کیمپس کے پل سے دیکھتا رہ جائے گا

''کاش! نوازش تم ملتے تو میں تمہیں بتاتی کہ میں ڈگری لے کر ماں کے گھر گئی یا در بدر ہوگئی۔'' اس نے خود سے کلام کیا۔ اس وقت وہ ذہنی طور پر لاہور میں پھر رہی تھی۔ نوازش تھا اور وہ تھی اور زندگی کی وہی رعنائیاں۔۔۔۔ وہ انہی سوچوں میں گم رہی۔ تا آنکہ وہ گھوڑا گلی پہنچ گئے۔ اور گاڑی روک کر جب نصر نے اسے اترنے کے لئے کہا تو وہ چونکی اور دروازہ کھول کر وہ سب باری باری نیچے اترے۔ اور ڈھلوان میں شاہ جی کے گھر کی طرف چل پڑے۔ نصر غیر ارادی طور پر سمیعہ کی قبر کی طرف چلا گیا۔ ام کلثوم تیز تیز قدم اٹھاتی ان سے آگے آگے چل رہی تھی۔ دراصل وہ جا کر پیشگی گھر ان کی آمد کی اطلاع دینا چاہ رہی تھی۔ مگر جب وہ قبرستان کا موڑ مڑی تو سامنے برآمدے کے باہر شاہ جی کھڑے تھے۔ اور بیٹی کو دیکھتے ہی بولے۔ ''آؤ بیٹا، آ گئے وہ۔۔۔! آؤ مجلس کا دروازہ کھولو۔ اسی دوران نیلسن اور نائل بھی قبرستان کا موڑ مڑ کر سامنے نظر آ رہے تھے۔ شاہ جی نے خوش دلی سے کہا۔'' آئے او!! (یعنی آیئے تشریف لایئے۔۔ اس علاقے میں استقبالی جملہ) اچھو !!'' ام کلثوم دو دروازہ کھول چکی تھی۔ شاہ جی نے مقامی زبان میں کہا۔ ''اچھو!! (آیئے)'' اور وہ جوتے اتار کر مجلس میں داخل ہوگئے۔

نیلسن نے بیٹھتے ہی کہا۔ ''شاہ جی آپ کو پتہ چل جاتا ہے کہ ہم آ رہے ہیں۔؟'' شاہ جی نے پیار سے کہا۔ ''اور کسی کا تو نہیں البتہ نیلی بیٹی آتی ہے تو مجھے۔۔۔۔'' انہوں نے ہلکی سی ہنسی میں بات ٹال دی۔ اور نائل سے خیر خیریت دریافت کی۔ تھوڑی دیر بعد نصر بھی آ گیا۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ ''نائل حاضر ہے۔'' شاہ جی نے سر کے اشارے سے اسے سراہا اور نائل سے مخاطب ہوئے۔ ''جی بیٹا جی! ہمیں پتہ ہی نہیں کہ ہماری بیٹی لاہور میں کس ہسپتال میں ہے۔ امی ابو۔۔۔''

نائل کی زندگی ایک دکھتی ہوئی کہانی تھی جو اس نے کبھی نیلسن کو بھی نہ کی سنائی تھی۔ مگر شاہ جی نے جس محبت اور شفقت سے پوچھا تھا اس نے ان کو اپنے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا۔ اسے افسردہ دیکھ کر شاہ جی نے پیار سے کہا۔ "کوئی بات نہیں بیٹا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو کہیں نہ کہیں ادھورا ضرور چھوڑا ہے تا کہ وہ اسے یاد کرے۔ ہر انسان کی زندگی میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جسے وہ دوسروں میں تلاش کرتا ہے۔ وہ اپنا حسن دیکھنے کے بجائے دوسرے کے حسن کو دیکھتا ہے۔ یونہی دنیا میں معاشرے کا نظام چلتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنے اپنے مدار کے گرد گھومتا نظر آئے۔ اور یہ انسان خلا میں بھٹکتے ہوئے سیاروں کی طرح خوار و زبوں پھرتا رہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

چائے پینے کے بعد شاہ جی تھوڑی دیر مراقبے میں چلے گئے۔ پھر مسکرا کر نائل سے کہا۔ "پریشان نہ ہوا کرو۔ کوئی اپنی مرضی سے کچھ نہیں ہوتا۔ اور تو اور روزگار کے انتخاب میں بھی قدرت کام دکھاتی ہے۔۔۔ تم اگر نہ چاہتی۔ تمہارے والد اگر نہ بھی چاہتے تو بھی تمہیں نرس ہی بننا تھا۔" نائل شاہ جی کی یہ بات سن کر ایک دم ٹھٹکی۔ اس نے نیلسن کی طرف دیکھا۔ پھر نصر کی طرف۔۔۔۔۔ "اس منزل کا یہی راستہ تھا۔۔۔ شاہ جی نے تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ اس کی نظریں نیلسن سے پوچھ رہی تھیں۔ شاہ جی کو میری یہ ٹریجڈی کس نے بتائی؟۔ نصر سے تو کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ نیلسن کو سوشیل نے شاید بتایا تھا۔ مگر نیلسن نے سر نفی میں ہلایا کہ یہ بات اس نے ان سے نہیں کی۔ اور پھر شاہ جی تو اس کے اپنے احساس محرومی اور پچھتاوے کا ذکر کر رہے تھے۔ جس کے بارے میں اس نے صرف پروفیسر نوازش سے ہسپتال میں بات کی تھی۔۔۔ 'شاہ جی کی بات جاری تھی۔" ۔۔۔۔ اگر کوئی نہ اعتراض کرتا۔ تمہاری شادی پھر بھی ۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو یوں ہی بہانے بنتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کی نظر میں اچھے برے بنتے ہیں۔۔۔ لکھا تو کہیں، کچھ اور ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ ہم دکھتے ہیں، الجھتے ہیں، کڑھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر ہمارے لئے تسلیم کا حکم ہے۔ اسی میں اطمینان ہے ہم سکون کی کوشش میں، آرام کی تلاش میں ہیں۔۔۔ مگر آرام و سکون اتنا مہنگا نہیں جتنی ہم اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ یہ تو پیسے سے بھی خریدا جا سکتا ہے ۔۔۔۔ جو چیز پیسے میں مل سکتی ہو۔ اس کی کیا وقعت۔۔ کوئی بھی خرید سکتا ہے۔ اطمینان

مانگو۔۔۔تسلیم کرواور اطمینان خرید لو۔اور تسلیم کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔۔۔۔۔!
''جی میں ابھی تک کچھ نہیں سمجھی۔۔۔۔'' نصر نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور شاہ جی کی بات جاری رہی۔

''۔۔۔۔۔۔ہم تمہیں، اپنی بیٹی کو ایک تحفہ دینا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔نصر!'' نصر نے سر اٹھا کر شاہ جی کی طرف دیکھا۔''جی!''

''ہم کیپٹن محسن کے لئے تمہیں مانگتے ہیں۔۔۔۔!!!!!''

کمرے میں سب اپنے اندر اچھل پڑے۔سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔سب کی نظریں آپس میں ایک دوسرے سے لاعلمی کا اظہار کر رہی تھیں۔سب سے زیادہ نائل کی حالت غیر تھی۔یوں لگتا تھا کہ اس کے جسم میں جیسے جان ہی نہیں۔ذرا چھوؤ گے تو بیٹھی بیٹھی گر جائے گی۔تحیر کا یہی عالم نیلسن پر بھی طاری تھا۔جبکہ نصر کے چہرے پر گرہیں بندھی ہوئی تھیں۔شاہ جی چپ ہوئے۔وہ نائل کے جواب کے منتظر تھے۔نائل نے نیلسن کی طرف دیکھتے ہوئے ہکلاتے ہوئے شاہ جی سے کہا۔''مم میں نے اس بب بارے میں شش شاہ جی کبھی سوچا ہی۔۔۔۔''

''صحیح! انسان نہیں سوچتا، اسے کچھ نہیں سجھائی دیتا۔مگر کوئی اسے سجھاتا ہے۔اسی لئے جو انسان نہیں سوچتا وہی ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ہے جو ہمارے نہ چاہنے کے باوجود ہمارے لئے وہ کرتا ہے جو بہتر ہوتا ہے۔'' اس کے بعد وہ نیلسن سے گویا ہوئے۔''نیلی بیٹی سمیعہ کا جانا امر ربی تھا۔۔۔۔تو تمہارا آنا بھی امر ربی ہے۔''

نصر اور نیلسن اپنی اپنی جگہ گزرے دو سالوں کی ہونیوں انہونیوں پر غور کر رہے تھے۔کیا کبھی سوچا بھی تھا۔جو ہو گیا۔سمیعہ نے نیلسن سے کہا تھا۔'نیلی میں تیرے لئے اتنا اچھا لڑکا دیکھوں گی کہ تمہاری زندگی بہار بن جائے گی۔تو اٹھتے بیٹھتے مجھے یاد کر کے دعائیں دیا کرو گی'۔

شاہ جی نے کہا۔''بیٹی تم اچھی طرح سوچ سکتی ہو۔اب تم لوگ جاؤ اور اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے انداز سے سوچ لو۔شاہ جی نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔سب نے زیرلب دعا مانگی اور ان کے ہاں سے رخصت ہو کر مری کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

میں آرزوئے دید کے کس مرحلے میں ہوں
خود آئینہ ہوں یا میں کسی آئینے میں ہوں

شادی کے بعد نوازش نے رابعہ کو تمام تر دلائل کے ساتھ قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے تاریخ اور مذہب میں سے بھی حوالوں کے ساتھ، اس پر رشتوں کی نوعیت اور ماہیت بھی ثابت کی۔ اسے بتایا کہ شبیر کے ساتھ اس کا جذباتی رشتہ تھا۔ ہر چند کہ زندگی میں اس کی ایک اہمیت ضرور ہے مگر اس کی ہمارے مذہب اور معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں۔ اس رشتے یا تعلق کے استحقاق پر کسی فقہ کی کسی قسم یا شریعت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔ قرآن نے دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔ ان دلائل کو اس کے ذہن نے تو مان لیا تھا مگر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے اس کے دلائل کو زائل کر دیا۔

جب محرم کا چاند نکلا تو اس نے رابعہ کو نئے اسلامی سال کی مبارک باد دی۔ رابعہ نے حیران کن شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں آپ!''

'' Happy new Islamic year ۔''نوازش نے اسے دوبارہ wish کیا۔

''آپ اتنے پڑھے لکھے ہو کر بھی۔۔۔''

''کیا مطلب؟''

''ہمارا اسلامی سال تو آپ جانتے ہیں کہ سانحہ کربلا۔۔۔''

''اوہ!!!۔۔۔ I see''نوازش کو اس کی بات سمجھ آ گئی۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''دیکھو رابعہ یہی بات میں تمہیں بھی کہہ سکتا ہوں کہ پڑھی لکھی ہو کر تم کیسی بات سوچ رہی ہو۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''مبارک باد دینے کا مطلب ہوتا ہے، برکتوں کی دعا دینا۔ محرم کا سوگ اپنی جگہ مگر دعاؤں کا سفر تو

بہر حال جاری رہتا ہے۔''

''بہر حال، یہ روایت ہے کہ ہمارے ہاں اسلامی سال کی مبارک باد نہیں دیتے۔''

''میرے خیال میں یہ روایت نہیں misconception ہے۔اور بعض ایسی بدعتیں جو ہماری مخلوط معاشرت کی وجہ سے اسلام میں داخل ہو گئیں انہیں ترک کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔تمہاری طرح میں بھی پہلی بار اسی طرح چونکا تھا جب مجھے عرب میں ایک وطنی نے نئے اسلامی سال کی مبارکباد دی تھی مگر پھر جب غور کیا تو بات سمجھ میں آ گئی۔''

''بہر حال مجھے دکھ ہوا'' رابعہ کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔''یہی وجہ ہے کہ شیعہ سنیوں میں شادی نہیں کرتے۔کہ ان کے عقائد کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔''

''سنی بھی یہی کہتے ہیں۔۔کہ جب اصحاب رسول کی شان میں گستاخی کی جاتی ہے تو ان کا دل دکھتا ہے۔''

نوازش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔رابعہ نے کہا۔''غلط کو غلط کہنے سے اگر کسی کا دل دکھتا ہے تو اس میں کہنے والے کا کیا قصور ہے۔''

تمہیں غلط فہمی ہے ایسا نہیں۔تمہاری طرح ہر کوئی اپنے آپ کو درست سمجھتا ہے۔'' نوازش نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں؟ آپ اپنے ہی رویے پر غور کریں۔'' رابعہ نے حجت کی۔

''رابعہ میں تم سے کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔بس اتنا جان لو کہ میری مجال نہیں کہ میں کسی کے مسلک کے بارے میں کوئی ایسی بات کہوں جو صرف میرا خیال ہو۔ہم بہن بھائیوں کو ہمارے والدین نے یہی تربیت دی ہے۔ہمارے ہاں ہر کوئی اپنے اپنے خیال کو اپنا مسلک بنانے میں آزاد ہے۔میرا خیال ہے مجھے اس بارے میں کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں، تم میرا اشارہ سمجھ رہی ہو''۔نوازش کا اشارہ شبیر کی طرف تھا جو اثنا عشری مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔'' دیکھو رابعہ مسلک انسان کا خالصتاً ذاتی مسئلہ ہے۔۔غلط ہے یا درست!۔۔آپ اگر سمجھتے ہیں کہ وہ غلط ہے تو زیادہ سے زیادہ آپ اسے رائے دے سکتے ہیں۔اسے روکنے اور ٹوکنے کی کوشش نہ کریں۔مسائل اسی سے پیدا ہوتے ہیں کہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم جو کر رہے ہیں یہ درست ہے اور اللہ کے ہاں اس کا بہت بڑا انعام ہے۔چنانچہ ہم دوسروں کو بھی اسی انعام میں شامل کرنا چاہتے

ہیں۔ مگر ہم جب اس پر اپنی رائے مسلط کرتے ہیں تو یہیں سے گڑ بڑ شروع ہوتی ہے۔ ہم اپنے مسلک کی تبلیغ نہیں کر رہے ہوتے بلکہ ہم اپنی انا کے مطالبے کے تحت اس پر اپنی مرضی مسلط کر رہے ہوتے ہیں۔ جس کا ہمیں کوئی حق نہیں۔۔۔''

''مگر جب سے ہماری شادی ہوئی ہے آپ کو تو میں نے ایک بار بھی مجلس پہ نہیں دیکھا۔''

''مجھے دکھانے کی ضرورت ہی نہیں۔۔۔۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم یہ بتاؤ میں نے تمہیں کبھی روکا۔؟''

''جس طرح آج آپ نے نئے سال کی مبارکباد دے دی ہے اسی طرح کیا پتہ آگے چل کر ایسا بھی ہونے لگے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں شاید یاد نہیں کہ بیس محرم کو ہمارے ہاں ہر سال مجلس برپا ہوتی ہے۔''

''شاید اسی لئے آپ مجھے مجلس سے نہیں روکتے ورنہ ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔''

'ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ چھوڑو۔۔۔ اگر تمہیں برا لگا تو میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔۔۔ اور رہی بات کربلا کے سانحے کی تو کون سنگدل ہوگا کہ جو اہل بیت پر ظلم اور مصائب و آلام پر نہ تڑپتا ہو۔ کربلا اور حسینؓ، داستان حرم کا اذیت ناک باب ہے۔ اور سانحہء کربلا پر اپنے عقائد کے بارے میں مجھے کسی سے سند لینے کی ضرورت نہیں۔۔۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے۔ تم پر کوئی پابندی نہیں۔ تم اپنے عقیدے کے مطابق جہاں جانا چاہو۔ جب چاہو جاسکتی۔ اگر مجھے کہو گی تو میں خود تمہیں چھوڑ کر آؤں گا۔ لے کر آؤں گا۔ مگر وہاں ٹھہرنا نہ ٹھہرنا میری صوابدید ہے۔ جس میں میں کوئی مداخلت پسند نہیں کرتا۔''

اس روز کے بعد ان میں اس بارے میں کبھی بات نہ ہوئی۔ نوازش نے اپنے قول سے اپنے فعل کی سچائی اور اخلاص ثابت کیا تھا۔ وہ محرم کے دنوں میں اسے مجالس پر دور دراز کے امام باڑوں پر لانا واپس لینا۔ اس کا معمول ہوتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ شبیر کو گاہے گاہے یاد کرتی رہتی تھی۔ نوازش کے لئے یہ بات بڑی اذیت ناک تھی۔ خاص طور پر محرم کے دنوں میں اس کا جلال دوچند ہو جاتا۔ کیونکہ جب مجلس میں دوسری عورتیں اپنے اپنے خاوند کے ساتھ آتیں تو وہ نوازش کی کمی کو بری طرح محسوس کرتی۔ تب اسے شبیر یاد آتا کہ اگر وہ ہوتا تو اس موقعے پر اس کے ساتھ ہوتا۔

ایک دن اس نے نوازش سے کہا۔'' دیکھو ساجد کی آنکھیں بالکل شبیر سے کیوں ملتی

ہیں۔'' نوازش نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔'' پگلی! شبیر میرا بھائی ہے، ظاہر ہے بھائیوں کی شکلیں تو ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔''

''مگر اس کی آنکھیں تم سے تو نہیں ملتیں۔'' اس نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔۔'' یہ تمہارا بچہ تو لگتا ہی نہیں، ہوتا۔ اسی طرح کی اور کئی ایسی باتیں جو اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتیں۔ سال بھر تو اس نے اپنے طور پر اس صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بلکہ وہ جان بوجھ کر اپنی سرکاری رہائش گاہ میں اٹھ آیا تھا کہ کسی کو رابعہ کی ذہنی کیفیت کا پتہ نہ چلے۔ البتہ اس نے بعض سیانوں اور نفسیات کے ماہروں سے اپنے طور پر مشورہ بھی کیا۔ سب کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ یہ احساس فرو ہو جائے گا۔ خاص طور پر ایک دو بچوں کے بعد زندگی اتنی مصروف ہو جائے گی۔ کہ اس پہلو دھیان بھی نہیں جائے گا۔ مگر جب اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اس کے بعد یہ احساس نفسیاتی مرض کی صورت اختیار کر گیا۔'

جب اس کی باتیں اس کی برداشت سے باہر ہو جاتی تو وہ گھر سے نکل جاتا اور سڑکوں اور پر آوارہ پھرتا رہتا۔ عام طور پر اس کی یہ کیفیت شام کے وقت ہوتی اور جوں جوں سورج ڈوبتا اور اندھیرا گہرا ہوتا اس پر یہ کیفیت زور کرنے لگتی۔ اسی طرح زندگی دو سال آگے بڑھ گئی۔ اب اس کی یہ صورت حال سب خاندان والوں پر بھی واضح ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس کی حالت کے سنورنے کی ابھی تک کوئی صورت نہ بنی تھی۔ بلکہ اب تو کئی بار رات کو بوقت مباشرت یا سوتے میں اس پر وحشت سی طاری ہو جاتی۔ اور وہ دیوانوں کی طرح اسے کمرے سے چلے جانے کو کہتی۔ نوازش اسے جھنجوڑ کر ہوش وحواس میں لانے کی کوشش کرتا۔ اسے کہتا کہ میں تمہارا خاوند ہوں۔ میں نوازش ہوں مگر وہ پاگلوں کی طرح سرگوشی میں کہتی۔ 'نہیں! تم زانی ہو۔ تم میرے کمرے میں کیوں آئے ہو۔ اب وہ بعض اوقات ساجد کو بھی ایک دم پیار کرتے کرتے تھپڑ مارنا شروع کر دیتی۔ کہیں ایک دن شورش کی کتاب میں پڑھ لیا۔۔۔ اولاد گناہ کی دستاویز۔۔!! بس پھر کیا تھا۔ جب بھی غصہ آتا اسے گناہ کی دستاویز کہہ کر مارنا شروع کر دیتی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد اسے چوم کر چپ کرواتے ہوئے کہتی۔ 'تو کیوں؟ تیری ماں گناہ کی دستاویز ہے۔ ایک دن نوازش کے سامنے اس نے ساجد کو چپ کرواتے لاڈ لڈاتے ہوئے کہا۔'' تم کیوں تمہاری ماں گناہ کی دستاویز ہے، تمہاری ماں حرامی ہے تمہارا کیا قصور۔ تمہارا باپ حرامی۔۔۔'' نوازش کی تڑاخ نے اس کو جملہ مکمل نہ کرنے دیا۔ نوازش نے بعد میں خود کو بہت کوسا۔ مگر شاید اس کی قوت برداشت

جواب دے گئی تھی۔ اور برداشت کی اسی حد کا وہ شاید انتظار کر رہی تھی۔ اب اسکی وحشت میں انفعالیت کی جگہ فعالیت نے لے لی۔

چنانچہ اب اس نے اس کا علاج کروانا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ضرور تمند دیوانہ کے مصداق۔ میڈیکل کنسلٹنٹ، سائیکوجسٹ، روحانی معالج کے ساتھ ساتھ درگاہوں، امام بارگاہوں کی خاک چھانی، خانقاہوں سے لے کر رائیونڈ کے تبلیغی مرکز اور تعویذ عملیات کے ماہرین، سب کا در کھٹکھٹایا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ دراصل اپنی اس بیماری پر رابعہ کا بھی بس نہیں چلتا تھا۔ وہ جب اپنے ہوش وحواس میں ہوتی تو دیر تک اپنی باتوں پر اس سے معافی مانگتی رہتی۔ ایک دو مرتبہ تو اس نے خود کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی۔۔۔ ایک بار اس نے گھر میں پڑا ڈیٹول پی لیا اور دوسری بار اس نے ہسپتال کے کمرے میں فینائل پی لیا۔ مگر بر وقت طبی امداد ملنے پر وہ بچ گئی۔ پہلے پہل اس کا خیال تھا کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ خود رابعہ نے بھی اسے کہا تھا اور ماموں نزاکت سے بھی کہلایا، اور تو اور اس کی خالہ (ساس) نے بھی کہا تھا کہ بیٹا یہ سب ہماری وجہ سے ہوا ہے۔ ہمارے کیئے کی سزا ہمیں کو بھگتنی چاہئے تم کیوں بھگتو۔ رابعہ کو بطریق شرع محمدی فارغ کر دے۔ مگر اس نے کہا کہ اسلام نے طلاق کا حکم نہیں دیا ایک راہ بتائی ہے اور اس پر چلنے کی بھی تاکید نہیں کی بلکہ اختیار دیا ہے۔ اور وہ اختیار کو اپنے آرام اور غرض کے لئے استعمال کرنے کا سوچتا بھی نہیں ہے۔ خاص طور پر جب بیوی بیمار ہو تو اسے چھوڑ دینا بندیائی نہیں بلکہ ظلم ہے۔ اسلام نے تو حاملہ عورت کو طلاق دینے کو مکروہ عمل قرار دیا ہے۔ کہ ان دنوں عورت تخلیق کے کرب میں مبتلا ہو کر اکثر اپنے آپ میں نہیں رہتی۔۔۔ چنانچہ سب لاجواب ہو گئے۔ مگر یہ ہر کسی کو پتہ تھا کہ نوازش کی زندگی کس عذاب میں تھی۔ بلکہ اس کی حالت ہی کے باعث اس نے ابوظہبی واپس جانے کا پروگرام بھی ترک کر دیا تھا۔ اور یہیں شعبہ تعلیم میں بطور لیکچرار کے ملازمت کر لی تھی۔ اس ملازمت میں اسے رابعہ کی تیمارداری کے لئے بھی وقت مل جاتا تھا۔

ایک دن اسے یاد آیا کہ شاہدہ نے واصف علی واصف، ایک صوفی دانشور کا ذکر کیا تھا۔ چنانچہ اس نے واصف صاحب کے ہاں جا گھٹنے ٹیکے۔ واصف صاحب فردوس کالونی گلشن راوی کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ پتہ چلا کہ ان کے ہاں ہر جمعرات کو ایک محفل ہوتی ہے۔ جس میں وہ حکمت و دانش کے موتی بکھیرتے ہیں اور حاضرین جو پریشانی یا الجھن دل میں لے کر جاتے

ہیں وہ ان کے بتائے بغیر ہی اشاروں ہی اشاروں میں ان کا تشفی بخش حل بتا دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک شام وہ انہیں فون کر کے اکیلا ہی ان کے ہاں چلا گیا۔ ابھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ واصف صاحب کی تصویر تو وہ نوائے وقت میں ان کے کالم ''گفتگو'' میں دیکھ چکا تھا۔ مگر بالمشافہ وہ ان سے پہلی بار ملا۔ کلین شیو، سمارٹ، میز پر مہنگے سگریٹوں کی ڈبیا پڑی ہوئی تھی۔ بڑے پیار سے اور تاؤ سے ملے اور مصافحے کے بعد فرمایا۔ ''جی! حکم!'' ۔۔۔۔ اور نوازش نے الف سے یے تک سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ سن کر تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہے۔ اور پھر کل آنے کا کہہ کر اٹھ گئے۔ اور نوازش واپس آ گیا۔

اگلے روز جب وہ گیا تو پتہ چلا کہ ان کی محفل جاری ہے اور وہ کوئی گھنٹہ بھر تک فارغ ہونگے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ ان کے کمرے میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرے مگر پھر اس نے دربان سے پوچھا کیا وہ اندر جا سکتا ہے۔ دربان نے کہا کہ یہ فقیر کا در ہے۔ یہاں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ وہ جھجکتے ہوئے کئی بار تو کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اندر کوئی چالیس پینتالیس لوگ فرش پر بچھی چاندنیوں پر بیٹھے ہوئے ان کی گفتگو سننے میں مگن تھے، اتنے مگن کہ ان میں سے کسی نے اس کی آمد کا نوٹس نہ لیا۔ البتہ واصف صاحب جو کہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے آنکھ بھر کر اسے دیکھا مگر ان کی گفتگو کی روانی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بھی ایک کونے میں خالی جگہ دیکھ کر چپکے سے بیٹھ گیا۔ واصف صاحب کہہ رہے تھے۔

''۔۔۔۔۔ پریشانی انسان کے خیالات میں چھپی ہوتی ہے، حالات میں نہیں۔ ہمیشہ اپنے سے چھوٹے کی طرف دیکھو، بڑے نظر آؤ گے۔ اگر اپنے سے بڑے کی طرف دیکھو گے تو خود کو چھوٹا پاؤ گے۔ یاد رکھو، سب سے بڑی قوت، قوت برداشت ہے۔ اور برداشت کی قوت انسان کو توانا رکھتی ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ اللہ کے ہاں صبر کا کیا مقام ہے۔؟ اللہ تعالیٰ شکر کرنے والے کو زیادہ دیتا ہے جبکہ صبر کرنے والے کو کچھ دینے لینے کا چکر ہی نہیں بلکہ صبر کرنے والے کے ساتھ اللہ خود ہو جاتا ہے۔ اور صبر کیا ہے۔ برداشت ہی تو ہے۔ برداشت انسان کو معاف کرنا سکھاتی ہے۔ اور جو معاف کر دیتا ہے، معاف کر دیا جائے گا۔ اس لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ برداشت کی قوت عطا کرے۔ اور یہاں میرے سامنے اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر سچے دل سے ان سب لوگوں کو معاف کر دو جنہوں نے آپ کو کوئی بھی دکھ دیا ہے۔ کسی بھی حوالے سے اور جس کے ساتھ آپ نے زیادتی کی ہے۔ ان سے جا کر معافی مانگ لینا۔۔۔۔ کیوں بلال

صاحب! ٹھیک ہے نا۔۔" آگے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے ہلکی سی آواز میں کہا۔ "ٹھیک فرمایا آپ نے۔۔" اس کے بعد سب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اور دعا پر ان کی محفل ختم ہوئی۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے واسف صاحب اندر زنانے میں گئے کیونکہ خواتین اس طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔ نوازش دوسرے لوگوں کے ساتھ اٹھ کر باہر آ کر ان کے آفس میں بیٹھ گیا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد واصف صاحب اس چھوٹے سے آفس میں تشریف لائے۔ وہ خلافِ توقع ہشاش بشاش تھے۔ "جی نوازش صاحب۔۔۔ نوازش دل ما کن کہ دلنواز توئی

بساز کارِ غریباں کہ کارساز توئی

انہوں نے شعر پڑھا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ نوازش جو کہ ان کی آمد پر احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔ فرمایا

"تکلیف انسان پر آتی ہے اس کی استطاعت کے مطابق۔ کیونکہ سواری پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ لادنا ظلم ہے۔ اور اللہ ظالم نہیں۔۔۔ **لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا**۔۔ اپنے آپ کا سراغ لگاؤ۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ آپ کتنے مضبوط ہو۔۔۔۔۔!!"

واصف صاحب تھوڑی دیر تک سر جھکائے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا اور اس پر رکھی ماچس پر اپنی انگلیاں گھماتے رہے۔ پھر سر اوپر اٹھایا ان کی آنکھوں میں فکر یا تشویش کی ہلکی سی جھلک تھی۔ مگر پھر وہ نارمل ہو گئے۔ "کبھی کبھی داتا صاحب چلے جایا کرو۔ اللہ کے نیک بندوں کی درگاہوں پر فیض جاری رہتا ہے۔ مگر حصہ بقدرِ ہمت اوست۔"

وہ واصف صاحب کے پاس جس مقصد سے گیا تھا وہ تو حاصل نہ ہوا۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی نقش، تعویذ یا دم درود کی بات ہو گی۔۔۔ مگر اسے اپنے اندر ایک غیر مرئی سی طاقت کی موجودگی کا احساس سا ہونے لگا۔

رابعہ کو آج پھر دورہ پڑا تھا۔ اور وہ اسے خائن، زانی اور دیگر گالیاں دیتی ہوئی اس پر جھپٹی۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا۔ اس نے سوچا انسان جس بات کا تصور نہیں کرتا بعض اوقات حالات اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ انسان حالات کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ وہ زچ ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے واصف صاحب کا خیال بھی آیا۔ مگر اسے ان پر غصہ بھی آیا کہ وہ مسیحائی کی، مداوے کی کتنی امیدیں لے کر گیا تھا مگر۔۔۔!!

عام طور پر وہ ایسے میں جب گھر سے نکلتا، اس کا رخ نہر۔۔۔ کیمپس کے پل۔۔۔ کی

طرف ہوا کرتا تھا۔ مگر آج وہ بلا سوچے سمجھے مسلم ٹاؤن کی طرف چلدیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اچانک ایک ہارن کی آواز پر وہ چونکا، بے دھیانی میں وہ چلتے چلتے سڑک کے بیچ آ گیا تھا۔ شکر ہے سڑک خالی تھی۔ ورنہ۔! ورنہ کیا؟ اچھا تھا جان چھوٹ جاتی، کیا رکھا ہے اس بے رنگ اور بے وقعت زندگی میں۔ اگلے دن کے اخبار کے ایک کونے میں ایک کالمی خبر لگ جاتی۔ وہ اسی طرح کی سوچیں سوچتا ہوا۔ نہر و نہر چلتے چلتے اپر مال پر آ گیا۔۔۔ کدھر جائے؟۔۔ ذرا رک کر اس نے سوچا پھر خود بخود اس کے قدم شہر کی طرف اٹھ گئے۔

چیئرنگ کراس پر پہنچ کر کوئینز روڈ کی طرف مڑ گیا۔ سول لائنز اور لارنس روڈ کے چوک سے گزرتے ہوئے اس کے قدم شاہ عنایت قادری کے مزار کی طرف اٹھ گئے۔۔۔

ماپے چھوڑ لگی لڑ تیرے، شاہ عنایت سائیں میرے

عشق و تصوف کے بیان میں بلھے شاہ اور شاہ عنایت کا تذکرہ ایک عجیب جذب و کیف اور مستی کا حامل ہے۔ مرشد کے عشق میں ایک سید زادہ نفی ذات کے مراحل طے کرتا ہوا فنافی الشیخ کے درجے پر فائز ہو کر امر ہو گیا۔ مریدِ باصفا کے یقین کامل نے مرشد کو پیرِ کامل بنا دیا۔ ملامت کے کس کس مرحلے سے گزر کر معرفت کی منزلیں ملتی ہیں اور جب منزل مل جاتی ہے تو پھر بھی اپنی ذات کا عرفان تشنہ رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بلھیا، کیہہ جاناں میں کون؟

شاہ عنایت کے دربار پر جا کر اسے ایک گونہ تسکین سی محسوس ہوئی وہ کافی دیر تک سر جھکائے وہاں بیٹھا رہا۔ وہ کوئی دعا مانگنا چاہتا تھا۔۔ زندگی کا راز پانے والے یہ فرزانے تو حیاتِ دنیوی میں بھی، مرنے سے پہلے مر جاتے ہیں۔ یہ بابے وہاں ہیں جہاں انہیں کسی کیا احتیاج نہیں رہتی بلکہ یہ جسے چاہتے ہیں اسے بلا لیتے ہیں یہ رجال الغیب ہیں۔۔۔ یہ اللہ واسطے لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔۔ اپنے مرشد ڈنگہ والے میاں جی محمد دین۔۔ کے حوالے سے ابا نے اسے یہی بتایا تھا۔ اس نے سوچا عرصہ بیس سال سے وہ اس علاقے سے گزرتا رہا تھا کئی دفعہ سوچا کہ فاتحہ کے لئے جائے مگر موڈ اور مزاج اور کبھی قلتِ وقت آڑے آئی۔ اور آج آیا تو بغیر کسی پروگرام کے، کسی ارادے کے۔۔ یہاں سے نکل کر وہ صفانوالہ چوک سے ہوتا ہوا سید حامیراں موج دریا کے مزار کی طرف چل دیا۔ اب کے اس کے قدموں میں پہلے جیسی بے ترتیبی نہیں تھی۔۔۔ منزل کا تعین ہو جائے تو سفر سقر نہیں لگتا۔

اے جی آفس کا چوک پار کر کے وہ ایک گلی سے ہوتا ہوا وہ ایک کشادہ جگہ پر جا پہنچا۔

سامنے میراں جی کا مزار تھا۔ عشاء کی جماعت ہو چکی تھی ۔ ملحقہ مسجد میں لوگ اپنی اپنی نماز میں مصروف تھے اس نے وضو کیا اور عشاء کے لئے چلا گیا۔ میراں جی کے مزار پر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ ہائیکورٹ کی بغل میں شاہ چراغ کے مزار پر آیا۔۔ پھر شاہ اسماعیل بخاری کے در پر حاضری دی ۔اس نے کہیں نصاب میں پڑھا تھا کہ شاہ جی لاہور میں آنے والے پہلے بزرگ تھے جن کے ہاتھ پر ہزاروں ہندوؤں نے پہلے ہی خطبے پر اسلام قبول کرلیا۔ یہاں سے وہ مال پر آگیا۔

وائی ایم سی اے۔، سامنے PEJO ریسٹورنٹ ۔اور نیلا گنبد کے فردوس ریسٹورنٹ سے اس کی رنگین یادیں وابستہ تھیں وہ نیلسن کو یاد کر کے اور اداس ہو گیا۔۔۔ کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے۔ مگر اب صورت حال یہ ہے کہ:

لحاتِ مسرت ہیں تصور سے گریزاں
یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے

شاید اسے نیلسن کی آہ لگی ہے۔ یہ خیال اسے کبھی کبھی بہت ستاتا۔ آج بھی وہ زمانہ یاد آیا تو نیلسن کا خیال پر ملال دامنگیر ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک گول باغ کے اسی بنچ پر بیٹھا رہا۔ جہاں کبھی وہ اور نیلسن بیٹھا کرتے تھے۔ وہ اولڈ کیمپس سے یہیں آجایا کرتی تھی اور پھر وہ تادیر اسی بنچ پر بیٹھ کر آنے والے وقت کے سپنے بنا کرتے تھے۔۔۔ گول باغ سے لے کر، سارا مال روڈ، اپر مال اور باغ جناح کی روش روش۔ اس کی یادوں کی گزرگاہ تھی۔۔۔

یہاں سے اٹھ کر اس نے لوئر مال پار کیا اور ضلع کچہری کی عقبی سڑک سے نکلتا ہوا داتا صاحب کے مزار پر جا پہنچا۔ اس کا بچپن اسی مرد درویش کے آنگن میں کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ تب وہ موہنی روڈ پر رہا کرتے تھے۔ یہیں اس کی جنم گلی تھی۔ جس روز دربار کی مسجد کا مینار ٹوٹا تھا وہ یہیں کھیل رہا تھا۔ کتنے ہی لوگ اس مینار کی زد میں آکر مارے گئے تھے۔ اس نے سوچا۔ اسی دن پورا ہو گیا ہوتا تو آج زندگی کے یہ دکھ تو نہ جھیلنے پڑتے ۔ داتا حضور کے مزار کے آنگن میں دوسرے شہدا کی طرح آسودۂ خاک ہوتا۔ لوگ آتے جاتے فاتحہ پڑھتے ۔۔ کتنا اچھا ہوتا۔ اس نے مزار کی پیشانی پر لکھے اشعار پڑھنے شروع کر دیئے۔

گنج بخش فیض عالم ، مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل ،کاملاں را راہنما

مزار کی پیشانی پر لکھا ہوا یہ شعر پڑھا تو اسے بے اختیار واصف صاحب یاد آ گئے۔

نوازش دل ما کن کہ دلنواز توئی
بساز کار غریباں کہ کار ساز توئی

اس نے مزار کی غلام گردشوں کی الواح پر لکھے ہوئے اس شعر کو دو تین بار دہرایا، مزار کی چوکھٹ کو چھو کر فاتحہ پڑھی دعا مانگی۔ سوچا رو رو کر کی گئی دعا مقبول ہوتی ہے۔ مگر رونا نہ آیا اور نہ ہی مطلوبہ خضوع و خشوع میسر آیا۔ اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے خود کلامی کی۔ ''پھر کیا ہوا اگر خضوع و خشوع نہیں۔۔ اللہ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے' وہ ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ لوگ قرآن، پنجسورہ، اذکار و وظائف پڑھنے میں مشغول تھے مگر اس کا جی کسی طرف نہیں رجھ رہا تھا۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ چلو دو رکعت نماز ہی پڑھ کے دیکھوں۔۔ وہ یہ سوچ کا اٹھا اور نیچے وضو خانے کی طرف اترا ہی تھا کہ باہر سڑک پر اس کی نظر پڑی۔ اپنائیت بھری دو شناسا آنکھوں نے کالی چادر کے پیچھے سے اس کے کانوں میں گھنگروؤں کی جھنکار بجنے لگی۔

''نازنین اللہ داد؟'' نوازش نے باہر کی طرف سیڑھیاں اتر کر اس کے قریب جا کر کہا۔ سلام سر جی، کیا حال ہے۔ یہ غلیچہ ہے، باجی نشیمن کا بیٹا۔ اس نے اپنے ساتھ چھ سالہ لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ سلام کرو سر جی کو، سلام! لڑکے نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر، پیارے سر جی نا؟ کہا اور نازنین کی طرف دیکھتے ہوئے نوازش کی طرف دیکھا۔ نازاں کے منہ سے بے اختیار، اوہ غلیچے ے!!! نکلا اس کے لہجے میں دبی دبی سی سرزنش تھی اور لطیف سی جھینپ بھی۔

''ادھر کہاں؟''

''سلام کرنے آئی تھی۔۔ اور آپ؟'' اس کے چہرے سے چادر ذرا سرک گئی۔

نوازش نے زیرِ لب کہا۔ ''میں؟ بس یونہی۔۔'' شور اور آہستگی کے باعث نازاں اس کی آواز نہ سن سکی نوازش کو فوراً احساس ہوا کہ ادھر کھوے سے کھوا چھل رہا ہے اور وہ راستے میں کھڑے ہیں۔

''ادھر آ جاؤ'' اس نے مزار کے مخالف سمت گلی کی طرف اشارہ کیا۔ گلی میں آ کر نازاں نے چہرے سے چادر نیچے کر لی۔۔ اس نے بھرپور اور بے جھجک نظروں سے اس نازنین کی طرف دیکھا۔ شاید آج پہلی بار اتنے غور سے۔ اندھیر گلی میں دربار کی روشنیوں کا پرتو اس کے چہرے کے خال و خد واضح کر رہا تھا اور کالی چادر میں سے اس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا گلی میں جیسے چاند نکل آیا تھا۔ سر جی آپ کیسے ہیں؟ نوازش اس کے ساحری حسن میں ابھی تک ڈوبا ہوا تھا نازاں کی آواز اس کے کان کے پاس سے گزر گئی۔ اسے چپ دیکھ کر نازنین نے سمجھا شاید اس کی آواز شور میں

ڈوب گئی ہے چنانچہ اب کے اس نے قدرے زور سے کہا۔ سر جی آپ۔۔۔!
ہاں میں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ نوازش فوراً بولا۔ یہ سب کچھ اتنا غیر ارادی طور پر اور اتنی جلدی میں ہوا کہ نازنین اس کی کیفیت بھانپ نہ سکی۔
آپ یہاں کیسے؟
بس۔۔۔!! کبھی کبھار آجاتا ہوں، جب وقت ملتا ہے۔ نوازش نے جس شکستہ لہجے میں، بس، کہا وہ نوازش کے دردِ دروں کی چغلی کھا رہا تھا۔ نازاں نے اسے پوری طرح محسوس کیا تھا۔ ''سر جی آپ کچھ پریشان لگتے ہیں، خیر ہے؟ گھر میں خیر خیریت ہے نا۔''
''سر جی آپ کچھ، بلکہ کافی پریشان لگتے ہیں؟'' آؤ کسی ہوٹل میں، قریب میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ نوازش کا انداز ایسا تھا جیسے کہ رہا ہو کہ کہیں ہوٹل میں بیٹھ کر تمہارے سوال کا تفصیلی جواب دیتا ہوں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ چلو، نوازش نے یہ کہہ کر قدم اٹھا دیئے اور نازاں سعادتمندی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ گلیوں کی دھیمی دھیمی روشنی میں وہ چلتے چلتے باہر دار العلوم سید صاحب والی سڑک پر نکل آئے۔ ''مجھے کربلا گاے شاہ سلام کرنا تھا۔'' نازاں نے یوں کہا جیسے اجازت مانگ رہی ہو'' ،آپ کو جلدی تو نہیں ہے نا''۔ شاید ان کہی یہ تھی کہ کربلا گاے شاہ حاضری کے بعد کہیں بیٹھیں گے۔ نوازش نے کہا۔ ''مجھے کوئی جلدی نہیں تم۔۔۔۔ بلکہ میں بھی چلتا ہوں۔''
''آپ بھی!!'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔
''ہاں، کیوں؟'' نوازش اس کے حیران لہجے پر استفہامیہ انداز میں بولا۔
نازاں نے کہا۔ ''دراصل، وہ آپ، میں نے سنا ہے کہ آپ۔۔ میرا مطلب ہے آپ لوگ۔۔۔!!
''وہ جو کہنا چاہتی تھی کہہ نہ پائی مگر نوازش سمجھ گیا۔ اس نے بڑے پیار سے کہا۔ ''پگلی نہ تو ادھر جانا گناہ ہے نہ ادھر جانا۔ جہاں جا کر اللہ یاد آجائے وہاں جانا ثواب ہے اور بس!'' اس نے چلتے چلتے بات جاری رکھی۔'' ۔۔۔قبروں پر جانا اچھا ہے برا نہیں، انسان کو اپنی اور دنیوی حقیقتوں اور اپنے انجام کا احساس ہوتا ہے۔ اور پھر، ،چینی زبان کی ایک کہاوت ہے کہ بے وقوف آدمی کو جب انگلی کے اشارے سے چاند دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ چاند کو دیکھنے کے بجائے انگلی کو دیکھنے لگتا ہے۔ نازاں یہ انگلیاں ہیں جو اپنے زائر کو حق کی طرف اشارہ کرتی ہیں مگر ہم زائر انکی اشارہ کردہ راہ کی طرف دیکھنے اور قدم بڑھانے کے بجائے کھڑے ہو کر انہیں کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔''

سڑک پر آنے پر اس نے چادر سے پھر منہ ڈھانپ رکھا تھا۔اس نے رک کر ستائش بھری نظروں سے نوازش کی طرف دیکھا چادر اس کے چہرے سے سرک گئی۔''واہ سر جی کیا فلسفہ بتایا ہے آپ نے۔'' اس کے لہجے کا گداز اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ نوازش کی بات اس کے دل میں اتر گئی تھی ۔۔''مگر سر جی اس میں ان کا کیا قصور، لوگ انہیں کیوں برا کہتے ہیں۔'' اس نے یوں نوازش کی طرف دیکھا جیسے اس سے گلہ کر رہی ہو۔نوازش نے مسکرا کر کہا۔''دیکھو نازاں! جن کے بارے میں ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ

لا یمکن الثناء کما کان حقہ'

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

مگر اس کے باوجود ان کے ساتھ لوگوں نے کیا سلوک کیا اور کیا کیا نہ کہا۔چنانچہ:ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔مجھے بتاؤ:ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟۔۔۔تم بس یہ جانو کہ: جو زمانے کو برا کہتے ہیں خود ہیں وہ برے۔۔تم یہ بات ذہن میں رکھو۔جو برا کہتے ہیں وہ جانیں اور جنہیں کہتے ہیں وہ جانیں اگر تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ رجال الغیب ہیں، زندہ ہیں تو پھر ان کا کام ان پر چھوڑ دو۔مت اپنا پینڈا کھوٹا کرو۔ان کی عظمت و حرمت کی حفاظت تمہارے لئے حجت کا درجہ نہیں رکھتی۔''

نام فقیر تنہاں دا باھو قبر جنہاں دی جیوے ہو

''اوہ، سر جی آپ کتنے اچھے ہیں، سارے سنی آپ کی طرح کے کیوں نہیں۔'' نوازش نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور کہا۔''اس لئے کہ سارے شیعہ تمہاری طرح کے نہیں۔'' بے خیالی میں یا غیر ارادی طور پر اس نے نازاں کے سر پر پیار سے جو چپت لگائی اور بات جاری رکھی''۔۔لوگ کہتے ہیں کہ داتا صاحب نے اپنی زندگی میں بی بی پاکدامنہ کو بہت تنگ کیا تھا۔اس فرسودہ روایت سے یوں لگتا ہے کہ بی بی صاحبہ کوئین میری کالج میں پڑھتی تھیں اور داتا صاحب اسلامیہ کالج لاہور کے طالبعلم تھے جو چھٹی کے وقت گڑھی شاہو کے بس سٹاپ پر آن کھڑے ہوتے تھے جہاں سے بی بی صاحبہ نے بس پکڑنا ہوتی تھی۔'' نوازش کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

نازاں اس کی تمثیل سن کر زور سے ہنسی۔۔''سر جی یہ آپ نے اچھی بنائی دراصل میں بھی نا داتا صاحب کے مزار پر نہیں آیا کرتی تھی۔میں نے بھی یہی سن رکھا تھا۔مگر میرے ابا کو جس بات میں

شک ہو وہ اس کے بارے میں کسی نہ کسی سے پوچھتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کسی سے پوچھا۔ اور پھر پڑھا بھی کہ داتا صاحب اور بی بی پاکدامنہ کے زمانے میں سو سال سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ وہ جس صدی میں داتا جی آئے بی بی پاکدامنہ ان سے پہلے ہی پردہ فرما چکی تھیں۔ پھر میرے ابا نے یہ بات بازار والوں کو بتائی۔ اور یہ بھی بتایا کہ ان کا اصل نام حضرت علی بن عثمان تھا۔ اب ہمارے سبھی لوگ داتا جی کے دربار کی زیارت پر پہلے آتے ہیں اور پھر۔۔۔۔!'' نوازش نے معترف لہجے میں کہا۔ ''بھئی تمہارے ابا تو پورے محقق ہیں۔ یہ بات تو بڑے بڑے عالم فاضل لوگوں کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔''

نازاں نے فخر سے کہا۔ ''ابا کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔۔۔۔''

باتیں کرتے وہ کربلا گامے شاہ کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ نوازش نے دیکھا یہاں کا منظر۔۔۔ کیا فرق ہے دونوں میں۔۔۔ مسکینوں اور محتاجوں اور ہڈحراموں کی ٹولیاں، یہاں بھی اور وہاں بھی۔ وہاں بھی قبر کا بوسہ ہے اور یہاں بھی۔ اسے ہم کیوں نہیں سمجھتے؟ شاید ہم سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم اور ہماری تحریریں اور ہمارے وطیرے کیوں آدھے ادھورے ہیں۔۔۔۔ بابا گامے شاہ کے مزار سے نکل کر نوازش نے کہا ادھر آؤ اور نازاں کو لے کر تہ خانے میں اتر گیا ایک کالی چادر سے ڈھکی ایک قبر کے پہلو میں رک کر اس نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے، اس کی پیروی میں نازاں بھی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔ یہ انسانی اخوت اور اسلامی بھائی چارے کے پرچارک، اردو کے ممتاز انشاء پرداز محمد حسین آزاد کا مرقد ہے۔ نازاں نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے ایک بار پھر دیکھا اور بولی۔ آپ پہلے بھی یہاں آتے ہیں۔ نوازش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سر جی۔۔۔۔۔ سر جی آج ہمارے ہاں چلئے نا''۔ نازاں نے اچانک، بے ارادہ بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔ ''کتنی بہت سی باتیں کرنی ہیں سر جی''۔

''ہاں سر جی، چلئے نا۔'' غلیچہ بولا۔

اوووہ اچھا تو آپ دوسری دفعہ بھی بول سکتے ہیں۔ نوازش نے خوشگوار لہجے میں کہا اور غلیچہ شرمندہ سا ہو رہا۔

''پلیز سر جی'' نازاں کے لہجے میں سماجت تھی۔ نوازش نے کوئی جواب نہ دیا۔

نوازش کو چپ دیکھ غلیچے نے نازاں کو چھیڑا ''پیارے سر جی کہو شاید پھر مان جائیں''۔ اس کی بات سن کر نازاں شرما گئی۔ اور نوازش نے مسکرا کر کلائی کے کف کا بٹن کھول کر گھڑی پر وقت

دیکھا اور لمبی سی ہوں ں کر کے بولا۔ ''چلو''

سالم تانگہ کریم پارک کی طرف چل پڑا پیچھے نوازش اور نازاں جبکہ غلیچہ آگے بیٹھ گیا۔ ''یہ گھر کب لیا، میرا مطلب ہے کریم پارک میں۔''

''گھر تو سر جی آپ لوگوں کے ہوتے ہیں ہم لوگ تو مکانوں میں رہتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' نوازش نے پوچھا۔

''سر جی، ہم لوگوں کو تو آپ جانتے ہیں، کیا چھپا ہوا ہے آپ سے، شاید قدرت نے طوائف کی قسمت کے پنے پر گھر کا لفظ لکھا ہی نہیں یا پھر لکھ کر مٹا دیا ہے۔ رشتوں کا وہ تقدس جو ہندو معاشرے کا اور اسلامی معاشرے کے امتزاج سے عبارت ہے وہ ہمارے یہاں کہاں!!

''نازاں، تم کافی بڑی ہو گئی ہو، عقل مند ہو گئی ہو، بے باک اور بہت زیادہ حقیقت کے قریب آگئی ہو۔''

''یہ سب کچھ سر جی آپ سے سیکھا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا زندگی کیا ہے یہ تو آپ نے بتایا سب کچھ۔''

''مگر نازاں یہ سب باتیں جو تم کر رہی ہو۔ یہ تو میں نے نہیں تم نے خود اپنے ماحول اور معاشرے میں رہ کر سیکھی ہیں۔''

''مگر سر جی عوامل اور اوامر کو دیکھنے کا یہ اندازِ نظر تو آپ نے سکھایا۔''

نوازش کے اندر ایک تفاخر کا احساس پیدا ہو گیا اور سے بالآخر لاجواب ہونا پڑا۔ تانگہ رکا اور غلیچے نے تھاڑ پھاڑ دروازہ کھولا اور اندر جا کر شور مچا دیا۔ سر جی آئے ہیں خالہ کے سر جی''

کمرے میں بیٹھتے ہی اس سے ملنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ کوئی دس منٹ لگ گئے۔ نازاں کی باجی ماں، بہنیں، ماموں سب نے مصافحہ کیا۔ باجی ماں نے اپنے دیور کرم علی کو نوازش کے بارے میں بتایا۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ اور آخر کو کمرے میں وہ دونوں باقی رہ گئے۔

''یہ مکان ہم نے بہت پہلے، شاید میری پیدائش سے پہلے خریدا تھا کرائے پر دیا ہوا تھا۔ اب جب سے ہم بہنیں بڑی ہوئیں اماں نے اسے خالی کروا لیا۔''

''ہاں فیملی بڑی ہو جائے تو۔۔''

''نہیں سر جی، دراصل بہنوں کی کمانا آنا شروع ہوئی تو مکان کے کرائے کی ضرورت نہیں رہی۔۔۔۔اب لڑکیاں کرائے پر۔۔۔ ہونہہ!!'' وہ طنزیہ مسکرائی۔ ''آپ پھر کہیں گے بڑی بچی

باتیں کرتی ہوں، ہے نا؟"

نوازش نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد باجی ماں بھاری بھر کم چائے لے کر اندر آئی اور ٹرالی بڑھاتے ہوئے۔۔۔ نازاں بیٹی یہ چائے۔۔۔۔" کہہ کر باہر چلی گئی۔

"جی اچھا۔" نازاں یہ کہ کر اٹھی۔

"سر جی ایک بات پوچھوں؟ خالصتاً ذاتی۔"

"پوچھو!!"

"مائنڈ تو نہیں کرینگے۔"

"پوچھو۔ کیا بات ہے۔"

نازاں نے ذرا سا جھجکتے ہوئے کہا" سر جی آپ مجھے پریشان۔۔۔۔۔؟؟ اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"اب سے کچھ دیر پہلے تھا۔۔۔ مگر اب ایسی کوئی بات نہیں۔"

"کیوں؟"

"کچھ نہیں، بس وہی مسائل جو عام طور پر تیسری دنیا کے ہوتے ہیں۔"

"عورت ت ت۔۔۔!! سوال کا باقی حصہ اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ نوازش نے اس کی طرف دیکھا۔ اور قہقہہ روک کر ہنس پڑا۔

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں ایک جگہ مشرق کے شاعروں سے اس بات پر گلہ کیا ہے کہ ان کے اعصاب پر عورت سوار ہے حالانکہ عورت کے ذہن پر عورت سوار ہے۔

سر جی یہ میرا مسئلہ نہیں۔۔۔،، اس نے بڑی معصومیت سے سچ بول دیا۔

نوازش پر ایکدم سنجیدگی طاری ہوگئی اس نے جانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سب حالات و واقعات بتا دیئے۔

وہ "اوہ ہ ہ،!!!!" کہہ کر بجھ سی گئی۔ اس کی نظریں نوازش کے چہرے پر جم گئیں اور چہرے پر کرب کی سلوٹیں ابھر آئیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے سر جی! آخر کیوں؟ سمندر کا جوار بھاٹا ،خشکی پر کیوں ہے۔؟"

نوازش نے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔" اس لئے کہ خشکی پر انسانوں کا سمندر لہلہاتا ہے ٹھاٹھیں مارتا ہے۔" پھر اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ رات کافی ہو چکی ہے۔ چلتا ہوں۔

"کہاں؟" نازاں کے لہجے میں کسی قدر دکھ تھا،
"گھر!"
"کس گھر؟۔۔۔آپ آج یہیں رہیں۔" اس کے لہجے میں مشورہ، منت اور تحکم کا ملا جلا تاثر تھا۔
"نہیں نازاں۔ میں چلتا ہوں۔" وہ نازاں کا جواب سنے بغیر اٹھ گیا۔

وہ جب گھر پہنچا تو رابعہ سو رہی تھی۔ وہ چپکے سے بستر پر لیٹ گیا۔۔ شام کو وہ کتنا آزردہ اور کبیدہ گھر سے نکلا تھا۔ مگر نازاں نے آج کی رات کو بھاری ہونے سے بچا لیا تھا۔ اسے یونیورسٹی کے زمانے کی نازاں یاد آ گئی۔ گلیکسی میں وہ صرف اچھی سامع تھی۔ وہ بڑے دھیمے مزاج کی حامل تھی وہ ہمیشہ اپنے آپ میں رہتی تھی۔ مگر جب وہ کامریڈ کی موت کا صدمہ لے کر آپے سے باہر آئی تو اسے یونیورسٹی سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ نازں اس وقت بھی اسے اچھی لگتی تھی۔ پھر اس کا ایم اے کی تیاری کروانے کے دنوں میں اس کے ذہن میں اس کے بارے میں اگر کوئی کونے کھدرے میں کوئی خیال تھا بھی تو اس نے اسے کھرچ نکالا تھا۔ وہ نازاں کو اس لئے پڑھانے نہیں آیا تھا کہ وہ اسے اچھی لگتی تھی۔ بلکہ وہ اسکو پڑھانا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا اور ایسا کرنے میں اس کے لئے پیشہ ورانہ تسکین کا سامان تھا۔ مگر اب نازاں کی شخصیت میں ایک جاذبیت اور لہجے میں ایک اعتماد آ گیا تھا۔ اس کی اپنائیت بھری گفتگو نے اسے کافی ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اس کی معیت میں وہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ کس عذاب سے دوچار ہے۔

اب ہر ویک اینڈ پر وہ کسی نہ کسی جگہ، کسی نہ کسی وقت ملتے اور ماضی اور حال کریدتے، رابعہ کے مسائل کا تذکرہ کرنا ان کا معمول ہو چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں رابعہ کی طرف سے پیش آنے والے مسائل کی تکلیف کم ہوتی گئی۔ اب اس کی توجہ رابعہ کی طرف گھٹتی جا رہی تھی۔ پہلے رابعہ کو جب دورہ پڑتا تو وہ پریشان ہو جاتا تھا مگر اب وہ اسے روز کا معمول جان کر نظر انداز کر دیتا۔ خاص طور پر شام کا وقت جو اس پر بڑا بھاری ہوتا تھا اب اس کی شدت کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی اب زندگی ایک ڈگر پر آ گئی۔

آج اسے نازاں کے ہاں بیٹھے باتیں کرتے دیر ہو گئی۔ جب وہ اٹھنے لگا تو نازاں نے کہا۔ "سر جی، اتنی رات گئے آپ کدھر جائیں گے۔؟۔۔۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔۔ لیکن آپ اسے ایک سرائے ہی سمجھ کر رات گزار لیں۔ صبح چلے جایئے گا۔" وہ گھر سے بن بتائے نکلا تھا اس لئے وہ رات رکنا مناسب نہیں سمجھتا تھا اس لئے معذرت کر دی۔ نازاں

نے اسے باہر گلی میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''پھر بھی آیئے گا بلکہ آتے رہئے گا۔'' اور نوازش ہامی بھر کر اس کے ہاں سے چلا آیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو حسبِ سابق رابعہ سو رہی تھی۔ نوازش نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور صبح جب وہ کالج کے لئے نکلا تب بھی وہ سو رہی تھی۔ اس لئے اس سے ملاقات نہ ہوئی۔ اب اس کا زیادہ وقت نازاں کے بارے میں سوچنے میں صرف ہوتا تھا۔

ایم اے کرنے کے بعد نازاں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ وہ کون سے حالات تھے کہ جن کے باعث وہ اپنی تعلیم کا کماحقہٗ فائدہ نہ اٹھا سکی، اس نے نوازش کے پوچھنے کے باوجود ان کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ اس کی آواز میں سنی ہوئی غزل آج بھی اسے یاد تھی۔ نوازش کو یہ جان کر حیرانی اور افسوس بھی ہوا تھا کہ ایم اے کے بعد اس نے جہاں اور کچھ نہیں کیا تھا وہاں اپنی موسیقی کی تعلیم ادھوری چھوڑ رکھی تھی۔ باجی ماں کی خواہش کو تو وہ کئی بار ٹال چکی تھی مگر اب نوازش کے اصرار پر اس نے اپنا ذہن گانے کی طرف لگا لیا۔ ایک دن نازاں نے کہا۔ 'آخر سر جی آپ اپنی منوا کر ہی رہے۔'' نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بندہ پروری ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے۔''

''۔۔۔ نازاں کا رنگِ حیا اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ اور وہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ نوازش نے اس کی طرف پیار سے دیکھا۔ اس دوران وہ سنبھل چکی تھی۔ بولی۔ ''سر جی! یہ آپ خود سے پوچھیں کس قابل ہیں۔''

''کیا پوچھوں؟ ۔۔۔ کوئی جواب ہی نہیں ملتا کہ میں کون ہوں۔'' نوازش کے لہجے میں اب قدرے سنجیدگی تھی۔

نازاں نے کہا۔ ''ویسے سر جی مجھے بہت دکھ ہوا۔ آپ کے حالات سن کر۔۔۔ مجھے اپنے دکھوں کا ملال تھا۔ میں اپنی قسمت کا گلا کرتی تھی۔ مگر آپ کی بپتا سن کر یہ کھلا کہ۔۔۔۔ نانک دکھیا سب سنسار۔۔۔! سب گلے جاتے رہے۔ مجھے گھر نہ ہونے کا ملال تھا۔ مگر آپ کو دیکھا تو۔۔۔۔۔ جن کے گھر ہیں سکھی وہ بھی نہیں۔ گویا سکھ سکون کا تعلق گھر سے نہیں کسی اور چیز سے ہے۔!!

نوازش مسکرا کر بولا۔ ''تمہیں واقعی دکھ ہوا؟ ۔۔۔ کیوں؟''

''بس۔۔۔۔!!''

کوئی رشتہ بھی نہیں آپ سے میرا لیکن

جانے کیوں آپ پریشاں نہیں دیکھے جاتے

نوازش کے شعر میں اس کے جذبے کو زبان دے دی۔ نازاں ایک دم چونکی، اس نے نہایت تیز نظروں سے نوازش کو دیکھا۔ اس کی نظریں نجانے کن کن جذبوں کی آمیزش سے معمور تھیں ۔نوازش اندازہ نہ کرسکا البتہ ایک ہلکا سا ملال اسے کے رگ وپے میں اتر گیا، شاید اس نے کوئی غلط بات یا صحیح بات غلط موقعے پر کہہ دی ہے۔ مگر کیا؟ اس کے لئے وہ نازاں کے مزید ردعمل کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ ایک لمحہ تھا جو صدیوں پر پھیلتا جارہا تھا۔ اسے الجھن سی ہونے لگی، یہ بولتی کیوں نہیں، یہ مبہم سی لڑکی میرے اس خیال کی تائید یا تردید کیوں نہیں کرتی۔ خاموشی کا پردہ دونوں کے درمیان حائل تھا۔ پھر وہ ایکدم چھلک پڑی۔

نوازش تڑپ اٹھا۔ ''کیا ہوا۔۔ میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟''

نازاں نے جھکا ہوا سر نفی میں ہلا دیا۔

''تو پھر یہ بن بادل برسات؟''

''کچھ نہیں''۔ نازاں نے خفیف لہجے میں کہا۔

ادھر سیڑھیاں اترتی ہوئی باجی ماں کی آواز آئی۔ ''نازاں! دروازہ بند کر لینا۔ نازاں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اپنی جگہ جمی بیٹھی رہی اس کی آنکھوں سے آنسو پلک پلک چھلکتے گالوں پر رینگتے رہے۔ پھر وہ اٹھی اور دروازہ بند کرنے کے لئے کمرے سے باہر نکل کر دائیں طرف سیڑھیاں اتر گئی۔ نوازش اسکی چال اور سیڑھیاں اترتی چڑھتی آواز سے اس کی اندرونی کیفیت کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ واپس آکر نوازش کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اچانک اس کے جسم میں ایک لمس کی لہر، صوفے سے ہوتی ہوئی اس کی روح تک اتر گئی۔ رات، تنہائی، اکیلی لڑکی، اور معاملات حسن وعشق۔ وہ ایک لمحے کے لئے گھوم گیا، جھوم گیا۔ نازاں صوفے بیٹھ کر گردن موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

آپ خود تو کہا کرتے ہیں! سارے رشتے سلوک کے رشتے۔۔۔۔ ''تو پھر آپ نے، شعر میں یہ کیوں کہا کہ میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں؟

''اس لئے کہ ہمارے معاشرے میں دوستی اور خلوص کے رشتے کا کوئی status نہیں۔'' نوازش نے وضاحت کی۔ ''دیکھو نا نازاں میرا تمہارا کیا رشتہ ہے۔؟''

''تو سر جی یونہی کوئی اجنبی کے ساتھ اس طرح بیٹھتا۔''

''نازاں یہ دنیا اور اس کی زندگی اتنی آسان نہیں۔ ہمارا معاشرہ اور اس کا خوف دنیا کا سب سے

بڑا خوف ہے۔تم کتابی باتیں کر رہی ہو۔"

"تو سر جی کیا کتابیں فرشتے لکھتے ہیں؟ کیا کتابیں مشاہدہ نہیں دیتیں۔؟ کیا کتابوں میں انسانوں کی زندگی کے واقعات اور حادثات کا، اتفاقات کا بیان نہیں ملتا؟"

نوازش نے کل جس لڑکی کو جملوں کی ساخت و پرداخت اور لفظوں کا درست تلفظ بتایا تھا جسے گفتگو میں زیر و بم کا انداز سکھایا تھا اور جسے لٹریچر کا مذاق اور مزاج بتایا تھا۔شعر فہمی کا معیار سمجھایا تھا، ادب اور زندگی کا آپس میں تعلق، رشتہ اور قرینہ بتایا تھا وہ آج اسے زندگی کا انداز نظر سمجھا رہی تھی وہ نوازش کو اسی کے الفاظ کی زنجیروں سے، اسی کے انداز نظر سے دیکھ رہی تھی۔اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ نازاں کا باتوں کا کیا جواب دے۔پہلے سی وہ کتابی باتیں کہہ کر منہ کی کھا چکا تھا۔وہ جو کچھ کہ رہی تھی کچھ غلط تو نہ تھا۔ایسا ہو سکتا تھا اور ہوتا بھی تو رہا ہے،۔جب سے طوائف اور تماش بین کا سلسلہ چلا تب سے، صدیوں سے! نجانے کتنوں نے بغاوت کی اس سماج سے، رسوائیاں اوڑھیں۔ ذلتیں پہنیں۔کامیاب ہوئے ناکام ہوئے، مگر یہ سلسلہ رکا نہیں آج بھی پیروں چودھریوں وڈیروں سیاستدانوں اور سرمایہ داروں کی یہی نجی کارستانیاں ہیں۔مگر یہ سفید پوش، زیریں متوسط طبقہ، جب بھی ان فرسودہ اطوار و افکار سے بغاوت کرتا ہے۔تو 'لوگ کیا کہیں گے' کا خوف اسکا راستہ روک لیتا ہے۔۔۔!! سوچوں کا دریا گمان اور یقین کے کناروں کے درمیان کسی ان دیکھی منزل کی طرف بہتا رہا۔نازاں نے اسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا دیکھا تو چپکے سے اٹھ گئی مگر اس خیال سے ذرا دیر رکی کہ شاید وہ اس کی طرف متوجہ ہو۔مگر اسے وہ اسی طرح صوفے پر ٹیک جمائے دیوار کی طرف دیکھتا رہا۔چنانچہ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے خالی صوفے کو دیکھ کر اسے اپنے استغراق کا اندازہ لگایا۔اس نے کلائی کی گھڑی پر دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔مگر نیند نینوں سے کوسوں دور تھی۔وہ تھوڑی دیر کے لئے کمر سیدھی کرنے کو ساتھ میں بچھے پلنگ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔گزرے چند گھنٹوں کا لمحہ لمحہ اس کی نظروں میں فلم بن کر گزرنے لگا۔کمرے میں مدھم روشنی تھی۔اچانک قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ نے کمرے کی خاموشیوں میں خراش ڈالی۔اس نے آنکھیں بند کئے رکھیں، یہ سوچ کر کہ نازاں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔آواز قریب آتی گئی یہاں تک کہ نازاں کے سانسوں کی آواز، اس کی خوشبو نے نوازش کو مہکا دیا۔یا اللہ! کیا ہونے والا ہے۔آواز آئی کچھ نہیں۔ نازاں نے دودھ کا گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھا اور آرام سے واپس مڑ

گئی۔ کمرے کی فضا اس کے لمس سے خالی ہو گئی۔ کیا وہ پھر آئے گی، کسی اور بہانے سے یا پھر صبح تک یہی بے قراری رہے گی۔؟ وہ یہ سوچتے سوچتے سو گیا۔

جب کھڑکی کے پردے سے صبح کی کرنوں نے اس کی بصارتوں پر دستک دی تو آٹھ بج چکے تھے۔ نازاں چائے کا کپ ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تم کب آئیں؟

"۔صباح الخیر!۔۔چائے!!" نازاں نے تروتازہ لہجے میں کہا۔

"تم۔۔کب سے کھڑی ہو؟" نوازش نے آنکھیں ملتے ہوئے نہایت ملائمت سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی خبر نہیں کہ کب سے کھڑی ہوں۔۔۔اس انتظار میں کہ کب۔۔۔آپ۔۔۔" نازاں نے سادگی اور بھولپن سے کہا مگر جملے میں ذو معنویت محسوس کن تھی۔ نوازش ابھی تک پوری طرح نہیں جاگا تھا مگر اس جملے نے اس کی نیند فوراً اڑا دی۔ وہ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ہنستے ہوئے بولا۔

"اوہ!! صبح سویرے بھرپور حملہ!!"

"حملہ نہیں جملہ"۔ نازاں کا یہ جواب سن کر اسے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بیٹھو!" اس نے تکیے کی ٹیک لے کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"گھر والے۔۔۔؟؟؟" نوازش نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"اس گھر میں اس وقت رات کا پہلا پہر چل رہا ہے۔ سر جی اس بازار کی راتیں جاگتی ہیں۔ اور دن سوتے ہیں۔۔۔رات کی مزدوری کرنے والے دن کو سوتے ہیں نا؟۔"

"مزدوری؟"

"ہاں سر جی۔ کیا یہ مزدوری نہیں! مزدوری وہی ہوتی ہے نا آپ کے بقول جو روح پر چانے اور دل بہلانے کے بجائے چولہا جلانے کے لئے کی جائے۔۔۔"

نوازش نے ہلکی سی 'ہونہہ' کی۔ اس نے دل میں سوچا بھولی بھالی لڑکی کیا جانے کہ ان کا چولہا جلتا ہے تو کتنے چراغ اور چولہے بجھ جاتے ہیں۔ یہ بیچاری تو جو سنتی ہے، دیکھتی ہے اسے اپنا موقف بنا لیتی ہے۔ اس نے دل میں کہا کاش نازاں تم نے بازاروں کے اجاڑے ہوئے گھر دیکھے ہوتے۔ طوائف کی مظلومیت جب سے فکشن میں آئی تب سے طوائف ہمارے معاشرے میں زیادہ دخیل ہو گئی ہے لوگ کہانی کاروں کی ذہنی اختراعوں سے متاثر ہو کر گھروں سے بازاروں کا رخ زیادہ کرنے لگے ہیں۔ ہر سنجیدہ تماش بین کسی کہانی کا کردار ڈھونڈنے آتا ہے اور خود ایک کردار بن

کے رہ جاتا ہے۔ عورت نے تو ایسے بھی مرد کو فتح کرنے کا شیطان سے شاید عہد کیا ہوا ہے وہ مرد کو فتح کرنے کے لئے اپنے ہر رشتے کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ اور بعض اوقات اسے فتح کرنے کے جنون میں اپنا آپ بھی ہار دیتی ہے۔۔۔ نازاں کی طرح! کیا وہ اسے فتح کر پائے گی۔؟ نوازش کے ذہن میں یہ سوال ابھرا۔ اس سوال کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ اور دو تین ماہ کی بازار میں تدریس اور اس کے بعد کی صاحب سلامت کے باوجود ایک مہین سا جھجک نما پردہ تھا۔ جو دونوں کے درمیان حائل تھا۔ سر جی، جی سر، اچھا سر جی کہنے کے علاوہ نصابی مباحث تھے جو وہ بڑے غور اور توجہ سے سنا کرتی، نوٹ لیتی۔ مگر ادب زندگی اور موسیقی ایسے موضوعات تھے جن پر وہ نوازش سے کھل کر گفتگو کیا کرتی تھی اور اب جب وہ اتنے عرصے کے بعد ملی تھی تو اس کو نصابی کتب کے علاوہ باقی سب کچھ یاد تھا۔ وہ نوازش کی کہی ہوئی ہر بات اسے یاد دلاتی تھی اور لاجواب کر دیتی تھی۔ اب وہ ہر معاملے پر اپنا نقطہ نظر بیان کرتی اس کا نقطہ نظر سنتی، اتفاق واختلاف ہوتا مگر! دراصل ان ملاقاتوں کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ دنوں میں سالوں کے سفر طے ہو گئے تھے۔

رفتہ رفتہ ابتدائے شوق کی ملاقاتیں شاموں سے راتوں تک پھیل گئیں۔ اب کئی کئی دن گھر میں اس کی آمد برائے نام اور آپس کی گفتگو۔۔۔ ہوں، ہاں، ٹھیک ہے، اچھا۔۔۔ تک محدود رہ گئی تھی۔ کالج سے آکر کھانا کھا کر، آرام کرتا اور سر شام نازاں کی طرف نکل جاتا۔ نازاں شامیں نوازش کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ کوئی سات آٹھ ماہ اسی معمول پر گزر گئے۔ کبھی کبھی وہ اور نازاں کسی شو میں، ڈرامے یا فلم دیکھنے بھی چلے جاتے مگر عام طور پر اس کی شامیں نازاں کے ہاں بالائی منزل پر اس کے کمرے ہی میں گزرتیں۔

اب وہ شام کا ریاض اکثر اس کی موجودگی ہی میں کرتی۔ کبھی کبھار نوازش اسے کسی گانے کی فرمائش بھی کر دیتا۔ کیونکہ موسیقی کا شوق اسے نیلسن کی نسبت سے ہوا تھا۔ اس لئے موسیقی میں اسے ایک آسودگی سی ملتی تھی۔ نازاں میڈم نور جہاں کو بہت خوبصورت گاتی تھی۔ چنانچہ نوازش اسے میڈم ہی کی کسی چیز کی فرمائش کرتا اور وہ اس جذب وکیف اور رچاؤ کے ساتھ گاتی کہ نوازش ایک لمحے کے لئے اپنے آپ کو بھول جاتا۔ ایک طرح سے اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ اکثر میڈم کی ایسی فلمی یا غیر فلمی چیز بتاتا جو فنی اعتبار سے اعلیٰ ہونے کے باوجود مقبول نہ تھیں۔ چند روز پہلے اس نے ایسی ہی دو غزلوں کی فرمائش کی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ ہارمونیم پر راگ الاپ رہی تھی اسے دیکھتے ہی اس نے سر بدلے اور اس غزل سرا ہو گئی۔

نہ مہربان نہ اجنبی ، نہ دوستی ، نہ دشمنی
نہ جانے پھر بھی کیوں ہمیں اسی کا انتظار ہے

وہ گا رہی تھی اس کے چہرے پر لفظ لفظ کا مفہوم ،اور شعری کیفیت کا جذب و گداز نمایاں تھا۔نوازش چند لمحوں کے لئے خود کو لکھنوی بالا خانے پر رونق افروز نواب محسوس کیا۔وہ سرور و مستی کے اس مقام پر تھا جہاں پر بادہ مستی اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔۔۔۔۔۔۔پہلی غزل ختم کر کے اس نے دوسری غزل کی الاپ لیا، الاپ کیا لیا۔۔۔۔نوازش نے محسوس کیا کہ۔۔دل ہی نکال لیا۔غزل کا مکھڑا گا رہی تھی۔

بن تیرے رات تو کیا ہم سے کٹے دن بھی نہیں
چین دل کو کسی پہلو کبھی ممکن ہی نہیں

ایک جگہ پر اس نے جب درد لگائی تو مسکراتے ہوئے داد طلب نظروں سے نوازش کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں اس کے جذبوں کی سرخی سرمہ بن کر ہلکی ہلکی نمی کے ساتھ جلوہ گر تھی۔آج طبلے والا اسکی گائیکی کو ٹھیک دینے کیلئے موجود نہ تھا مگر اس نے تان پورے ہی پہ مکمل ردہم دے کر طبلے کی کمی کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔کمرے میں دونوں ہی تھے۔نوازش اٹھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی، وہ اسے دیکھ رہا تھا۔یہ غیر ارادی فعل تھا جو دونوں طرف سے سرزد ہو رہا تھا۔پھر گاتے گاتے اس کے سروں پر سانسوں کی تیزی غالب آ گئی۔اور وہ گاتے گاتے ایک دم چپ ہو گئی۔کمرے کی گاتی فضا یکدم اتھاہ خاموشی میں ڈوب گئی۔دونوں کی سانسیں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔نظریں گنگ، لبوں کی تھرتھراہٹ، لہو کے گنبد کا ایک ایک در ایک ایک کر کے وا ہو رہا تھا۔۔۔بدن کا روم روم لڑکھڑا رہا تھا۔

اس رات کے بعد کئی روز تک نوازش نے نازاں کے گھر کا رخ نہ کیا۔بلکہ گھر ہی میں رہا مگر گم گم سا۔رابعہ کو آج کئی ماہ بعد اس کی صحبت میسر آئی تھی۔اس تمام عرصے میں رابعہ میں جو خوشگوار تبدیلی آئی تھی وہ یہ تھی کہ اب اس پر کئی ماہ سے وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔اور بعض اوقات اسے غصہ آیا بھی تو ساجد پر ہی نکالا مگر وہ بھی ایسے وقت جبکہ نوازش گھر پر نہیں ہوتا تھا۔اب وہ جب گھر آتا تو رابعہ ایک رکھاؤ اور چاؤ سے اسے خوش آمدید کہتی۔نوازش کی اس سے دوری اور عدم دلچسپی نے ان کے درمیان ایک مہین سا، متکلف سا پردہ حائل کر دیا تھا۔یہ رابعہ کے مزاج میں

ایک مثبت پیش رفت تھی۔اور سچی بات یہ تھی کہ اب نوازش کو رابعہ میں اتنی دلچسپی بھی نہ رہی تھی۔وہ اس کے بارے میں پہلے جتنا caring ہوا کرتا تھا،اب نہیں تھا۔

جس ماہر نفسیات کے پاس وہ زیر علاج تھی،جب دوائیاں ختم ہو جاتیں تو وہ خود ہی اس کے پاس جاتی۔بس نوازش وقتاً فوقتاً اس کی خیریت پوچھ لیتا۔کیونکہ نوازش سے اس کی ملاقات بہت مختصر ہوتی،اس لئے اس نے اپنے ہمسائے میں رہنے والی خواتین سے تعلقات بنا لئے تھے۔اب اس کا دن ان کے ساتھ باتوں کے تبادلے میں گزر جاتا۔محلے میں اس کی دوستی سب سے زیادہ پروفیسر گلشن علی کی بیوی ام کلثوم سے زیادہ تھی۔ام کلثوم اس کی زندگی کے نشیب وفراز سے واقف تھی۔اس کی صحبت رابعہ کے بہت کام آئی۔دھیرے دھیرے اس کے خیالات میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔مگر ادھر نوازش کے خیالات میں ایک ہیجان کی کیفیت روز افزوں تھی۔اسے رابعہ کی موجودگی سے وحشت سی ہوتی تھی۔رابعہ بھی اس سے کوئی گلہ شکوہ نہ کرتی تھی۔دراصل یہ اس کی ایک شعوری کوشش تھی۔حالانکہ نوازش کا یہ رویہ اسے کم دکھ نہ دیتا تھا مگر ام کلثوم نے اسے قدم قدم پر روک ٹوک کر قائل کر کے اس کے اندر ضبط اور برداشت کی خو پیدا کر دی تھی۔اب اسے اس بات کا احساس تھا کہ اس ساری صورت حال کی وہ خود ہی ذمہ دار تھی۔نوازش کو خود سے اچٹانے والی وہ خود ہی تھی۔نوازش کو اس حد تک لانے میں اس کی کوئی شعوری کوشش یا خواہش کا دخل نہ تھا۔وہ جو کچھ کرتی تھی وہ اس کے اختیار میں نہ تھا۔مگر اس کا اثر تو بہر حال بطور خاوند نوازش پر ہونا ایک لازمی امر تھا۔اور اس کا اسے احساس تھا۔وہ نوازش سے ہر ملاقات اور ایک ایک بات اور نوازش کے ہر روز کے رویے کے بارے میں ام کلثوم کو بتاتی اور کلثوم اسے برانگیختہ کرنے کے بجائے اسے مثبت انداز میں معاملے کی سنگینی کو رفع دفع کر دیتی۔اگر وہ نوازش کی بے رخی کا تذکرہ کرتی تو ام کلثوم اپنے خاوند کی بے رخی کا ذکر بڑھا چڑھا کر کرتی۔اس نے رابعہ کو کبھی بھی اپنے خاوند کے خلاف ہلاشیری نہیں دی تھی۔یہی وجہ تھی کہ وہ نوازش کے اس رویے کو نظر انداز کر رہی تھی۔اب بس ایک چھت تلے دو اجنبیوں والا معاملہ تھا؛ایسے اجنبی جن کے آپس میں رسمی سے تعلقات تھے۔

اس رات کے بعد وہ کئی روز تک نازاں کے ہاں نہ جا سکا جس کی ایک وجہ تو اس کے اندر کی کشمکش تھی اور اس پر صبر کا پھاہا محرم نے رکھ دیا۔کیوں کہ اس کے چند دن بعد محرم کا چاند چمکا۔بازار اور اہل بازار کی ساری سرگرمیاں یک لخت معطل ہو گئیں۔زرق برق اور لش پش لباس

کی جگہ کالی شلوار قمیص نے لے لی۔ بجلی برساتی نظروں کے تیر غم حسینؓ میں بہنے والے آنسوؤں میں بجھ گئے اور نوحہ کناں آنسوؤں میں چہروں کا غازہ بہہ گیا۔ موتیے اور گلاب کے گجرے اور ہار پہننے والیوں کے چہروں پر خاک اڑنے لگی۔ رقص و نغمہ اور گھنگھروؤں کی چھنا چھن نوحہ و ماتم اور بین کرتی ہوئی فضاؤں میں گم ہو گئی۔ تماش بینوں کے لئے شبانہ روز کھلے رہنے والے بالا خانوں کے دروازے بند ہو گئے۔ دریچوں میں رنگ برنگے آنچلوں کی جگہ سیاہ علم لہرانے لگے۔ پورے بازار پر سوگ طاری ہو گیا۔ گناہ گلیوں کی پرپیچ پراسرایت پر بھی ویرانی راج کرنے لگی۔ کھولیوں کے کنڈوں پر موٹے موٹے تالے پڑ گئے۔ اگر کوئی اکا دکا کسی باسی اور بوسیدہ جسم کا متلاشی اس گلی میں داخل ہو کر نامراد باہر نکلتا تو گلی کی نکڑ پر کھڑا کوئی دلال اسے نفرت اور غصے سے بھرپور کھا جانے والی نظروں سے گھورتا۔ عام دنوں میں یہی لوگ اسے دیکھ کر کھل اٹھتے ہونگے۔

رابعہ کو بازار حکیماں میں اس کے میکے میں چھوڑا اور واپس بھاٹی گیٹ کی طرف جانے کے بجائے وہ ٹکسالی کی طرف بڑھ گیا۔ ناولٹی سینما کے چوک سے ذرا پہلے ایک گناہ گلی کے پاس کھڑے دو تین دلال کالے کرتے اور چڑ مڑ میلی سی شلوار میں ملبوس کھڑے اس گلی میں سے آتے ہوئے ایک لرزیدہ قدم جوان کو بڑی حقارت سے دیکھ رہے تھے۔ ''بھینچود۔۔۔ماں کے ساتھ جا سوؤ اگر چار دن صبر نہیں ہوتا''۔۔۔دوسرے نے کہا۔ ''اپنی ماں کو ہی تو ڈھونڈنے آیا ہے دلا۔۔'' پاس سے گزرنے والے نوجوان نے اس کا یہ فقرہ سن لیا تھا۔ اور وہ اس فقرے کا سیاق و سباق سمجھ گیا تھا۔ دلال کے اس فقرے نے اس کی غیرت پر تازیانہ لگایا تھا۔ اس نے غراتے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میری ماں تو گھر بیٹھی ہے۔ مادر چود۔۔۔! تیری ماں کو ڈھونڈنے آیا ہوں۔ بھڑوے، دَلے ے۔۔'' وہ تن کر کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ وہ جسمانی طور پر بھی ان سب میں ڈیل ڈول والا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دست و گریباں ہوتے انہی میں سے ایک نے کہا۔ ''چلو بھائی جان چھوڑو!''

''خبردار!'' وہ گرجا۔۔ ''بھائی مت کہنا''۔

''چلو۔۔باؤ جی۔۔۔۔جائیں آپ میں معافی مانگتا ہوں۔۔۔غلط بات کی ہے اس نے۔۔آپ جائیں میں اسے سمجھاتا۔۔۔''

''تم کیا میں اسے سمجھاتا ہوں۔۔'' وہ اب ناجائز طور پر دھونس جما رہا تھا۔ '' اسی دوران ایک اور آدمی جو اسی کان کے پاس کھڑا تھا جہاں نوازش کھڑا تھا۔۔۔ لحیم شحیم۔ جو ابھی تک بظاہر اس لڑائی

سے لاتعلق کھڑا تھا اور جھومتا ہوا آگے اور نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اوباؤ! نیوانیوا ہو کے چلا جا۔۔ چل۔۔'' اس نے نوجوان نے موقعے کی نزاکت کو سمجھ لیا اور چپکے سے کھسک لیا۔ اس کے بعد وہ ان سے مخاطب ہوا۔ ''کیا ضرورت تھی پنگا لینے کی۔۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''استاد جی! انہیں شرم نہیں آتی، محرم ہے۔ مسلمان بنے پھرتے ہیں۔۔۔۔'' اس کے لہجے میں نوجوان کے بارے میں تحقیر اور ناپسندیدگی کا رنگ نمایاں تھا۔ استاد جی لحہ بھر چپ رہا، شاید اس کی بات کا جواب سوچ رہا تھا۔ پھر اسے کوسنا دینے کے انداز میں بولا۔ ''تمہیں تو آتی ہے؟ تو اپنے پاس رکھ۔۔ یہ ہمارے گاہک ہیں۔ ہماری روزی روٹی کا ذریعہ ہیں۔ سمجھ آئی؟'' وہ تینوں چپ چاپ کھڑے رہے اور استاد جی سڑک کے کنارے دوسری طرف جہاں نوازش کھڑا تھا اس کے پاس آ کر دکان دار کے پاس کھڑا ہو گیا۔ نوازش کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ ''بچے ہیں، زیادہ ہی جذباتی ہو جاتے ہیں۔۔۔ اسے بھی عزت نہیں پیاری تھی مگر قسمت اچھی تھی۔ چلا گیا ورنہ ایسے بڑے دیکھے ہیں۔۔۔'' نوازش نے ایک مسکراہٹ ہی اس کا جواب دیا۔ اس نے کہا باؤ جی، شربت پلاؤں بادام کا۔۔ لاچی والا۔'' نوازش اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چل پڑا۔ اس نے سنا تھا کہ یہاں ناولٹی سینما سے شاہی قلعے کی طرف جاتے ہوئے۔ کہیں نازاں کا خاندانی امام باڑہ ہے۔ نازاں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ وہاں مجلس اور نوحہ پڑھا کرتی ہے۔ عام طور پر عصر کے بعد محرم کی مجالس برپا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور اب عصر کی اذان ہو چکی تھی۔ چند ایک خواتین مخصوص ماتمی لباس میں اپنے بچوں، اور مردوں کے ساتھ اس کے سامنے سے گزریں۔ جی میں آئی کہ ان سے پوچھے مگر کیا پوچھے؟ نازاں کہاں ہے! اگر کسی نے پوچھ لیا کہ کیا کام ہے؟ تو کیا جواب دے گا۔ اور اگر کسی نے کہہ دیا کہ اسے کیا خبر؟ تو پھر!!۔۔۔۔۔ بالآخر اس نے ان کا پیچھا کر کے امام بارگاہ تک پہنچنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ ان کی باتوں اور لباس سے لگتا تھا کہ وہ کسی مجلس پر ہی جا رہی ہیں۔ ان خواتین کا تعاقب کرتے کرتے ایک مارکیٹ کے پاس سے گزرا تو اسے یاد آیا کہ یہاں کبھی فریدہ عثمانی کا مکان ہوتا تھا۔ اسی کے دائیں طرف مڑ کر اس نے پہلی دفعہ نازاں کا بالا گھر ڈھونڈا تھا۔ اب اس کے ذہن میں اس علاقے کے خدوخال واضح ہونے لگے چنانچہ جلد ہی وہ اسی مطلوبہ امام باگاہ تک پہنچ گیا۔ غالیچہ سٹیل کا جگ ہاتھ میں لئے لوگوں کو پانی یا لسی پلانے میں مگن تھا۔ غالیچے کو وہاں دیکھ کر اسے منزل کا سراغ مل گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے پاس گیا اور کہا۔ ''پانی کا ایک گلاس۔۔۔'' غالیچے نے اسے دیکھے بغیر بے دھیانی سے کہا۔ ''کیوں نہیں، لو دودھ

پیو، ٹھنڈا۔۔'' اس نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور وہ نوازش کو دیکھ کر ایک دم اچھل پڑا۔ اور بھاگتا ہوا ایک پنڈال کی طرف بڑھا۔ نوازش کو اس کی ہلکی سی آواز آرہی تھی یا اس کے کان بج رہے تھے۔۔'' خالہ خالہ۔۔۔۔ خالہ۔۔ پیارے سر جی۔۔۔'' تھوڑی دیر بعد کالی شلوار قمیص میں، دوپٹہ سر پر لپیٹے۔ نازاں برآمد ہوئی۔ اس نے سر کو ذرا سا جھکا کر اسے سلام کیا۔۔۔ نوازش کو دیکھ کر ماتمی چہرے پر تحیر اور شاید رسمی مسکراہٹ اور دبی دبی خوشی۔۔۔ ملی جلی کیفیات نے نوازش کا من مچلا دیا۔ مگر اسے پوری طرح احساس تھا کہ یہاں ان دنوں مسکرانا تک منع ہے۔ اس لئے اس نے بھی رسمی مسکراہٹ ہی سے سر کو جنبش دے کر اس کے سلام کا جواب دیا۔'' سر جی! آپ۔۔ یہاں کیسے؟''

'' سوچا، تمہارا گانا سنتے ہیں آج نوحہ بھی سن لیں۔۔۔ تمہارے ساتھ خوشی غم کا ساتھ جو ہوا۔'' اس ماحول میں یہ آخری جملہ غیر موزوں تھا، اس کا احساس اسے بولنے کے بعد ہوا۔ نازاں نے اس جملے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔۔ شاید لیا ہو، مگر جان بوجھ کر اس نے جملے کا آخری حصہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔'' ابھی تو سر جی مجلس شروع ہوئی ہے اس کے بعد جب ماتم ہوگا تو۔۔'' اس کے لہجے میں وضاحت کے ساتھ ساتھ اعتذار بھی تھا۔'' '' تو ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔۔ مگر ایک بات کہوں۔؟ '' اس نے نازاں کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر کہا۔'' موقع تو نہیں مگر کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ آج تم بہت زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو۔''۔۔۔ موقع کہنے کا نہیں تو سننے کا بھی نہیں تھا۔ وہ کہ اس وقت بالاخانے کی گائیکہ نہیں بلکہ مجلس کی عزادار تھی۔ میک اپ سے عاری آنکھوں میں جمے ہوئے آنسوؤں کا دھندلا سا رنگ اور رتجگوں کی تھکان سے گراں بار چہرہ۔۔۔ حیا کی سرخی سے تپ اٹھا اس نے پیار بھری نظروں سے نوازش کی طرف دیکھا اور پھر پاس کھڑے غالیچے کی طرف دیکھا۔'' سر جی اب میں جاؤں!!''

وہ نوازش کے جواب کا انتظار کئے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی اور نوازش کو بے اختیار نیلسن یاد آگئی۔ اس نے بھی نوازش کا فیصلہ سننے کے بعد کہا تھا۔۔ اب میں جاؤں۔۔۔ اس کا جی چاہا کہ نازاں سے کہے کہ نہ جاؤ کہ اس طرح جانے والے واپس نہیں آتے۔ عمر بھر کا ایسا ملال دے جاتے ہیں کہ انسان عمر بھر ہاتھ ملتا رہتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے مڑ کر اسے روکنا چاہا مگر وہ پنڈال کے پاس پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا مردانے کی طرف چلا گیا اور جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ ذاکر آئے، مقرر نے ایک ترتیب کے ساتھ مصائب بیان کئے نقشہ کھینچ

کے رکھ دیا، نعرے لگتے رہے مگر وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر سب تعظیماً کھڑے ہوئے تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ سلام پڑھا گیا۔ اس کے بعد ماتم اور پھر محفل برخواست ہو گئی۔ مگر خواتین کی عزاداری ابھی جاری تھی۔ معاً اس کی سماعتوں پر ایک مانوس سی آواز نے دستک دی۔۔ دل کی مراد پوری ہو گئی تھی۔

فریاد محمد صل علیٰ ، گھر لٹیا علیؑ دا بے درداں
فریاد محمد صل علیٰ --------------
کربل آ کے کوفیاں لٹیا کعبے دے مہماناں نوں
ریت تتی تے ظالماں رولیا بولدیاں قرآناں نوں
آئی غیرت نہ بے ایماناں نوں
ساڈا پردہ رولیا بے درداں
فریاد محمد ﷺ صل علیٰ ، گھر لٹیا علیؑ دا بے درداں
فریاد-----

نازاں کی آواز کا اتار چڑھاؤ اور الفاظ کی ادائیگی اور اس کے سوز کی تاثیر۔۔ تھوڑی دیر کے لئے اس نے خود کو کربلا کی تپتی جھلستی ہوئی سرزمین پر ننگے پاؤں کھڑا محسوس کیا۔ اس کا دامن بھیگ گیا۔ یہی بھیگا دامن لے کر وہ اٹھا اور واپس چل پڑا۔ اب اس کے ذہن میں کہیں دور دور بھی نازاں کی آواز کا سحر یا اس کے لہجے کی کوملتا نہیں تھی۔ بلکہ کربلا کا منظر اس کی آنکھوں میں سمایا ہوا تھا اسکے تصور میں بی بی زینبؑ کا سراپا تھا۔۔۔ اس کائنات کی سب سے زیادہ دکھی ٹوٹی ہوئی مگر ثابت وسالم لوگوں سے بھی زیادہ مضبوط خاتون، جس نے اپنے سامنے سارا گھرانہ کٹتے دیکھا۔ سب کچھ لٹتے دیکھا۔ اور جو پورے قد سے یزید کے دربار میں کھڑی ہو کر شیر کی طرح گرجی۔۔۔ وہ مجبور و مقہور اور بے بس شاہزادی جس کے پائے استقامت نے بچے کھچے گھرانے کی بے مثال شیرازہ بندی اور باکمال سرپرستی کی۔ جو رہتی دنیا تک عورت کی ہمت اور بہادری کا لازوال نمونہ ہے۔۔"
اچانک اسے خیال آیا۔ کاش اس بازار کی عورت نے کبھی بھی زینبؑ کی ہمت اور شجاعت سے توانائی کشید کر کے معاشرے کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہوتی تو شاید آج جسموں سے سجے ہوئے بازاروں کی رونق ماند پڑ گئی ہوتی۔ مگر۔۔۔ ہر قوم، اپنے ہیروز کی پوجا تو کرتی ہے، اس کے آدرشوں کا ڈھنڈورا تو پیٹتی ہے۔ اس کے ناموس کے لئے مرمٹنے کو تیار رہتی ہے۔ مگر

اس کا پیغام نہیں سمجھتی، اس کے راستے پر نہیں چلتی۔ جبھی تو اقبالؔ نے کہا ہے۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں

گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

وہ اپنے اندر ہی اندر سوچ کر رہ گیا۔ اس رات وہ چین سے سو نہ سکا۔ اس نے لیٹے لیٹے سوچا شاید علامہ اقبال کا یہ شعر اسی قسم کی بے چینیوں اور بے قراریوں کی داستان سناتا ہے۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں

کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

آج بہت دنوں کے بعد اسے نائل کی یاد آئی تھی۔ نائل سے رابطہ کئے اسے تین چار سال گزر گئے تھے ابوظہبی میں کئی بار یہ خیال آیا تھا کہ نائل سے ملے اور اس مسیحا صفت کا اتا پتا پوچھے جس کا گردہ اس کے جسم میں اس کی صحت اور تندرستی کا ضامن بن کر اپنا کام کر رہا تھا۔ مگر ابوظہبی سے آنے کے بعد کچھ ایسے معاملات پڑے تھے کہ اسے تو اپنی ہوش نہ رہی تھی۔ اب جبکہ نازاں کی صحبت نے اسے نہال کر دیا تھا۔ تو آج اسکے دھیان میں اسی سوال نے سر اٹھایا کہ آخر کار کون ہے وہ۔۔۔؟ چنانچہ اسی مقصد کے لئے وہ آج میو ہسپتال آیا تھا۔ مگر یہاں آ کر پتہ چلا تھا کہ اس کی ٹرانسفر چند ہی ماہ پہلے سول ہسپتال مری میں ہو گئی ہے۔

جب وہ ہسپتال کے صدر دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نازاں ایک نوجوان کے ساتھ ہسپتال کی ایمرجنسی سے باہر نکل رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر نوازش پر پڑی وہ تیزی سے پیچھے مڑی۔ نوجوان اپنے دھیان میں آگے چلا جا رہا تھا۔

''اوہ سر جی!'' اس کے لہجے میں حیرانی اور یوں اچانک غیر متوقع طور پر ملنے کی خوشی جھلک رہی تھی۔ ''آپ!۔۔ایک منٹ۔۔'' اس نے چند قدم آگے جاتے ہوئے نوجوان کو آواز دی۔۔۔ اوئے چھیمے۔۔۔!!''

نوازش کو اس کا روزمرہ بول چال کا انداز بڑا پیارا لگا۔

''سر جی! کہاں، آپ کیسے آئے تھے، ہسپتال آئے تھے۔۔؟''

نوازش نے مسکراتے ہوئے اسے بدستور پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اوئے چھیمے۔۔۔ایک دفعہ پھر کہو۔'' نازاں شرما گئی۔ ''وہ۔۔دراصل۔۔۔'' اتنی دیر میں چھیما قریب آ گیا تھا۔ ''۔۔۔چھیمے!

یہ سر جی ہیں۔'' چھیمے نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ''سر جی یہ چھیما ہے۔۔''
نوازش نے اسی موڈ میں مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ ''سن چکا ہوں۔۔۔۔''
نازاں نے پہلے نوازش کی طرف دیکھا اور پھر چھیمے کی طرف۔ ''یہ میری پھوپھو کا بیٹا ہے۔رکشہ چلاتا ہے۔میری وکھی میں درد ہو رہا تھا اس لئے باجی ماں نے زبردستی چھیمے کے ساتھ بھیج دیا۔ڈاکٹر نے کچھ رافع درد گولیاں دی ہیں اور بتایا ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

وہ دونوں رکشے پر بیٹھ کر کریم پارک کی طرف روانہ ہوئے۔رکشے میں بیٹھ کر پہلی دفعہ دونوں کی رانیں آپس میں اس طرح مس ہوئیں کہ نازاں تو نہیں البتہ نوازش کے اندر ایک نرم گرم سی لہر پورے بدن میں دوڑ گئی۔نازاں نے بات کرنے کے لئے اپنا چہرہ اس کی طرف موڑا تو قربتیں اور بھی بڑھ گئیں۔نوازش نے اس کے سانسوں کی مہک اپنے نتھنوں پر گدگداتی ہوئی محسوس ہوئی وہ بمشکل پھسلتے پھسلتے سنبھلا۔اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو حواس باختہ ہو جائے گا یا اس کا دم گھٹ جائے گا۔اس کی ران مسلسل نازاں کی ران سے جڑی ہوئی تھی۔مگر اس کیلئے اس حالت میں اس طرح بیٹھے رہنا مشکل نظر آ رہا تھا۔اسے چپ پا کر نازاں نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہیں۔''

نوازش نے ہمت کر کے اتنا کہا ''شور میں آواز سنائی نہیں دیتی۔رکشہ سے اتر کر بات کرتے ہیں''۔

نازاں نے چھیمے سے کہا۔ ''چھیمے ہمیں یادگار پر اتار دینا۔''

نوازش نے نازاں کی طرف دیکھا ''یادگار؟''

نازاں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ہاں! یادگار پاکستان سے آگے تانگے میں چلتے ہیں۔''

''یادگار نہیں، مینار پاکستان!!'' نوازش نے تصحیح کی۔

چھیمے نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہو پہ آ آن (لاہوریئے مخصوص لہجے میں بھائی جان کو اسی طرح متلفظ کرتے ہیں) مگر لوگ نہیں مانتے۔آپ جیسے ایک پڑھے لکھے نے ایک بار مجھے بھی ٹوکا تھا۔مگر مینار پاکستان کہنے پر لوگ مجھے بار بار ٹوکتے ہیں۔اللہ معاف کرے۔جی یادگار تو سر جی۔۔آپ سمجھ گئے نا۔۔''

دونوں نے اس کی بات سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔۔۔۔ ''ٹھیک کہتے ہو۔'' نوازش نے رکشے سے اتر کر دس کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اس نے نازاں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''باجی یہ کیا ہے۔؟'' چھیمے کے لہجے میں احتجاج اور سوال کا امتزاج تھا۔

نازاں نے نوازش کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سر جی۔ میرا بھائی ہے۔۔!!!''

''تو کیا بھائیوں کو پیسے نہیں دیتے؟'' نوازش نے حجت کی۔

نازاں نے جواباً چھیمے کے ہاتھ سے نوٹ لیکر نوازش کے ہاتھ پر دبا کر رکھتے ہوئے کہا'' رکشے میں نہیں دیا کرتے۔ گھر آکر دیا کرتے ہیں۔۔۔''

اس نے نوازش کے جواب کا انتظار کئے بغیر اسے کہا۔'' جاؤ چھیمے باجی ماں سے کہہ دینا کوئی فکر کی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ سر جی کا بتانا، ان کے ساتھ ذرا راوی پر جا رہی ہوں۔''

چھیما ''اچھا باجی'' کہہ کر اس سے اور نوازش سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

''یہ آج راوی کا خیال کیسے آگیا۔''

''بس یونہی۔۔۔ چلیں؟''

''چلو'' نوازش نے گزرتے ہوئے تانگے کو روکا۔

اور اس پر سوار ہو گیا۔ اور نازاں کا ہاتھ پکڑ کر اس کو بھی تانگے پر کھینچ لیا۔ اس کا نرم نرم ہاتھ اس کی ہتھیلی میں سما گیا۔ بیٹھنے کے بعد بھی غیر ارادی طور پر اس نے نازاں کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔

نازاں نے کہا۔'' سر جی آپ کی یادداشت کیسی ہے۔''

نوازش اس سوال کا سیاق وسباق نہ سمجھ سکا۔'' یہ یادداشت کی بات تمہارے ذہن میں کیسے آگئی''

نازاں نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔'' آپ کو بھولنے کی عادت ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ کہیں مجھے بھی نہ بھول جائیں۔''

نوازش کے چہرے پر گرہ بندھ گئی۔ ''تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''میں کہہ رہی ہوں کہ آپ کہیں مجھے بھول نہ جائیں بالکل ایسے ہی جیسے آپ میرا ہاتھ پکڑ کر چھوڑنا بھول گئے ہیں۔'' نازاں نے مسکراتے ہوئے نظروں سے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ نوازش کو ایکدم یاد آیا اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ نازاں کا ہاتھ اس کے ہاتھ کسمسایا۔'' اوہ ہ ہ ہ !! سوری !!'' اس نے نازاں کا ہاتھ چھوڑ دیا اور موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں تانگے کی سواری بہت پسند ہے۔''

''باؤ جی یہ شاہوں کی سواری ہے۔'' کوچوان نے پیچھے دیکھتے ہوئے دخل در معقولات دیا۔ نازاں

نے اسکی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سر کندھے پر ٹکاتے ہوئے مسکراتی آنکھوں سے نوازش کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ نے کیسے محسوس کیا۔''

نوازش نے کہا'' بھئی ظاہر ہے تم نے رکشے سے اتر کر تانگے پر بیٹھنا پسند کیا حالانکہ رکشے پہ بھی جایا جا سکتا تھا۔''

''مگر رکشے سے اترنے کیا ایک وجہ اور بھی تھی۔'' نازاں نے شوخ لہجے میں کہا

''وہ وجہ کیا تھی؟''۔نوازش نے پوچھا۔

''پھر بتاؤنگی۔۔۔۔'' اس نے کوچوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔نوازش سمجھ گیا کہ وہ کوچوان کے سامنے نہیں کہنا چاہتی۔'' ویسے مجھے تانگے کی کھلی سواری پسند ہے۔رکشے میں بیٹھ کر انسان اپنے تئیں قیدی سا محسوس کرتا ہے۔کیا خیال ہے؟''

''دراصل ہر انسان کی عادات اور پسندیدگیاں اس کی نفسیات اور سوچوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔''

''آپ تو فلسفہ لے بیٹھے''

''تانگے پہ بیٹھ کر فلسفیانہ گفتگو!! یہ بھی اپنے تئیں ایک دلچسپ واقعہ ہے۔۔ ہے نا''

نازاں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پنجابی میں کہا۔'' ایہہ تے فیر ہے!'' اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔اس کا یہ انداز نوازش کے دل کو مچلا گیا۔اسے 'کچی چی' سی آ گئی مگر وہ صرف پیار بھری نظر ڈال کر مسکرایا۔

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد اس نے کہا۔'نازاں پنجابی تمہارے منہ سے بہت اچھی لگتی ہے۔''

''حق بات ہے جی۔ ماں بولی ہے جسے ماں اچھی لگتی ہے اسے ماں کی بولی بھی اچھی لگتی ہے۔۔۔ ہیں جی۔۔۔ کیا خیال ہے آپ کا؟'' کوچوان نے پھر دخل در معقولات دیا مگر اس بار نوازش نے اس کی بات کو نظر انداز کرنے کے بجائے سراہا۔کوچوان کی حوصلہ افزائی ہوئی تو وہ براہ راست ان کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔'' باؤ جی آپ جیسی سواریاں کہیں مہینوں میں ملتی ہیں ورنہ اکثر جوڑے تو تانگے میں صرف پیار محبت کی باتیں کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں۔ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں باؤ جی کہ بس۔ان کا خیال ہوتا ہے کہ کوچوان تو بیوقوف اور ان پڑھ ہوتے ہیں انہیں کیا پتہ!! مگر باؤ جی ہمیں سب پتہ ہوتا ہے، کہ کون کیا ہے کون کس کا کیا لگتا ہے۔سارا دن وِن سونی سواریاں دیکھتے ہیں۔۔۔'' وہ دھیان سڑک پر دیئے نان سٹاپ بولے چلا جا رہا تھا اور نوازش اور نازاں دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اس کی سیدھی سیدھی باتوں پر لطف اندوز

ہو رہے تھے

۔''۔۔۔۔اب دیکھیں نا آپ لوگ تو ویسے نہیں ہیں۔صاف نظر آرہا ہے۔۔۔مجھے پتہ ہے!!''
اس نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے دعویٰ کیا۔دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔نوازش
نے اس کی گفتگو میں دلچسپی
لیتے ہوئے کہا۔''اچھا!ہم کیسے لوگ ہیں تمہیں پتہ ہے؟

''جی باؤ جی ، بالکل پتہ ہے۔۔آپ اپنی بیوی سے بہت سچا پیار کرتے ہیں اور آپ اسے بات
بات پر ڈانٹتے بھی نہیں اور آپ کی بیوی بھی آپ سے بہت پیار کرتی ہے احترام کرتی ہے آپ
کا۔۔''دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا نازاں شرما سی گئی۔اس کا رنگ سرخ ہو گیا۔''کتنی
دیر ہوئی آپ کی شادی کو۔ماشاءاللہ۔۔بچے۔۔۔؟''
نازاں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔'بس یہیں اتار دیں'' تانگہ بتی چوک پار
کر چکا تھا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔؟''نوازش نے اتر کر دس روپے دیئے۔تانگے والے نے پہلے تو انکار
کر دیا۔مگر نوازش کے اصرار پر پیسے لے کر دعائیں دیتا ہوا ہوا ہو گیا۔اور دونوں مسکرا کر راوی کے
پل کی طرف چل پڑے۔نازاں کی مسکراہٹ میں کھوکھلا پن سا تھا۔شاید اس پر کوچوان کی باتوں کا
اثر موجود تھا۔اس لئے وہ راوی کے پل پر چلتے ہوئے نیچے پانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔نوازش نے
ایک دو مرتبہ بات بھی کی تو اس نے نوازش کی طرف سرسری طور پر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔پل
کے درمیان جا کر پل کے جنگلے پر کہنیاں ٹکا کر راوی کی چھلوں کا نظارہ کرنے لگے۔نازں کی
خاموشی طویل ہوتی جا رہی تھی

''کیا بات ہے موڈ کچھ۔۔۔؟''نوازش نے سرگوشی کی۔
نازاں نے نمائشی ہنسی کے ساتھ کہا''ارے!نہیں۔۔اووہ!!!سوری سر جی سوری۔۔۔''وہ بے
خیالی میں تکلفانہ بول گئی تھی۔شاید اس کا جی چاہتا تھا کہ نوازش کے ساتھ اس کی گفتگو میں احترام
کے ساتھ ساتھ محبت کی چاشنی اور منفعل سی شوخی بھی ہونی چاہئے۔

''آؤ نیچے چلتے ہیں کشتی پر بیٹھتے ہیں۔کشتی کی سیر کی کبھی؟''
نازاں نے نفی میں سر ہلایا۔'کیوں۔ڈر لگتا ہے۔''
نازاں نے اب کے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''جی۔مگر آپ کے ساتھ ڈر نہیں لگے گا۔

---ہمہ یاراں دوزخ وہمہ یاراں بہشت۔''

نوازش کے اندر اس کی قربت کا احساس جاگا، وہ صرف یہی کہہ سکا۔ ''سچ!!''

جواباً نازاں نے بچوں کی طرح معصومیت سے سر ہلایا۔ ''لیکن ایک شرط!'' نازاں نے ایکدم پینترا بدلا۔ نوازش چلتے چلتے رک گیا۔ ''کیسی شرط؟'' اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

نازاں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ملاح میری مرضی کا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی اور نوازش نے غیر ارادی طور پر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر کہا ''you naughty girl''

نازاں ذرا جھینپ گئی اور نوازش بھی ذرا کھسیانہ سا ہوگیا۔ دونوں پل سے نیچے اتر کر لبِ دریا پر پہنچ گئے۔

''ایک شعر یاد آ گیا ہے۔'' نوازش نے کہا اور نازاں نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ ''ارشاد!'' نوازش نے کہا:

لب دریا کھڑے رہے دونوں
وہ بھی پیاسا تھا میں بھی پیاسا تھا

نازاں نے داد یا رائے دینے کے بجائے غور سے اس کی طرف دیکھا اور آگے کشتیوں کی طرف چل پڑی۔ کشتی میں سوار ہو کر وہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک ہی سوچ میں گم تھے۔ کہ یہ آج غیر ارادی طور پر کیا کیا اعمال سرزد ہو رہے ہیں اور اتفاقاً رونما ہونے والے واقعات ان کے تعلقات کو کس سمت لے جا رہے ہیں۔ کیا ہونے والا ہے۔ دراصل دونوں کے درمیان اپنی اپنی سطح پر حفظِ مراتب سدِ راہ تھے۔

''کامران کی بارہ دری پہ رکیں'' دریا سے بھی زیادہ گہرے سوچوں کے سمندر میں نازاں کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔ نوازش نے دھیمے سے لہجے میں کہا 'چلیں'۔ ملاح نے کشتی کامران کی بارہ دری کی طرف کھینا شروع کر دی۔۔۔۔۔۔۔

گھاٹ پر کشتی سے اتر کر وہ مغل شہزادے کامران کے نام سے منسوب باغ کہ جو صدیوں کے پھیر میں دریا برد ہو چکا ہے، کی بارہ دری پر پہنچ گئے۔ میو ہسپتال سے چل کر یہاں پہنچنے تک انہیں پہلی بار تخلیہ میسر آیا تھا۔

''تم آج چپ چپ ہو'' نوازش نے ٹہلتے ہوئے نازاں سے کہا جواباً نازاں نے بھی وہی سوال لوٹا دیا۔

"ہونہہ!! تو یہ بات ہے۔۔ہاں ناز اں میرا خیال ہے کہ ہم دونوں آج چپ چپ ہیں۔آؤ یہاں بیٹھ کر سوچیں۔"ہم کیوں چپ ہیں۔" یہ خاصا نفسیاتی سا مسئلہ ہے۔آؤ عقلیت کی بنیاد پر اس پہلو پر غور کریں۔"

نازاں نے بارہ دری کے شمال میں ایک دروازے کے درمیان فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"سر جی ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ہم کیوں ایک دوسرے کی طرف کھنچتے چلے جا رہے ہیں۔سر جی میری بات اور ہے۔۔۔مگر۔۔سر آپ!"

نوازش آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بڑی ہمت کر کے اس کے قریب بیٹھ گیا۔وہ پہلے بھی اس کے ساتھ بیٹھا کرتا

تھا مگر ایسی کیفیت پہلے کہاں ہوئی تھی۔وہ اس کے اور قریب ہو گیا اور قریب اور۔۔۔۔۔

اف یہ مہکی ہوئی زلفو ں کی گھٹا آوارہ
گر برس جائے تو ہو جائے فضا آوارہ
زلف یہ جس کو بھی چھو جائے گی جل جائے گا
میں تو انسان ہوں پتھر بھی پگھل جائے گا۔
مجھ سے نظریں نہ ملاؤ مجھے کچھ ہوتا ہے
تم مرے پاس نہ آؤ مجھے کچھ ہوتا ہے
ہو نہ جائے تیرے کی ہوا آوارہ
اف یہ مہکی ہوئی زلفوں کی گھٹا۔۔۔
جسم جلنے لگا برسات میں ایندھن کی طرح
سرخ رخسار ہیں تپتے ہوئے کندن کی طرح
درد بڑھنے لگا او! در د مٹانے والے
یہ تو کچھ سوچ مجھے ہوش میں لانے والے
ہو نہ جائے کہیں دھڑکن کی صدا آوارہ
یہ تو کچھ سوچ مجھے ہوش میں لانے والے
ہو نہ جائے کہیں دھڑکن کی صدا آوارہ

اور۔۔۔پھر! نازاں ایک دم اچھل کر دور جا کھڑی ہوئی جیسے کہ کوئی بجلی چھوگئی ہو۔"سر محبت کا لطف

جاتا رہے گا۔۔۔۔۔سر جی میرا آپ کا احترام کا رشتہ ہے، سلوک کا رشتہ ہے اور میرا آپ کا ۔۔۔پیار کا رشتہ ہے۔۔۔۔میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میں پہلے دن سے آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ آپ مجھے۔۔۔۔اس وقت تو آپ کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں آپ پر ڈورے ڈال سکتی تھی۔ ہم چھاتو اور ڈھاریوں کو اس کی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی یہ تو شاید ہمارے خون میں رچی بسی طاقت ہے۔ پیار کی محرومی کا گلہ یا اندیشہ آپ کی دنیا میں ہوتا ہوگا۔ ہمیں تو ہماری دنیا میں جو بھی اچھا لگتا ہے ہم چھین لیتے ہیں۔ مگر آپ نے سر جی مجھے پڑھایا میرے خیالات میں سنوار اور سنگھار آپ کی عنایات کا فیض ہے۔ مجھے محبت کا مفہوم آپ نے سمجھایا۔ آپ ہی نے تو بتایا کہ محبت پانے یا کھونے کا کھیل نہیں بلکہ دینے کا فعل ہے اپنی مرضی دوسرے کے ہاتھ میں دینا۔ اپنی خوشیوں کو اپنے محبوب کی خوشی سے وابستہ کر لینا۔ اپنے آپ کو فنا کرنا اسی کو کہتے ہیں۔۔ یہی کہا تھا آپ نے؟ مجھے یاد ہے آپ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ۔۔۔سر جی! آپ، کاش مجھے اس دلدل سے نکال کر لے گئے ہوتے۔ میں۔۔۔۔۔۔میں آپ کی دیانت کو اپنا پردہ بناتی، آپ کے آدرشوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتی۔ آپ۔۔۔آپ نے سر جی اپنی حالت نہیں دیکھی۔ آپ کی شخصیت کتنی بکھر گئی ہے۔ آپ کی آمد کی مہک آپ کی باتوں کی خوشبو، آپ کے چہرے کی وہ چمک جس میں مجھے زندگی لہراتی، مسکراتی اور دل لبھاتی ملتی تھی آج سر جی، کچھ نہیں ۔۔۔۔۔" وہ رو پڑی۔۔۔" سر جی، آپ بہت بدل گئے ہیں۔ میں آپ کو خوابوں میں دیکھا کرتی تھی۔ آپ اپنے اور میرے خوابوں سے اتنے مختلف،۔۔اتنے مختلف کیوں ہو گئے!!!" نوازش کچھ کہنے کو تھا کہ وہ اپنی سانسیں درست کرنے کے بعد پھر بولی۔" کاش سر جی کاش! مجھے ایک دفعہ کہتے، نازاں میرے ساتھ اس بازار سے اس پار میرے گھر میں چلوگی۔؟ آپ دیکھتے میں۔۔۔۔۔!!!"

۔۔۔اور نوازش، جیسے کسی میکش کا ایکدم نشہ ٹوٹ جائے، بدمزہ ہو کر اپنے آپ میں لوٹ آیا۔" تم ٹھیک کہتی ہو" اس نے خفیف لہجے میں کیا۔

نازاں نے کہا۔" نہیں سر یہ میں نہیں کہہ رہی کبھی آپ نے کہا تھا۔۔۔آپ نے کسی درویش عارف کا واقعہ سنایا تھا جس نے حج کے لئے سفر میں دریا کے کنارے ایک پیاسی بکری کی پانی کے لئے بے قراری اور پیاس بجھانے کے بعد پانی سے بیزاری کا مشاہدہ کے بعد سفر ترک کر کے ساری زندگی ہجر و فراق میں تڑپ تڑپ گزار دی تھی۔۔۔اس نے کرب نارسائی کو لطف نارسائی بنا

لیا تھا پیارے سر جی میں لطف نارسائی میں جینا چاہتی ہوں۔ میں نے پیارے اللہ جی سے دعا کی تھی۔ گھنگروؤں سے بچنے کی۔ آپ کی صحبت نے مجھے اسکی راہ دکھائی۔ آپ نے مجھے اتنا کچھ بلکہ سب کچھ دیا۔ آپ مجھ سے کچھ بھی مانگ سکتے ہیں۔ مگر وہ آپ کی مرضی ہوگی میری نہیں۔ میں اپنی مرضی آپ پر قربان کر دوں گی۔ کہ یہی محبت ہے۔۔۔ مگر۔۔ مگر سر جی یہ بات خلش بن کر میرے دل میں چبھی رہے گی کہ پیار کا مفہوم سمجھانے والا خود کیونکر اور کیسے پیار کے مفہوم سے نا آشنا ہے۔۔۔" اس کی آنکھوں میں سرخی شام کی سرخی کو شرما رہی تھی۔ اس کی آواز میں ارتعاش لہجہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا اس کی پلکوں کے کنارے نم آلود تھے۔" ۔۔ یہ اچھا نہیں ہوا سر جی ۔۔۔ یہ اچھا نہیں ہو رہا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔۔۔۔۔۔" نوازش اس کی تمام باتیں سنتا رہا مگر اس کے پاس نازں کی کسی بات کا جواب نہیں تھا۔

وہ خود کو چھوٹا چھوٹا سا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ایسا کیوں کیا۔ کیا محبت کا ماحصل ایک بوسہ ہے یا اس سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میں لوگوں کو سکھایا ہوا سبق خود کیوں بھولتا جا رہا ہوں۔ دوسرں کو کیوں بتانا پڑتا ہے کہ میں کون ہوں۔

جب وہ اپنا بھرم اور اعتبار لٹا کر تہی دامن اپنی گلی میں پہنچا تو دو سالہ ساجد گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ امی کلثوم کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے گھر میں داخل ہونے کے بجائے گلشن کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی وہ بیل پر ہاتھ رکھا ہی چاہتا تھا کہ کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے اسے اندر سے رابعہ کی آواز سنائی دی۔ کھڑکی کے آگے دھندلی جالی اور دبیز پردے کی وجہ سے اندر باہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ نوازش نے بیل سے ہاتھ ہٹا لیا" ۔۔۔۔ میرے میاں نے کبھی میری کسی ملنے والی کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی ۔۔" نوازش نے سوچا۔ عورتیں اپنے اپنے خاوند کو سراہ رہی ہیں۔ اور مسکرا کر واپس قدم اٹھایا مگر اس کے قدم گلشن دلی کی آواز سن کر اس کے قدم وہیں رک گئے۔" آپ برا مان گئیں، میں تو آپ کو console کر رہا تھا۔۔۔" رابعہ نے اس کی بات کاٹی۔" میں نے کب آپ سے کب کہا کہ میں۔۔۔"

"وہ کلثوم بتا رہی تھی کہ نوازش آپ کا خیال نہیں۔۔۔"

"اور آپ میرا خیال رکھنے کے لئے۔۔۔"

"رابعہ! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔۔۔"

"دیکھیں گلشن صاحب، عورت مرد کی چال دیکھ کر اس کی نیت بھانپ لیتی ہے۔۔ جب کلثوم گھر پر نہیں تھی تو آپ نے مجھے دروازے پر ہی کیوں نہیں بتایا۔ آپ نے مجھ سے جھوٹ بول کر اندر کیوں بلایا۔۔"

"دراصل رابعہ۔۔۔۔"!

"آپ پلیز میرا نام نہ لیں۔ میرے میاں آپ کی بیوی کو باجی کہہ کر بات کرتے ہیں۔ میں آپ کے کولیگ کی بیوی ہوں۔ آپ شاید ایسا کہنا پسند نہ کریں اس لئے آپ مسز نوازش۔۔۔۔" پہلے کی نسبت رابعہ کا لہجہ کچھ سخت تھا"۔۔۔۔ اور میں آپ کو صاف صاف بتائے دیتی ہوں۔ کہ اگر مجھے اپنے خاوند سے کوئی گلہ ہے تو اس کی وجہ بھی میرا اپنا ہی رویہ ہے، میرا ہی قصور ہے۔ اور مجھے کوئی آپ خاوند کی جوتی جیسا بھی نہیں لگتا۔۔۔" نوازش کی اس وقت ایک عجیب کیفیت تھی ایک غصے کی لہر اٹھتی اور پھر ایک سرور کی کیفیت اس کے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتی۔ چلتی گلی میں زیادہ دیر تک کسی کی کھڑکی کے سامنے کھڑا رہنا مناسب نہیں تھا۔ اس لئے وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد رابعہ آ گئی۔ اور خلاف معمول اسے گھر میں دیکھ کر خوشی سے بولی۔" آپ آج جلدی آ گئے۔ میں ذرا کلثوم کے۔۔۔" اس کے لہجے میں معذرت تھی۔ نوازش نے کہا۔" ارے کوئی بات ایسی نہیں۔ اچھا ہے تم مسز گلشن کے پاس چلی جاتی ہوں۔ ورنہ مجھ پر رہو تو گھر ہی میں بیٹھے بیٹھے سوکھ جاؤ گی۔"

رابعہ نے کہا۔" آپ سے مجھے ایک بات کرنی تھی۔"

"خیر ہے؟۔۔۔ کرو۔" نوازش نے اسے بڑے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ابھی ابھی بیتی ہوئی بیان کرے گی مگر اس نے کہا۔" کلثوم مری کی ہے۔" نوازش نے مسکرا کر کہا۔" جانتا ہوں۔۔۔ بلکہ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا خاوند میرا کلیگ ہے۔۔"

رابعہ کے چہرے پر ام کلثوم کے خاوند کا ذکر سن کر ایک ناگواری کا تاثر ابھر کر ڈوب گیا۔ جسے نوازش نے بھانپ لیا۔ وہ اسے بڑے پیار سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور دوسرا ہاتھ کی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔" کیا بات ہے۔ رابی۔؟"

رابعہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ کیونکہ پہلے کبھی نوازش نے اسے رابی کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ رابعہ کی آنکھوں میں مسرت سے آنسو آ گئے۔ اس نے قدم آگے بڑھا کر اپنا سر اس کے سینے

سے لگاتے ہوئے کہا۔" آپ مجھ رابی کہہ کر بلایا کریں۔۔۔مجھے اچھا لگتا ہے۔
نوازش نے بانہوں میں سمیٹ کر کہا۔" جو حکم۔۔سرکار سے ہم صرف تنخواہ لیتے ہیں۔نوکر تو ہم آپ کے ہیں۔"
"آپ؟" رابعہ نے معترض لہجے میں اسے یاددہانی کرائی۔
نوازش نے کہا۔" اوہ۔۔۔ہاں! آئی ایم سوری۔" تم م م" یہ کہہ کر اس رابعہ کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔ایک تسکین اور تلذذ کی لہر اس کے رگ و پے میں اتر گئی۔
نازاں کی قربت میں شاید اس نے کچھ زیادہ سرور و کیف اور رعنائی تھی مگر وہ اطمینان جو رابعہ کے قرب میں ملا تھا۔وہ نازاں کی واجب الاحترام اور بے لوث محبت میں بھی عنقا تھا۔اس کا احساس اسے آج ہوا تھا۔وہ نازاں کی محبت میں اسے بھولتا جا رہا ہے۔اسے یوں لگا جیسے نازاں کے ساتھ گزرا ہوا لمحہ لمحہ رابعہ سے لمحہ لمحہ دوری اور غفلت کا جرمانہ ہے۔
"نوازش، آپ بہت اچھے ہیں۔میں بہت بری ہوں۔۔۔۔۔پتہ نہیں کیوں، کیوں میں نے آپ کو اتنا تنگ کیا ہے۔"
"تمہارا اس میں کیا قصور!" نوازش نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔رابعہ نے نظریں اٹھا کر ایک ادائے دلربائی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" آپ کو پتہ ہے۔کلثوم آپا نے مجھے اپنے ابا جی سے تعویذ لا کر پلائے تھے۔۔۔ویسے میں ان باتوں پر believe نہیں کرتی۔اسی لئے وہ مجھے، جب میں اس کے گھر جاتی تھی تو مجھے بتائے بغیر کبھی چائے کبھی شربت میں ملا کر پلاتی رہتی تھی۔"
نوازش نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔"تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔"
"میں نے بھی یہی پوچھا تھا تو کہتی تھی کہ 'تمہارے چیخنے چلانے کی آواز روز میں سنتی تھی۔پھر میں نے جب مری گئی تو شاہ ابو سے کہا کہ کوئی تعویذ دیں۔' اس نے مجھے اس لئے نہیں بتایا کہ اس کا خیال تھا کہ میں شیعہ ہوں شاید ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔۔۔"
"اب رکھتی ہو؟" نوازش نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔رابعہ نے کچھ جواب نہ دیا۔۔"اچھا مجھے کب اور کس چیز میں گھول کر پلاتی رہی ہو؟" نوازش نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے مذاق میں پوچھا۔
رابعہ نے پوچھا۔"کیا"

''تعویذ!'' نواز ش نے کہا۔ رابعہ نے ایکدم اس سے الگ ہو کر اسے شکوہ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کو ایسی لگتی ہوں۔۔۔''

''تو کیا یہ بری بات ہے۔۔؟'' نواز ش نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

''جی بری بات ہے۔ خاوند سے پوچھے یا اسے بتائے بغیر کچھ بھی کرنا بری بات ہے۔'' رابعہ نے ایک وفادار بیوی کا منشور بیان کر دیا۔ نواز ش نے پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ رابعہ نے اس کے سینے پر گال ٹکا کر، سر جھکائے ہوئے پوری سپردگی کے ساتھ کہا۔ ''اب تو آپ مجھے اکیلے چھوڑ کر راتوں کو غائب نہیں رہا کریں گے۔ آپ کالج سے سیدھے گھر آیا کریں گے نا؟

نواز ش نے اثبات میں سر ہلا کر اسے بانہوں میں بھر لیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں فلاں نہیں مانتا، فلاں کو نہیں مانتا۔ سب ڈھکوسلے ہیں۔ جب مشکل آتی ہے تو یہ سارے اعتقادات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں ہم خود نمائی کے لئے، خود کو دوسروں سے ممتاز بتانے کے لئے کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے۔''

شادی کے بعد آج کی رات۔۔۔ پہلی رات تھی جب ان کے تن کے ساتھ ساتھ من بھی شانت تھے۔

☆☆☆☆☆

جل گیا سارا بدن ان موسموں کی دھوپ میں
ایک موسم روح کا ہے جس میں اب زندہ ہوں میں

وقت لمحوں کے زینے چڑھتا، روز وشب کو پھلانگتا ماہ وسال کے پار اتر گیا۔ نائل اور کیپٹن محسن کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی مگر نیلسن نے شاہ جی کے مشورے پر تا حال غور نہیں کیا تھا اور اگر کیا بھی تھا تو کسی فیصلے پر نہیں پہنچی تھی۔ نصر نے اسی شام نیلسن پر واضح کر دیا تھا کہ یہ خواہش یا مشورہ سراسر شاہ جی کا ہے اور وہ بھی اس سے نیلسن کی طرح ہی بے خبر تھا۔ اور اب بھی وہ آزادی سے اس معاملے پر غور کرے اس پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں۔ اور دو ماہ ہونے کو آئے تھے۔ دونوں نے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات ہی نہ کی تھی۔ البتہ نائل نے دو تین مرتبہ نیلسن کو یاد دہانی کروائی تھی مگر اس نے بات ٹال دی تھی۔ چنانچہ پھر نائل نے کبھی اس سے اس بارے میں بات ہی نہ کی تھی۔ وہ اپنی شوہالہ کی کھولی میں بی کے ساتھ رہتی تھی۔ ماہ قبل کرسٹی اور سوشیل سے مری مال پر اچانک مڈبھیڑ ہوئی تو پتہ چلا تھا کہ گذشتہ سال اس کی ممی کا انتقال ہو گیا۔ کرسٹی نے ممی کی موت کا ذمہ دار نیلسن کو ٹھیرایا تھا۔ کرسٹی کا کہنا تھا کہ اس (نیلسن) کے جانے کے بعد ممی کا دماغ چل بے چل ہو گیا تھا۔ ہر خوشی، غم میں نیلسن کو یاد کرتی تھی: خوشی کا موقع ہوتا تو کہتی، 'خوشی ادھوری ہے میری نیلی پتہ نہیں کہاں ہوگی اور غم میں بھی تمہیں یاد کرتے ہوئے کہتی، اچھا ہے نیلی یہاں نہیں ہے، وہ ہوتی تو اسے کتنا دکھ ہوتا۔'' اس نے دوٹوک فیصلہ دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''نیلی باجی ہم سب گھر والے تمہیں ممی کی موت کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ہم تم سے نفرت کرتے ہیں۔'' نیلسن نے جواب میں اسے کچھ نہ کہا تھا مگر اس دن سے نیلسن کے اندر ایک عجیب سا ملال اور پچھتاوا ٹھہر گیا تھا۔ کرسٹی کا یہ الزام۔۔ کہ ممی کی موت کی ذمہ دار وہ ہے۔۔۔ اس کا وہم بن گیا تھا۔ اب ہر فارغ وقت میں اسے یہی وہم دامنگیر رہتا۔

نائل کی ٹرانسفر سول ہسپتال مری میں ہو چکی تھی۔ وہ ہفتے عشرے میں ایک دو بار اس

سے ملنے آجاتی تھی۔نصر سے بھی سکول ہی میں ملاقات تھی اور گفتگو صرف سکول کے معاملات تک محدود تھی۔علاوہ ازیں نیلسن کا سارا وقت گھر ہی پر گزرتا کبھی کوئی لڑکی پڑھنے آجاتی کبھی کسی ہمسائی سے علیک سلیک ہو جاتی۔بعض اوقات بور ہوتی تو مال روڈ کا چکر لگا لیتی۔

ایک روز وہ مال روڈ پر سٹرگشت کرتے کرتے کتابوں کی دکان سے گزری تو شوکیس میں سجی ہوئی چند کتابوں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔وہ کتابوں کی دکان میں داخل ہوگئی-----

اب اس کا فارغ وقت کتب بینی میں گزرنے لگا۔اس کا مطالعہ کسی ایک صنف یا موضوع تک محدود نہ تھا۔بلکہ علم وادب، شاعری افسانہ۔۔اس نے تھوڑے ہی عرصے میں بڑے بڑے شعرا اور افسانہ نگاروں کو بھی پڑھ لیا تھا۔پھر بھی کبھی کبھار اپنی بہن کرسٹی کے الزام و دشنام امربیل کی طرح اس کے ضمیر کو اپنی جکڑ میں پکڑ لیتے۔تب وہ بی کو لے کر درباروں پر حاضریاں دیتی' چڑھاوے چڑھاتی۔اس نے اکثر مجاوروں کے کہنے پر منتیں مانیں' نیازیں بانٹیں' الغرض ہر طرح سے سر پٹکا' مگر بے سود۔پھر زندہ پیروں' روحانی پیشواؤں اور عاملوں کی باری آئی۔۔ہر کوئی یہی کہتا شادی کر لو یہ تنہائی کا وہم ہے' ادھورے پن کا کرب ہے یہ وہ بھی سمجھتی تھی مگر وہ تو بیماری کے علاج کے لئے دردر جاتی تھی۔

ایک مرتبہ اسے مری میں ایک بین الاقوامی مشاعرے کا دعوت نامہ ملا۔پہلے تو نیلسن کا خیال تھا کہ معذرت کر لے مگر دعوت نامے میں شعراء کی فہرست میں ان معروف پاکستانی شعراء میں پروین شاکر کا نام بھی سر فہرست تھا۔ان تمام کو وہ پڑھ چکی تھی۔چنانچہ اس نے ہامی بھرلی۔

مشاعرہ کی صدارت احمد ندیم قاسمی کر رہے تھے۔ان کے علاوہ لندن سے حضرت شاہ' نسیم اختر' قطر سے ممتاز راشد' متحدہ عرب امارات سے، شاہ زمان کوثر، یعقوب تصور' تسنیم عابدی اور شفیق سلیمی انڈیا سے افتخار امام اور بشیر بدر آئے ہوئے تھے۔مشاعرہ گاہ میں خواتین کے لئے الگ نشستیں مخصوص تھیں۔انہیں استقبالیہ والوں نے بڑی عزت کے ساتھ آگے شعراء کے قریب دو خالی نشستوں پر بٹھا دیا۔حلقہ اہل سخن کے بارے میں نیلسن کا یہ پہلا تاثر تھا جو کہ بڑا مثبت تھا۔ان کے بیٹھتے جو پاکستانی شاعر محبوب ظفر اپنا کلام سنا رہا تھا اس کا ایک شعر تنہا کے طرز احساس پر تازیانہ بن کر لگا۔شعر تھا

زمیں پہ بوتے رہو گے جو بیج نفرت کے

زمیں سے اگنے لگے گا اناج پتھر کا

مشاعرہ کی نظامت بھی اسی نوجوان شاعر کے ذمہ تھی۔ اپنے کلام کے بعد اس نے تقدیم وتاخیر کی رائج ترتیب کے مطابق شعراء وشاعرات کو دعوت سخن دینے کا سلسلہ آغاز کیا۔ نیلسن اپنے ساتھ ڈائری بھی لے گئی تھی۔ ان شعراء کا کلام سن کر ایک گونہ تسکین کا احساس ہو رہا تھا۔ بعض اشعار تو اسے یوں محسوس ہو رہے تھے جیسے کسی نے اس کی تشخیص یا تفتیش کر کے لکھے ہوں۔ خاص طور پر شاعرات کا طرز احساس بالکل اس کے جذبات وکیفیات کی عکاسی کر رہا تھا۔ اس نے پین نکال کر جو اشعار لکھے وہ یہ تھے

دل میں جو سوئی خواہشیں جاگیں تو جسم بھی
ساکت سمندروں پہ کھلا بادباں لگا
(کشور ناہید)

تو بدلتا ہے تو بیساختہ میری آنکھیں
میرے ہاتھوں کی لکیروں سے الجھ جاتی ہیں
(پروین شاکر)

وصالِ یار کی نرم و گداز رات بھی دے
بدن دیا ہے تو اس کے لوازمات بھی دے

بشیر بدر کا یہ شعر جوان کی پہچان بنا سب سے پہلے انہوں نے وہ پڑھا

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نا جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

تمام عمر مجھے ایک ہی سے روگ ملے
مرے فسانے کسی دائرے میں لکھے ہیں
(نسیم اختر)

تو نہیں تو زندگی میں اور کیا رہ جائے گا
دور تک تنہائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا
(افتخار امام)

رات گئے جب مشاعرہ ختم ہوا تو بے اختیار اس کے قدم سٹیج پر بیٹھی پروین شاکر کی طرف اٹھ گئے۔ اتنے میں پروین سٹیج سے نیچے اتر چکی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔

''آداب!'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور پروین نے پر تکلف مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور سر کی جنبش سے جواب دیا۔ اس نے ڈائری نکال کر آٹوگراف کے لئے آگے کر دی۔ پروین نے لکھا۔

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

یہ مشاعرے میں پڑھے گئے اشعار کا اثر تھا یا کہ پروین شاکر کی موجودگی کا احساس جس نے اس کے پورے وجود میں ایک ولولہ اور لہجے میں والہانہ پن پیدا کر دیا تھا۔ ڈائری واپس لے کر اس نے وفور اشتیاق سے کہ ''آپ سے ملاقات۔۔۔۔''

پروین نے اسے غور سے دیکھا اور اس کی بات کاٹتے ہوئے عجلت میں کہا ''پلیز آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیجئے' اس وقت بہت تھک گئی ہوں ... '' اور نیلسن نے فوراً اپنا کارڈ نکال کر پیش کر دیا اور پروین نے شکریہ کہہ کر کارڈ پرس میں رکھ لیا۔ یہ سب اس غیر ارادی طور پر سرزد ہوا کہ بعد میں نیلسن کو نائل کے سامنے سبکی سی محسوس ہوئی۔ اور جب نائل نے کہا ''مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے تم کالج کی لڑکی ہو۔'' نیلسن اس کو argue نہ کر سکی۔

اگلے دن جب وہ کلاس روم میں تھی۔ تو نصر نے آ کر اسے حیران کر دیا۔ your phone وہ کلاس میں کھڑا ہوا۔ اور نیلسن فون سننے کے لئے چلی گئی۔

''مس نیلسن!'' ادھر سے پوچھا گیا۔

''جی!''

''السلام علیکم میں پروین شاکر بول رہی ہوں۔''

''جی...... جی!'' نیلسن کے ہاتھ سے ریسور چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پروین اسے فون کرے گی۔

''جی ہاں جی السلام علیکم'' نیلسن اب نارمل ہو چکی تھی۔ اس نے پروین شاکر سے اپنا تعارف کروایا۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد ملاقات کا وقت طے ہوا اور فون بند ہو گیا۔

واپس کلاس روم میں داخل ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''پروین شاکر کا فون تھا'' ۔نیلسن کے لہجے میں

خوش کن حیرانی تھی۔
نصر نے کہا "مجھے بھی حیرانی ہے کہ اتنی بڑی شاعرہ اور اپنے پرستاروں کی اتنی care کرنے والی --- مجھے جب نائل نے بتایا تو میں نے تو میرا خیال تھا کہ شاید اس نے پیچھا چھڑانے کے لئے تمہارا وزیٹنگ کارڈ مانگا تھا۔"

پروین سے مسلسل ملاقاتوں نے اس کے اندر ادھورے پن کے احساس کو کسی قدر کم کر دیا تھا اور اپنے کرب دروں اور خارجی واقعیت کو پروین کی راہنمائی میں اس نے شعروں میں ڈھالا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے کتھارسس کے لئے ایک outlet مل گیا ہو۔ ادبی تقاریب میں شرکت سے اسے ایک گونہ تسکین ملنے لگی۔ مگر پھر ایک اسی دوران پروین شاکر کی ناگہاں حادثاتی موت کا سانحہ رونما ہو گیا۔ اس قلم قبیلے میں اس کی ایک ہی مونس اور غمخوار تھی اس کے چلے جانے کے بعد وہ پھر اپنی محروم و مجبور دنیا کی تنہائیوں میں لوٹ آئی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ

دو گھڑی بہلا گئی پرچھائیاں
پھر وہی ہم ہیں وہی تنہائیاں

اس نے پھر سے کتابوں سے دل لگالیا۔ ندیم، فیض، فراز، پروین شاکر، شہزاد احمد، عقیل روبی، خالد احمد،۔۔سب کے مطالعے میں، سب کے اشعار میں اسے اپنی ہی زندگی کی جھلک ملتی۔ اور وہ پریشان ہو جاتی۔ درد کچھ اور بھی بڑھ جاتا۔ اس کے غموں کو زبان مل جاتی۔ یہ صورت حال اس کے لئے دل لبھانے کے بجائے دل دکھانے کا ذریعہ بن گئی تھی۔ چنانچہ اس نے اب شاعری کا مطالعہ ترک کر کے پھر مذہب و تصوف کی کتب کی طرف رجوع کیا۔ مگر یہ کتابیں اسے کسی اور دنیا کی طرف لے جا رہی تھیں۔ جہاں آسودگی تھی۔ اس کی زندگی کے نشیب و فراز اور ہونیوں اور انہونیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی بلکہ یہ مطالعہ زندگی کی اعلیٰ و ارفع اقدار کی پرورش اور پرستش کی تعلیم دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس دنیا کے معمولات سے کٹنے لگی تھی۔۔ جسے وہ ترک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اسلام کی ابتدائی تعلیمات میں پڑھا تھا کہ۔۔۔ شریعت کی شدت سے پابندی، اسلام کو یہودیت کی طرف لے جاتی ہے۔ جبکہ طریقت کی متجاوز پابندی اسلام کو عیسائیت کی طرف لے جاتی ہے۔ دراصل اسلام توازن ہے تجاوز نہیں۔ اسلام میں جدید ترین قرینۂ زندگی ہے۔ جس میں قرآن، حدیث اور فقہ کے ساتھ اجتہاد اور اجماع امہ کا راستہ کھلا ہے۔ اس لئے وہ

اس دنیا سے الگ تھلگ ہو کر جینے کو زندگی سے غداری کے مترادف سمجھتی تھی۔ اس لئے مذہب و تصوف کا مطالعہ بھی اس کے لئے کوئی اطمینان کی نوید نہ لا سکا۔ چنانچہ اس نے ایک دن موقع ملتے ہی شاہ جی کے ہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس سے پہلے بھی متعدد مرتبہ اس کا جی چاہا تھا کہ ان سے ون ٹو ون ملے۔ اس کے لئے وہ موڈ اور موقعے کا انتظار کر رہی تھی۔۔ وہ اپنے اندر سے پیدا ہونے والے تحریک کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اب جو اسے تحریک ہوئی تو وہ ایک شام سیدھی شاہ جی کے ہاں جا پہنچی۔

جاتے ہی شاہ جی سے اس نے اپنا سارا معاملہ بیان کر دیا۔ فرمایا۔ ''ترک کر دو مطالعہ ،مت پڑھو وہ کتابیں، جنہیں پڑھنے کی تمہاری بساط نہیں۔ مت کھاؤ وہ وٹامن جنہیں برداشت کرنے کی تمہارے جسم میں استطاعت نہیں۔ سعدیؒ شیراز نے کہا ہے۔ دریا میں منافع بہت ہے مگر خطرہ بھی ہے۔ کنارے پر سلامتی ہے خطرہ نہیں۔ سلامتی کا مشورہ ہے۔ کنارے پر رہو۔ ایک مغربی حکیم نے یہی بات یوں کی ہے۔ اگر سکون چاہتے ہو تو عقیدہ اختیار کرو۔ اگر سچائی کی تلاش ہے تو تحقیق کرو۔۔۔'' شاہ جی نے توقف کیا اور نیلسن کی جانب دیکھا جو بڑے انہماک سے انہیں سن رہی تھی۔ وہ چپ ہوئے تو نیلسن نے کہا۔ ''شاہ جی! میں کیا کروں''

''نیلی بیٹا! تم پہلے اپنی ترجیح کا تعین کر لو ''

''ترجیح؟۔۔۔ میں نہیں سمجھی شاہ جی ترجیح سے آپ کا کیا مطلب ہے۔؟''

''بیٹا تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے۔''

''مجھے کیا پتہ؟ مجھے کیا پتہ۔ زندگی کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ میں تو سیدھی سادی زندگی گزار رہی تھی۔۔۔۔۔''

''میں کب جانتی تھی کہ زندگی مجھے کہاں کہاں لئے پھرے گی۔۔ مجھے کچھ نہیں پتہ شاہ جی میں کون ہوں۔ کیا چاہتی ہوں۔''

''تو پھر بھی پریشانی ہے۔۔ پھر تو پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ یقیناً کچھ ہے۔ کچھ ہے۔''

''شاہ جی ۔۔۔۔۔ کیا ہے کیا ہے شاہ جی۔۔۔'' وہ الجھ گئی۔ شاہ جی کے سامنے وہ پہلی مرتبہ روئی۔ دیر تک روتی رہی۔

''ادھورے لوگوں کی ہر چیز ادھوری ہوتی ہے۔ تمہاری زندگی بھی اسی ادھورے پن سے عبارت ہے۔ ہر سفر ادھورا ہے

دیکھو بیٹا!! اس دنیا میں سب کچھ ادھورا ہے......'' شاہ جی نے چند لمحے یوں توقف کیا جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں پھر ان کے سینے سے اٹھنے والی لمبی ہووو! نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے چہرے پر مسرور مسکراہٹ اور کمرے کی فضا میں پراسرار خاموشی پھیل گئی انہوں نے آنکھیں کھول کر ہونٹوں کو جنبش دی

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید!
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

''ہاہ! سب کچھ ادھورا ہے' سب ادھورا!!! بس وہی ایک پورا ہے۔'' یہ کہہ کر شاہ جی نے چھت کی طرف دیکھا اور آفاقی لہجے میں کہا ''واہ او پوریا چنگا بنایا ای ساہنوں کھڈ وناں......''

کچھ دیر کے لئے کمرے میں خاموشی رہی' اتنی خاموشی کہ باہر دور مری کو ہالہ روڈ پر چلنے والی ٹریفک کی دھیمی دھیمی آواز بند کھڑکیوں سے رس رس کر اندر کمرے میں بیٹھے اس کی سماعتوں پر ہلکی ہلکی دستک دے رہی تھی۔

''جی بیٹا!'' شاہ صاحب نے تنہا کو مخاطب کیا ''حکم!''

نیلسن نے نظریں اوپر اٹھائیں مگر چپ چاپ پھر نیچے کرلیں۔

''جی، حکم!! کوئی بات کرو......!''

''کیا بات کروں آپ......''

''ہاں ہاں بولو!'' شاہ جی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور نیلسن نے کرتی سے ملنے کے پس منظر، پیش منظر اور اپنے ضمیر کی خلش سے انہیں آگاہ کیا۔ شاہ جی اس دوران سر جھکائے بیٹھے رہے۔

''یہ آخری مصیبت تھی ختم ہوگئی آزمائش کے دن پورے ہوئے۔ جاؤ! شکر کرو۔ اور ہاں کثرت سے الحمدللہ اور استغفراللہ کا ورد کیا کرو۔ گھبرانا نہیں۔ آزمائشیں تکالیف اور مشکلات پیغمبروں اور ولیوں پر بھی آئی ہیں۔ مشکلات کا راستہ کامیابیوں کا راستہ ہے سچ کا راستہ ہے یاد رکھو! کڑوی دوا کا کوئی side effet نہیں ہوتا۔ سوائے اس کی بدذائقگی کے۔ جبکہ میٹھی دوا کے کئی دیگر نقصانات ہوسکتے ہیں۔ شکر کرو۔ شکر کرو!''

''وہ تو میں کرتی ہوں مگر......''

''مگر؟'' شاہ جی نے اسے ٹوکا ''اس کا مطلب ہے کہ نہیں کرتی ہو۔''

"جی؟" نیلسن نے سوالیہ نظروں سے شاہ جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
شاہ جی نے مسکرا کر کہا" ہاں بیٹا جب گفتگو میں اگر مگر آ جائے تو اس کا مطلب تشکیک و تشریط ہے۔ ایمان میں تشکیک نہیں تیقن و تسلیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت انسان کے ساتھ غیر مشروط ہے۔ وہ کل عالم کے لئے خالق و رازق ہے کوئی اس کی مرضی پر چلے نہ چلے اس کی عطا غیر مشروط ہے۔ اس کا کرم انسان سے غیر مشروط محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ غیر مشروط!!"
"جاؤ! اسے مانو۔ تمام مسائل حل ہو جائیں گے' تم صاف/نیک نیت ہو مگر ضد چھوڑ دو' شانت ہو جاؤ گی۔ ضد' ہٹ دھرم سے وابستہ ہے ایمان کی دشمن ہے۔ جہاں تسلیم ہو وہاں ضد نہیں ہوتی۔ ضد چھوڑ دو' تمہاری راہ کی ہر رکاوٹ ضد ہے۔"
ضد کی تکرار سن کر تہانے پوچھا۔
"ضد! میں سمجھی نہیں کونسی ضد۔" اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "مجھے کب موقع ملا ہے ضد کرنے کا۔ میری ضد پوری کرنے والا تھا ہی کون جس برتے پر میں ضد کرتی۔ بچپن یاد نہیں' نوجوانی میں دوسروں کی ضدیں پوری کرتی رہی' رشتوں کے تقاضے' فرض سمجھ کر نبھائے۔ آپ کونسی ضد کی بات کر رہے ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔"
نیلسن کے لہجے میں ذرا تیزی آتی جا رہی تھی۔ شاہ جی نے کہا" آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے جاؤ' اب تم جاؤ' سوچو' غور کرو' پھر آنا۔" اور وہ اٹھ کر چلی آئی۔ مگر شاہ صاحب کے پاس آنے سے پہلے وہ اتنی مضطرب' بے چین اور بے سکون نہیں تھی جتنی کہ ان کی صحبت میں بیٹھ کر ان کی باتیں سن کر ہوئی۔

رات بھر کروٹیں اس کا بدن کاٹتی رہیں اور سوچیں اس کے دماغ میں سوئیاں بن کر چبھتی رہیں۔ جب فجر کی اذان ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ مگر ضدی ہونے کا جو الزام وہ سر لے کر شاہ جی کے ہاں سے لوٹی تھی وہ عقدہ وا ہونے کو نہیں آتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے جملہ امور و عوامل پر غور کیا۔ مگر ضد کا عنصر کہیں بھی سد راہ نہ تھا۔ تو پھر شاہ جی نے اسے ضدی کیوں کہا اسے اس بارے میں تامل تھا مگر اس کے باوجود شاہ جی کی بات کو بے جا اور بے معنی نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس لئے اس کا دل کہتا تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی' کچھ نہ کچھ ہے جو اس کی پریشانیوں' مایوسیوں اور محرومیوں کا باعث بنا ہے۔ بہر حال کوئی روز تک یہ الزام' دشنام بن کر اس کے احساس کو کچوکے لگاتا رہا۔ شام کی اداس فرصتوں میں جب وہ سوچتی تو اسے یوں لگتا

تھا کہ "ضد" ایک عقدہ ہے اور اسی عقدہ کشائی میں اس کی راحت و تسکین کا سامان پنہاں ہے۔

اپنے کمرے میں چارپائی پر سوچتی رہی۔ اپنے بارے میں ممی کے بارے میں۔ نوازش کے بارے میں۔ 'نجانے کہاں ہوگا، کیسا ہوگا، کس حال میں ہوگا۔۔۔ اچھا ہی ہوگا' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ 'اچھا، نوازش! خوش رہو' اس نے خودکلامی کی۔

زندگی کا بہتا دریا اپنی گزرگاہ خود تلاش کر لیتا ہے۔ چنانچہ کتھارسس کے لئے اس نے اپنی ڈائری کھولی اور اس کا قلم کاغذ کے سینے پر چلنے لگا۔۔۔

'۔۔ بچپن میں مجھے پتلی تماشہ بڑا پسند تھا بلکہ کئی دفعہ وہ گھر سے آٹا یا پیسے چوری کر کے محلے میں پتلی کا تماشا دکھانے والے کو صرف اس لالچ پر دے دیتی کہ ایک دفعہ تماشا ختم ہونے کے بعد وہ دوبارہ تماشہ دکھائے گا۔ پتلیاں نچانے والا پتلی چاچا میرے خیال میں دنیا کا ذہین ترین انسان تھا۔ کیونکہ وہ جس مہارت سے پتلیاں نچاتا تھا وہ ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ "واقعی پتلیاں نچانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔۔۔ مجھے کئی بار محسوس ہوا جیسے میں بھی ایک پتلی ہوں۔۔'

وہ کافی دیر تک گزرے حالات کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر اس کا قلم تیز تیز چلنے لگا۔

'۔۔۔او ماں'۔۔۔۔ تیرے شبد۔۔۔ تیر بن کر میری روح میں اتر رہے ہیں۔۔۔ تمہاری موت نے مجھے کی ملال کی دیوار میں چن دیا ہے۔۔۔۔۔ جس کی اینٹیں لحہ لحہ میرے بدن کا ریشہ ریشہ چبا چبا کر طاقتور توانا ہوتی جا رہی ہیں۔۔۔ رات کی سلگتی سیج پر کروٹیں میری چٹکیاں لیتی ہیں۔۔۔۔۔۔ بستر کی سلوٹیں سسکیاں لیتی ہیں۔۔۔ کہتے ہیں یہ سب جوانی کے تقاضے ہیں۔۔۔۔۔۔ فطرت ہے' جبلت ہے' سرشت ہے۔۔۔ انسان اگر فطرت' جبلت اور سرشت کے آگے بے بس ہے تو گناہ و ثواب' جزا و سزا کا تصور کیا معنی رکھتا ہے۔۔۔۔۔ کیا معنی رکھتا ہے یہ ۔۔۔۔ کیا معنی رکھتا ہے۔۔' اس کے ہونٹ اور ہاتھ کپکپانے لگے۔ '۔۔۔ کیا معنی رکھتا ہے؟۔۔۔' وہ چیخی

"کیا معنی رکھتا ہے" وہ اور زور سے چیخی قلم کا نب ڈائری کے صفحے پر چبھ کر ٹوٹ گیا۔ "کیا معنی رکھتا ہے؟"

اس کے الفاظ آنسوؤں کی روانی میں تحلیل ہونے لگے۔ اور پھر اس کے آنسو بھی ختم ہو گئے۔۔۔ اس نے حیران اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے آئینے کی طرف دیکھا اپنے چہرے کا کرب اور

ویرانی دیکھ کر یکا یک اس پر وحشت طاری ہوگئی۔ اس نے ڈائری اٹھا کر آئینے پر دے ماری اور توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ کمرے کی ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی یہاں تک کہ اس کا وجود بھی اس توڑ پھوڑ کے عمل سے محفوظ نہ رہا۔ اس نے پوری قوت سے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اپنے بالوں میں گاڑ کر دانت پیسنا شروع کر دیئے۔ اس کے منہ سے عجیب وغریب مہمل آوازیں نکل کر کمرے کو پُر آسیب بنا رہی تھیں۔ ا تیح تیخ کی آواز سن کر بی ہڑ بڑا کر اٹھی اور آواز کے تعاقب میں جب نیلسن کے کمرے میں پہنچی تو چند لمحوں کے لئے پتھرا گئی۔ مگر جلد ہی خود کو سنبھال کر نیلسن کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھی۔ کھینچا تانی میں اس کی بوڑھی ہڈیاں چیخ رہی تھیں مگر اس نے قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے نصر کو ساری صورت حال سے مطلع کیا۔

بی ہسپتال میں رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی۔ سورۂ جن اور چاروں قل پڑھ کر پھونکتی رہی۔ نیلسن کے سائیکو میڈیکل ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق اسے شیزوفرینیا (schizophrenia) کا دورہ پڑا تھا۔ مگر اب اس کی حالت خطرے سے باہر تھی اور tranquillizer دینے کے باعث گہری نیند میں تھی۔ نصر' نائل اور بی ڈاکٹر کو اپنی اپنی معلومات کے مطابق نیلسن کی شخصیت' طبیعت' رجحان اور واقعات کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اور وہ ان کی روشنی میں کیس ہسٹری تیار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کام سے فارغ ہوا تو نصر نے پوچھا ''ڈاکٹر کیا میں پوچھ......'' ڈاکٹر نے نصر کی بات کاٹتے ہوئے تیقن سے کہا ''شیزوفرینیا!!''

نصر کے تفصیل پوچھنے پر ڈاکٹر نے کہا۔ ''دراصل نفسیاتی اور ذہنی امراض کے بارے میں لوگ ابھی زیادہ نہیں جانتے۔ پڑھے لکھے لوگ بھی نفسیاتی اور ذہنی امراض کو tension اور depression سے آگے نہیں دیکھتے...... بہرحال!'' ڈاکٹر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا ''شیزوفرینیا کی وجوہ بے شمار ہو سکتی ہیں مگر عام طور پر ایام جوانی میں انسان کے اردگرد تضادات کا ہجوم ہوتا ہے۔ یعنی جوانی کے تقاضے' ضروریات اور family setup یا خاندانی بندشوں کے درمیان کشمکش عروج پر ہوتی ہے چنانچہ بعض دفعہ انسان ان میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ بعض اوقات monophobia بھی اس کا سبب بنتا ہے......''

نوازش کو تین ہفتوں کیلئے فائر فائٹنگ ورکشاپ میں شرکت کے لئے اسلام آباد جانا تھا

۔اس ورکشاپ کا اہتمام خاص طور پر اساتذہ کے لئے کیا گیا تھا۔ چنانچہ شرکت لازمی تھی۔ اتفاق سے کلثوم بھی اپنے بھائی کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں میکے گئی ہوئی تھی۔ رابعہ کو اس کے شاہ ابو سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کے ٹوٹتے گھر کو شاہ جی کے تعویذوں نے اور دعاؤں نے بچایا تھا۔ اس نے کلثوم کو اس نے پہلے ہی اپنی آمد کے امکان سے مطلع کر رکھا تھا۔ چنانچہ نوازش ٹریننگ سے ایک روز پہلے ہی لاہور سے روانہ ہو گیا۔

شاہ جی نے نوازش سے معانقے کے بعد رابعہ کو دلاسا دیا۔ اور کہا۔ ''ہمسائے ماں جائے۔۔۔تم تو میری بیٹی کی ہمسائی ہو تو تم میری بھی بیٹی ہی ہوئی نا۔۔۔۔۔۔اور آپ میرے داماد!''

''جی شکریہ!'' نوازش کے لہجے میں تشکر کا رنگ تھا۔

شاہ جی نے کہا۔ ''آپ جب چاہیں آئیں۔ ویک اینڈ سے پہلے بھی۔ سسرال بھی تو آدھا گھر ہوتا ہے!'' پھر انہوں نے کلثوم سے کہا۔ ''چھوی! کپتان صاحب کو بلاؤ، بتاؤ پروفیسر صاحب آئے ہیں لاہور سے۔''

تھوڑی دیر بعد کیپٹن محسن کمرے میں داخل ہوا۔ تعارف کے مراحل طے ہوئے۔ شاہ جی نے بتایا کہ اگلے چاند کی بیس کو اس کی شادی ہے۔ باتوں باتوں میں اسے پتہ چلا کہ اس کی شادی نائل کے ساتھ ہو رہی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ وہ نائل سے اپنی شناسائی کا ذکر کرے یا نہ کرے۔ شاہ جی بتا رہے کہ کس طرح انہوں نے نائل کو آمادہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ نائل پر مذہب تبدیل کرنے کی کوئی شرط نہیں لگائی گئی۔ نوازش کو معاً نیلسن یاد آ گئی۔ شرمندگی اور پچھتاوے کا احساس اس کے پورے وجود میں اتر گیا۔ کاش میں نے نیلسن پر یہی اعتماد کیا ہوتا۔ شاہ جی کی گفتگو میں وقفہ آیا تو نوازش نے محسن کو مخاطب کر کے کہا۔ ''کپتان صاحب! میری دعا ہے کہ آپ کی جوڑی سلامت رہے۔ نائل بہت اچھی لڑکی ہے۔'' محسن نے حیرانی سے اور شاہ جی نے مسکرا کر نوازش کی طرف دیکھا۔ نوازش نے کہا۔ ''حیرانی دور کر دوں!۔۔۔میں میو ہسپتال میں نائل کی وارڈ کا مریض رہا ہوں۔''

محسن کے چہرے کی حیرانی مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ نوازش نے بات جاری رکھی۔ ''۔۔۔شاہ جی اس نے میری بیماری کے دوران میری ایسی خدمت کی کہ سگی بہن یا شاید بیٹی بھی نہ کر سکتی ہو۔۔۔میرا تو روم روم اس کے لئے دعائیں کرتا ہے۔ میرے گردے کی لئے تبدیلی میں بھی اسی

کی تنگ ودو شامل رہی۔۔ اللہ تعالیٰ اس کو قدم قدم سکون اور راحت نصیب کرے۔۔۔۔" یہ نائل کا قصہ رابعہ کے لئے بھی انکشاف تھا۔ سب لوگ اسے سن رہے تھے۔ اس کا لہجہ اس وقت خاصا جذباتی تھا۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ اس کے دل میں نائل کے لئے کیسے جذبات ہیں۔ شاہ جی کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ انہوں نے نوازش کی گفتگو سن کر گمبھیر آواز میں کہا۔ "ماشاءاللہ!!"

شاہ جی سے اجازت لے کر جب وہ جانے لگا تو انہوں نے اسے یاد دہانی کروائی۔ "آپ ہمارے داماد ہیں۔ جب بھی اپنے سرکاری فرائض سے گلو خلاصی ہو بے تکلف آیئے، بے دھڑک آیئے۔" اس کے بعد انہوں نے محسن سے پوچھا۔ "کپتان صاحب آپ کب جاؤ گے؟" محسن نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "بس شاہ ابو پانچ دس منٹ بعد، میں۔۔۔۔"

"چلو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ نوازش علی صاحب کو مری چھوڑ دینا۔ یہ رش کا وقت ہے۔ وہاں سے سیٹ بآسانی مل جائے گی۔" شاہ جی نے جیسے ہی بات مکمل کی۔ محسن نہایت سعادتمندی کے ساتھ۔ "جی شاہ ابو!" کہہ کر اندر تیار ہونے کے لئے اندر چلا گیا۔

محسن کی پوسٹنگ ان دنوں کلڈنہ میں تھی۔ چنانچہ اس نے نوازش کو مری بس سٹینڈ پر ڈراپ کر دیا۔ اور خود کلڈنہ جانے کے لئے اس نے گاڑی واپس سنی بنک کی طرف موڑ دی۔ نوازش پہلے بس سٹاپ کی طرف بڑھا مگر پھر کچھ سوچ کر مال کی طرف چل پڑھا۔

ہسپتال میں آج نیلسن کا تیسرا دن تھا۔ ڈاکٹر نے ابھی اسے گھر لے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ چنانچہ نائل مسلسل اس کی تیمار داری میں لگی رہی۔ وہ اپنی شفٹ کی ڈیوٹی کرنے کے بعد بھی کچھ دیر کے لئے اپنے کمرے میں جاتی ورنہ وہ اس کے پاس ہی رہتی۔ ان تین دنوں میں اکثر و بیشتر نیلسن سوئی ہی رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ہفتہ بھر کے لئے مسکن دوائیں استعمال کرنے کی ہدایت کی تھی۔ نیلسن تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفے سے جاگتی اور پھر نیند میں چلی جاتی۔ مگر اب کے بار ایسا نہیں ہوا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ لیٹے لیٹے اس کی کمر دکھ رہی تھی۔ اس نے بستر سے اٹھ کر انگڑائی لی اور چندم قدم چلنے کی کوشش کی۔ آہستہ آہستہ اس کی نقاہت دور ہوتی گئی۔ تین دن کی مسلسل غنودگی کے بعد وہ آج قدرے پرسکون اور بحال تھی۔ ایک کونے میں مصلے پر بیٹھی بی نماز میں مستغرق تھی۔ "یہ پرانی وضع کے لوگ بھی کتنے مخلص ہوتے ہیں۔ اس نے معترفانہ خود کلامی کی۔ حالانکہ ہمارا اس سے کیا رشتہ؟"

وہ غیر ارادی طور پر ننگے پاؤں، ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر چلنے میں آسودگی محسوس کر رہی

تھی۔ یونہی دھیرے دھیرے چلتے چلتے وہ کمرے سے باہر نکلی برآمدہ بالکل سنسان بلکہ پرسکون تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نائل ڈیوٹی پر ہوگی۔ اور اسے یوں چل کر اس کے پاس آتے پا کر بہت خوش ہوگی۔ اسی خیال کے تحت وہ اس ڈیوٹی روم کی طرف چلدی۔ اس کا خیال درست تھا۔ ادھ کھلے در سے نائل کی آواز آرہی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ کس کے ساتھ۔۔۔؟ اگلے ہی لمحے اسے جواب مل گیا۔ اس کے کانوں سے ایک مردانہ آواز ٹکرائی۔ وہ آگے بڑھا ہی چاہتی تھی کہ آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔ یہ آواز۔۔ چہرہ نما آواز نوازش کی تھی۔ کتنے برس بیت گئے تھے۔ پلوں کے نیچے سے کتنا پانی بہ گیا تھا۔ کتنے سورج نکلے اور ڈوب چکے تھے۔ زندگی کس کس مقام سے گزر گئی تھی۔ مگر اس کی آواز، جادو جگا رہی تھی اس کی آواز کے سمندر میں سالوں کے فاصلے ڈوب گئے تھے۔ وہی آواز۔ نوازش نے ایک بار الحمرا کے میوزک روم میں ہارمونیم کے سامنے بیٹھے ہوئے کسی ترنگ میں گنگنایا تھا۔

نام بھول جائے گا چہرہ یہ بدل جائے گا
میری آواز ہی پہچان ہے گر یاد رہے

اس کی آواز نے اس کے چہرے کے نقوش واضح کر دیئے تھے۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی۔ وہ صبح شام ملا کرتے تھے۔ وہ اسی طرح، اسی لہجے میں بات کیا کرتا تھا۔ خاص طور پر جب وہ سنجیدہ ہوتا تو اس کی آواز میں ایک خوش کن دھیمی دھیمی سی گونج پیدا ہو جاتی تھی۔ گونج آج بھی تھی مگر اس میں کہیں کہیں شکستگی کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"۔۔۔۔ایک تجسس ہے جو مجھے بعض اوقات سوتے میں جگا دیتا ہے اور ہنستے میں رلا دیتا ہے۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا ابھی تک کہ وہ۔۔۔۔"

"نوازش صاحب، جسے آرام سے آم مل جائیں اس کے لئے پیڑوں کا گننا کارزیاں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔" نائل اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے سمجھانے والے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر نوازش کی آواز آئی۔ "نائل، آخر کیا ہے جو تم نے اس قدر خفیہ بنا رکھا ہے۔ کیوں نہیں بتاتی۔ کون ہے وہ"

نائل نے کہا۔ "بس نوازش صاحب سمجھ لیجئے کوئی ہے جو آپ سے پیار کرتا ہے۔ اور وہ آپ کے وجود کے اندر قرب کا ایک احساس بن کر آپ کے ساتھ ساتھ ہے۔"

"ایسا تو نیلسن کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔" نوازش نے کہا۔

''نیلسن کون؟'' نائل نے ہنستے ہوئے کہا۔

نوازش نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں نائل، نیلسن ــــــ میری زندگی کا پہلا سچ، معصومیت، میرا پہلا پیار، ــــــ بے طرح یاد آتی ہے۔ کبھی کبھار، کلیجہ نکال کر لے جاتی ہے، اس کی یاد! نیلسن ــــــ میری زندگی کا پہلا گناہ۔ میری زندگی کا پہلا ظلم، میرا پہلا پچھتاوا۔ ــــ اس نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ میں ہی کہتا رہا۔ میرے کان ابھی تک منتظر ہیں ان تمام باتوں کے جواب کے ــ جو میں نے کیں۔ اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ گلہ، شکوہ، شکایت ــ اور نہ ہی کوئی الزام۔ اس نے مجھے میرے لئے کتنی آسانی سے چھوڑ دیا۔ مگر:

غم کی بارش نے بھی تیرے نقش کو دھویا نہیں

تو نے مجھ کو کھو دیا میں نے تجھے کھویا نہیں

اس نے مجھے کھو دیا۔ مگر میں آج تک اسے کھو نہیں سکا۔ وہ آج بھی میری یادوں میں ہے۔ میں شادی شدہ زندگی گزار رہا ہوں، ایک وفا شعار بیوی کا شوہر، ایک بچے کا باپ ہوں۔ میری زندگی ایک پورے انسان کی زندگی ہے مگر میں پھر بھی ادھورا ہوں۔ میں ابھی تک اس کے حالہ خیال میں ہوں۔ ایک لاعلاج ملال میں ہوں۔ کاش وہ کچھ تو کہتی۔ میں آج بھی اسی انتظار کے کرب میں ہوں۔ نائل، میں آج بھی اس سے محبت کرتا ہوں ـــ''

نیلسن دروازے کے باہر کھڑی رہی۔ اسی اثنا میں نائل کمرے سے باہر نکلی اور نیلسن کو دیکھ کر ایکدم حیران۔ اوہ وہ، ہی کہہ پائی تھی کہ نیلسن نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور کچھ کہے بغیر واپس اپنے روم کی طرف چل دی۔ نائل بھی اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

وارڈ کے مریضوں کو دیکھ کر نائل اس کے کمرے میں آئی اور یہ کہہ کر چلی گئی کہ وہ نوازش کو رخصت کر کے آتی ہے۔ نیلسن کافی دنوں بعد چلی تھی اور پھر وہ تک کر ایک جگہ کھڑی بھی رہی تھی۔ اس لئے بھی۔ وہ کافی تھک گئی تھی۔ اس لئے بستر پر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی۔ جب وہ سو کر اٹھی تو اگلا دن چڑھ چکا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی

اسکی نظر صوفے پر پڑی۔ کلثوم، رابعہ کو دیکھ کر کروٹ لے کر اٹھی۔ ننھا ساجد دوسرے صوفے پر بیٹھا چاکلیٹ اور ٹافی کے پیکٹوں سے کھیل رہا تھا۔ اس نے پچکار کر بڑے پیار سے ساجد کو بلایا اور وہ بے چون و چرا اس کے پاس آ گیا۔ نیلسن نے خوشی سے اس کا ماتھا چوما۔ اسے یوں لگا جیسے بقول پروین شاکر ع 'روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی'

"آپ کب آئیں؟" ساجد کو اس نے اپنے پہلو میں بٹھالیا تھا اور وہ بھی اجنبیت کے باوجود بڑی اپنائیت سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے ہدایات دے رکھی تھیں کہ اس سے کسی بھی بارے میں خاص طور پر دورے کے متعلق کوئی کرید نہ کی جائے ام کلثوم نے رابعہ سے سرسری پہچان کروائی اور پھر ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ اس نے بتایا کہ رابعہ اس کی ہمسائی ہے اس کا میاں ان دنوں اسلام آباد میں فائر فائٹنگ کی تربیت کے سلسلے میں اسلام آباد آیا تھا۔ اس لئے میں اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ اب وہ جمعرات کی شام یہاں آجاتا ہے۔

رابعہ نے کہا "کلثوم آپا آپ کا اکثر تذکرہ کرتی ہیں۔ اس لئے مجھے تم سے ملنے کا شوق تھا۔ چنانچہ یہاں آئی تو۔۔۔"

ام کلثوم اٹھ کر نیلسن کے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی اور پیار سے نیلسن کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "شاہ ابو تو کہتے ہیں۔ جس نے چلتی پھرتی جنت دیکھنی ہے وہ نیلی کو دیکھ لے۔۔۔"

باتوں کے دوران ساجد اٹھ کر رابعہ کے ساتھ لپٹ کر اس سے کوئی فرمائش کرنے لگا۔

نیلسن نے پوچھا۔ "یہ کیا مانگ رہا ہے؟"

رابعہ نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا "زندگی اجیرن کر رکھی ہے اس کی فرمائشوں نے۔ ابھی اسے باہر لے کر گئی تھی چیونگ گم مانگ رہا تھا۔"

نیلسن نے ساجد کو اپنے پاس بلاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا "فرمائشیں زندگی اجیرن ہونے سے بچاتی ہیں ہے۔ اگر زندگی میں کوئی فرمائشیں کرنے والا، تنگ کرنے والا نہ ہو تو۔۔ زندگی عذاب بن جاتی ہے۔"

پھر اس نے ساجد کا گال تھپتھپا کر کہا "اچھے بچے چیونگ گم نہیں کھاتے۔"

"کھاتے ہیں!" ساجد نے معصومانہ سرکشی سے کہا۔

نیلسن نے بھی بچگانہ انداز میں کہا "نہیں کھاتے! چیونگ گم تو بکری کھاتی ہے۔" اس نے جگالی کر کے ساجد کا منہ چڑایا اور وہ "امی" کہہ کر رابعہ سے چمٹ گیا۔

جتنی دیر تک کلثوم اور رابعہ موجود رہیں۔ نیلسن کی توجہ ساجد ہی کی طرف مبذول رہی۔ اسے ساجد کی موجودگی میں ایک غیر مرئی سی تسکین ہو رہی تھی۔ جو اس کے جانے کے ساتھ ہی جاتی رہی۔ کلثوم نے جاتے ہوئے اسے کہا۔ "جلدی سے ٹھیک، تندرست ہو جاؤ۔"

نیلسن نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے رابعہ سے پوچھا۔ "آپ کب تک ہو؟"

"دس بارہ دن تو ہوں۔" رابعہ نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے میں آؤں گی۔ ساجد بھی یہیں ہوگا نا" نیلسن کے سوال کا دوسرا حصہ غیر ضروری تھا مگر نجانے کیوں وہ تسلی کرنا چاہتی تھی۔ ورنہ ظاہر ہے اتنا چھوٹا سا بچہ جہاں بھی جائے گا اپنے ماں باپ کے ساتھ ہی تو جائے گا۔ رابعہ کیونکہ سمجھتی تھی کہ اس وقت نیلسن کی دماغی حالت ٹھیک نہیں اسی لئے وہ شاید اس طرح کا غیر ضروری سوال کر رہی ہے۔ اس لئے اس نے نیلسن کی کسی بات پر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ جاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ساجد کو قریب بلا کر اس کا منہ چوما اور چند منٹ اسے پیار سے، ممتائیت سے دیکھتی رہی۔

نائل نے اس کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر رکھا تھا۔ وہ ہمہ وقت اس کا دل بہلاتی رہتی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ نیلسن کے ذہن پر جو دباؤ ہے اس کا نتیجہ نروس بریک ڈاؤن بھی ہو سکتا ہے اس کے خون کے فشار میں کمی بیشی کا یہ عمل دماغ کی شریان پھٹنے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اس لئے اس کو موجودہ ماحول اور صورت حال سے نکالنا اور ایسا منظر نامہ دینا اس کے علاج کا حصہ ہے جس میں وہ اپنے اردگرد کو بدلا بدلا پائے اور اس کا دھیان ایسی سوچوں سے ہٹ جائے جن کے باعث اس کی یہ حالت ہوئی ویسے ہفتے بھر میں اس رفتار سے recovery کو ڈاکٹر نے حوصلہ افزا قرار دیا تھا۔ ورنہ عام طور پر ایسے دورے کے اثرات سے باہر آنے کے لئے ہفتے مہینے لگ جاتے ہیں۔ نائل جب رات کھانا لے کر آئی تو اس نے نیلسن سے کہا۔" جلدی سے ہسپتال سے نکلو ہم نے مری وادی کی سیر کا پروگرام بنایا ہے۔۔ نیلسن نے کہا۔" نہیں! میں نے پہلے ہی آپ لوگوں کو اتنی۔۔"

"کیا بات کر رہی ہو نیلی! تمہارا احسان تو میری بہن میں ساری زندگی تمہارے لئے جی کر بھی نہیں اتار سکتی۔" نائل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کون سا احسان؟۔" نیلسن نے پوچھا۔" میں تو یہ جانتی ہوں کہ نائل اگر تم میرا ہاتھ نہ پکڑتی تو میں آج اس گوشۂ عافیت کے بجائے جانے کہاں بھٹک رہی ہوتی۔۔ گھر سے نکالی ہوئی عورت کی ہمارے معاشرے میں کیا وقعت ہے کیا اوقات ہے۔" نیلسن رو پڑی۔

نائل نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے کہا۔" میں بھی یہی ہوں کہ اگر تم یہاں نہ ہوتی تو میرا یہاں کیا ٹھکانہ تھا۔۔۔۔ سوچو!" اچانک نائل کو خیال آ گیا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے ساتھ کسی قسم کی ایسی سنجیدہ گفتگو کرنے سے منع کیا تھا جس کا تعلق اس کے ماضی اور محرومیوں

سے جڑتا ہے۔ ڈاکٹر نے تو اسے بالکل پھولوں کی طرح رکھنے کی تاکید کی ہے۔ اس نے فوراً رخ بدلا۔ "ارے ہاں! نائل میں نے تو تمہیں بک کر لیا ہے۔"

"کیا" نیلسن نے پوچھا۔ اس نے نائل کے بدلتے ہوئے انداز گفتگو پر حیرانی سے اسے دیکھا۔

"اپنے ہنی مون کیلئے۔ یہ بات مجھے کل نصر صاحب نے بتائی ہے کہ تم بہت اچھی فوٹو گرافر ہو، سکول کے سارے فنکشنز کی تصاویر تم ہی بناتی ہو۔ چنانچہ ہم ہنی مون کے لئے مختلف لوکیشنز کا انتخاب کرنے جا رہے ہیں۔"

"یہ ہنی مون ہے یا فلم کی شوٹنگ۔ جس کی لوکیشنز دیکھی جا رہی ہے۔"

"بہر حال تم جاؤ گی میرے ساتھ۔" نائل نے فیصلہ سنا دیا۔

"تم مجھ کو کیوں کباب میں ہڈی بنا کر گھسیٹنے کا پروگرام بنا رہی ہو۔" نیلسن کا لہجہ بھی نائل کی طرح تھا۔

نائل نے کہا۔ "ارے میں کیپٹن محسن کے ساتھ تھوڑا جا رہی ہوں۔ نصر صاحب کو راضی کیا ہے مگر ان کی شرط یہ ہے کہ تم بھی ساتھ چلو تو۔"

"مگر میری تصویر کشی میں ایسی کیا بات تم expect کر رہی ہو۔ تصویر تو کسی سے بھی کہہ کر کھنچوائی جا سکتی ہے۔" نیلسن نے پوچھا۔

نائل نے کہا۔ "یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ ہر منظر اور مقام پر کسی تیسرے کو ڈھونڈنا پڑے گا۔ منت کرنی پڑے گی۔ بھائی صاحب ہماری ایک تصویر تو بنا دیجئے۔ ایسے نہیں، ہاں ایسے، اوہو! ایک منٹ، اس جگہ سے کھینچئے۔ ہاں، کیمرہ سیدھا۔ ٹھیک ہے۔ او کے! جی بٹن دبا دیں۔۔۔۔" نائل فر فر منظر کشی کر رہی تھی۔ نیلسن اس کی باڈی لینگویج اور آواز کے زیر و بم پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور نائل اپنے اندر ہی اندر کھل اٹھی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ نیلسن کا مزاج ہلکا پھلکا رہے۔

نیلسن نے نوازش کے منہ سے جو اپنے بارے میں سنا اس کے نتیجے میں، کل تک زندگی سفر خسارے کا سفر لگتی تھی مگر آج۔۔۔ زندگی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اس کا بھی پتہ نہیں چلتا۔۔۔۔۔۔ پل پہلے کا چت، پٹ اور پٹ چت میں بدل جاتا ہے۔ نائل نے اس سے نوازش کے ساتھ ہونے والی کسی گفتگو کا ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ نیلسن نے سب باتیں سن لی تھیں۔ بہر حال نوازش کی باتیں سن کر اس کے اندر توانائی اور نئے سرے سے جینے کی امنگ پیدا ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کی پریم تپسیا پھلنا سے ہمکنار ہوئی۔ اس کا یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں نہیں گیا تھا۔ اب اس کی

کیفیت کچھ اس شعر سے مماثل تھی۔

جب ان سے حال سنا سب ملال بھول گئے
ملا جواب کچھ ایسا سوال بھول گئے

مزید ایک روز under observation رکھ کر ڈاکٹر نے اسے سفر پر لے جانے کی اجازت دیدی۔ ہفتہ بھر میں وہ کوہالہ دیول اوسیا موہڑہ بوربن سوراسی سیداں کوہالہ اور تھیا گلی کے گردونواح میں کالا باغ خانس پور ایوبیہ گھوم چکے تھے۔ بہانہ تو ہنی مون کے لئے لوکیشنز کی تلاش کا تھا مگر اس تبدیلی آب وہوا کا اس کی طبیعت پر خوشگوار اثر پڑا تھا۔ اب وہ پہلے سے کافی بہتر تھی۔ ایک روز نیلسن نے کاغان جانے کی فرمائش کردی۔ نصر نے بتایا کہ بلند وبالا کاغان کی وادی میں سردیوں کا موسم شروع ہو چکا ہے۔ چنانچہ سفر کے لئے گرم کپڑوں اور دیگر سفری ضروریات کا انتظام کرلیں۔ نائل اور نیلسن نے مل کر خوب گرم کپڑوں سے ایک سوٹ کیس بھرا اور ایک صبح وہ کاغان کی سیر کے لئے چل پڑے۔ ایبٹ آباد پہنچ کر نیلسن کو یہ شہر اتنا پسند آیا کہ اس نے ایک روز یہاں قیام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے شملہ ہوٹل میں قیام کیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ ہوٹل کے سبزہ زار میں بیٹھے رہے۔ بلند وبالا پہاڑ پر واقع اس ہوٹل سے شہر کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے نائل نے کہا "یوں لگتا ہے جیسے جگنوؤں کے دیس میں کوئی پری اتر آئی ہو۔" نیلسن نے اسے سر سے پاؤں تک تحسینی نظروں سے دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔ "وہ تو تم ہو" اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اگلی صبح وہ ایبٹ آباد سے روانہ ہو کر مانسہرہ اور گڑھی حبیب اللہ رکتے ہوئے بالاکوٹ پہنچ گئے۔ یہاں تھوڑی دیر رک کر انہوں نے دریائے کنہار کا نظارہ کیا۔ سردیوں کے موسم میں دریا کی لہریں شاید پتھروں سے سر ٹکراتے ٹکراتے تھک جاتی ہیں۔ یہی باعث تھا کہ پل کے نیچے سے پانی کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح خراماں خراماں گزر رہا تھا۔ تہبا کافی دیر تک اس نظارے میں محو رہی۔ اس دوران نائل نے نصر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "دوپہر تو یہیں ہوگئی ہے کاغان کب پہنچیں گے۔ میرا خیال ہے چلیں!!"

تھوڑی دور جا کر نصر نے جیپ کاغان روڈ سے دائیں طرف ایک چھوٹے سے بازار میں موڑتے ہوئے اور آہستہ سے کہا "شہدائے بالاکوٹ کے مزار پر فاتحہ پڑھتے چلیں۔" یہ سن کر نیلسن کو ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ اس نے تاریخ میں شہدائے بالاکوٹ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل

شہید کے بارے میں تفصیلاً پڑھ رکھا تھا۔ جو اپنوں کی غداری کی نذر ہو گئے تھے ورنہ شاید ہندوستان کی تاریخ اور پاکستان کا جغرافیہ کچھ اور ہوتا۔ مؤرخ نے سید صاحب کی تحریک کی ناکامی اور پٹھان سرداروں کی غداری کی ایک وجہ سید صاحب کی متشدد اسلام پسندی بھی بیان کی ہے۔

''کاش سید صاحب' اپنے شاہ جی کی طرح لبرل مسلم ہوتے'' اس کے دل میں حسرت بھرا خیال ابھرا۔ اسی دوران جیپ شہدا کے قبرستان کے پاس رکی۔ شہدائے بالاکوٹ کے مزاروں کی یہ ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اسے بہت افسوس ہوا۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ لوگ چند منٹ قبرستان میں خاموش کھڑے رہے۔ نصر کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی جو ناران روڈ پہنچنے تک برقرار رہی۔

کیوائی کے مقام تک سڑک کی حالت نسبتاً بہتر تھی مگر سڑک کے بائیں طرف ہزار وفٹ نیچے گہرائی میں بہتے ہوئے دریائے کنہار کو دیکھ کر نیلسن کچھ دیر کے لئے تو سن ہوگئی اور اس نے جیپ کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ سڑک پر بعض جگہ گلیشیئرز گرے ہوئے تھے جن پر درختوں کی ٹہنیاں گھاس پھوس اور پتھریلی مٹی ڈال کر اسے ٹریفک کے قابل بنایا گیا تھا جب گلیشیئر سے جیپ ہچکولے کھاتی گزرتی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ جاتا۔ راستے میں متعدد جگہ بکریوں کے ریوڑ بھی آمدورفت کی ناہمواری اور مشکلات کی وجہ تھے مگر نصر کسی مشاق ڈرائیور کی طرح بغیر بریک لگائے بکریوں کے ریوڑوں کے پاس سے گزر جاتا ایک دفعہ ایک بکری جیپ کے بالکل سامنے آ گئی مگر نصر نے بریک لگانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور غیر ارادی طور پر اس کا بایاں ہاتھ نصر کے کندھے پر جم گیا۔ چند لمحے بعد نصر نے کہا ''پیچھے دیکھو!''

نیلسن نے پیچھے دیکھا جیپ کے نیچے آنے والی بکری جیپ کے پیچھے سے صحیح سلامت نکل کر ریوڑ میں مل گئی تھی۔ نصر نے مسکراتے ہوئے کہا ''ان بکریوں کو جیپ کے نیچے سے گزرنے کی پریکٹس سی ہوگئی ہے۔''

نیلسن نے حیرانی سے نصر کی طرف دیکھا جواباً نصر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

یہ جیپ میں گونجنے والا پہلا قہقہہ تھا۔ نائل نے ہنستے ہوئے کہا '' سر آپ بھی کمال کرتے ہیں۔''

''بھئی جیپ پر جنازہ گاڑی کا گمان ہو رہا تھا'' نصر نے نیلسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اسکے بعد وہ گپ شپ کرتے کوائی تک پہنچ گئے۔ یہاں پر نصر کے ایک دوست کوہستان شاہ کا گھر تھا۔ وہ پانچ چھ برس پہلے ایک دفعہ اس کے والد کے انتقال پر اس کے ہاں آیا تھا۔ نصر نے سیر کا

ٹائم ٹیبل اس طرح ترتیب دیا تھا کہ رات کوائی میں اس کے ہاں رک کر شوگران دیکھیں اور اگلے روز ناران کے لئے سفر شروع کریں۔ نیلسن نائل اور خود کوہستان شاہ کو surprise دینے کی غرض سے اس نے نہ ہی کوہستان کو اپنی آمد کی اطلاع کی تھی اور نہ ہی ان دونوں کو یہاں رکنے کے بارے میں بتایا تھا۔ چنانچہ جب کوائی سے ناران روڈ چھوڑ کر اس نے دائیں طرف چڑھائی کی طرف جیپ موڑی تو نائل بول پڑی "وادیٔ ناران کا بورڈ تو ادھر لگا ہے آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

"چائے پینے۔" نصر نے مختصر سا جواب دیا۔

"یہاں آگے تو کوئی ہوٹل نظر نہیں آتا' ہوٹل تو آپ پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

"دیکھتے ہیں شاید کوئی اللہ کا بندہ مل جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ" نصر نے ایک دم جیپ سڑک کے کنارے روک کر کہا "نیچے اتر آئیے" اور دونوں کچھ کہے بغیر نصر کے ساتھ جیپ سے باہر نکل آئیں۔ نصر نے جیپ کے دروازے لاک کئے اور "آئیے!" کہہ کر سڑک سے اتر گیا۔

چند منٹ کے بعد وہ کوہستان شاہ کے گھر پہنچ گئے۔

"یہ کس کا گھر ہے" نیلسن نے پوچھا۔ نصر نے اسے جواب دینے کے بجائے دروازے پر دستک دے کر آواز دی "کوہستانا!"

دونوں ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اسی اثنا میں دروازہ کھول کر ایک ادھیڑ عمر کا مرد برآمد ہوا اور نصر کو دیکھتے ہی "او نصرا" کہہ کر اس کے گلے لگ گیا۔

چائے کوہستان خاں خود ہی بنا کر لایا۔ نہ ہی اس کی بیوی ان کے سامنے آئی اور نہ ہی نائل اور نیلسن کو اندر بلایا تھا۔ بلکہ وہ بھی بیٹھک میں اس کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب وہ چائے پی رہے تھے تو نصر نے پوچھا "بھابی کہاں ہے۔ مجھ سے تو پردہ ہے ہی کیا ان خواتین سے بھی پردہ کراتے ہو؟"

کوہستان کے چہرے پر پریشانی کے آثار ابھر آئے اور اس نے تفکرانہ لہجے میں آہستگی سے کہا "تمہارا بھابی....." مگر پھر شرما گیا اور نیلسن اور نائل سے مخاطب ہو کے بولا "میرا بہن آپ اندر جا کر خود ہی تھوڑا دیکھ لو۔" اس کے بعد نصر کی طرف متوجہ ہوا "بڑی پریشانی ہے یار' اس جنگل میں......"

تھوڑی دیر بعد نائل نے آ کر نصر کو بتایا کہ کوہستان شاہ کی بیوی کل رات سے دردِ زہ میں مبتلا ہے مگر زچگی......!

نصر نے پوچھا ''دایہ وغیرہ کوئی نہیں ہے یہاں؟''

''یہی تو پریشانی ہے انہیں۔ دایہ کسی مرگ پر اس کی ساس کے ہمراہ کاغان گئی ہوئی ہے۔'' نصر نے کوہستان سے کہا ''اگر یہ بات تھی تو تم نے انہیں جانے ہی کیوں دیا۔''

''بس یار یہ برادری کے معاملات ہوتے ہیں اگر نہ جائیں تو زندگی بھر کے طعنے بن جاتے ہیں۔ تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یا مائے جاتی یا میں جاتا مائے اکیلی جا نہیں سکتی تھی اس لئے دایہ کو ساتھ بھیج دیا۔ ویسے بھی دایہ نے چار پانچ روز بعد کی تاریخ بتائی تھی مگر...... یہ اللہ کے کام ہیں...... سخت پریشانی ہے یار پہلا موقع ہے سخت پریشانی ہے۔''

نصر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اللہ بہتر کرے گا۔ اچھا ہوا ہم تمہیں بن بتائے آ گئے۔''

''اچھا کیا ہوا یار ہم تمہارے آنے پر پورا خوش بھی نہیں ہو سکا۔ کھانا مانا......'' کوہستان شاہ نے ذرا ناراض لہجے میں کہا۔ نصر نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''نائل کوالیفائڈ نرس ہے وہ سنبھال لے گی۔''

نائل نے کوہستان شاہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بھائی گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے' آپ پریشان نہ ہوں میں سنبھال لیتی ہوں۔''

یہ سن کر کوہستان کے چہرے پر ایک دم خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ ''بہن تم فرشتہ اے فرشتہ!'' ہم تم لوگوں کے کھانے کا بندوبست کرتا ہے تم آرام کرو سفر کے تھکے ہوئے ہو۔'' یہ کہہ کر کوہستان نے اندر جا کر بیوی کو تسلی دی اور باہر نکل گیا۔

نائل کے مطابق پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد ماحول نارمل ہو گیا۔ اور وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

نیلسن نے پوچھا۔ ''یہاں سے شوگران کتنا دور ہے۔''

''یہی کوئی پندرہ بیس منٹ کا راستہ ہے۔'' نصر نے کہا۔

''کیسا علاقہ ہے۔'' اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''بہت خوبصورت' خاص طور پر چوٹیوں میں گھرا ہوا وسیع و عریض سرسبز میدان اور کونے پر بنا ہوا

ریسٹ ہاؤس' دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی۔"
نیلسن کے دل میں شوگران کے لئے تجسس پیدا ہو گیا اس نے پوچھا۔"کب جائیں گے۔"
"ارادہ تو آج ہی جانے کا تھا مگر لگتا ہے شاید واپسی پر ہی جا سکیں کیونکہ ہمیں صبح ناران اور سیف الملوک کے لئے نکل جانا چاہیے جبھی وقت پر پہنچ پائیں گے۔"
نائل نے نیلسن کی بیقراری اور اشتیاق دیکھتے ہوئے کہا"ویسے میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ نیلی کو لگے ہاتھ گھما ہی لائیں۔ابھی چار بجے ہیں گھنٹے میں واپس آ جائیں گے؟"
"نہیں! بہت مشکل ہے ہاتھ لگانے تو نہیں جانا ہے۔"
"نہ دیکھنے سے ہاتھ لگا کر لوٹ آنا بھی تو غنیمت ہے۔"
"مگر اچھا نہیں لگتا ادھر کوہستان پریشان ہے اور ہم......"
"میں ہوں نا' آپ ہو آئیں۔" نائل نے نصر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ آخر نصر بھی رضامند ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں جیپ میں سوار شوگران کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔نصر نے بتایا کہ یہ اس وادی کا سب سے اونچا مقام ہے جاتے ہوئے جتنا وقت لگتا ہے آتے ہوئے اس سے کم وقت لگے گا۔
"یہ کوہستان شاہ کون ہے؟" اس نے سنجیدگی کے سمندر میں مزاح کا پتھر پھینکا اور خود ہی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔"کیسے کیسے عجیب نام رکھتے ہیں یہ لوگ--کوہستان شاہ' پہاڑ پر بھی سید ہوتے ہیں پہلی دفعہ پتہ چلا ہے۔"
نصر نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ ونڈ سکرین کے باہر آسمان پر بجلی کی چمک اور ہلکی ہلکی بارش پر توجہ مرکوز کئے ہوئے تھا۔ابھی وہ شوگران سے ایک ڈیڑھ میل دور تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے شوگران آنے کی غلطی کی ہے کیونکہ بارش کے چند چھینٹے ونڈ اسکرین پر پڑ رہے تھے۔ پہاڑ کی بارش--موسم سرما میں--کسی بھی لمحے برف باری میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ادھر نیلسن ماحول اور وادی کے دلکش مناظر میں کھوئی کن من کن من بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اور جب وہ شوگران پہنچے تو بارش تیز ہو چکی تھی مگر اس کے ساتھ نیلسن کی حس جمال کی لو بھی تیز ہوتی جا رہی تھی جبکہ نصر برف باری کے اندیشے میں گھرا ہوا تھا۔اور پھر دیکھتے دیکھتے برف باری شروع ہو گئی۔نصر نے فکرمند لہجے میں کہا"میرا خیال ہے واپس چلیں۔"

''کیوں؟'' نیلسن نے بچوں کی طرح اس کی طرف دیکھا۔

''برف باری تیز بھی ہو سکتی ہے۔'' نصر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی بیخودی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا منظر اس نے پہلے کب دیکھا تھا وہ اس وقت سب کچھ بھول چکی تھی۔ کیا ہوا ہے، کیا ہو سکتا ہے۔

''تمہیں پہاڑ کے موسم کا اندازہ نہیں۔ محبوب کے مزاج اور پہاڑ کے موسم کا کوئی پتہ نہیں کب تبدیل ہو جائے۔'' اس نے شگفتہ انداز میں اسے واپسی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر ڈھاک کے وہی تین پات!

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے مگر برف باری رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ شوگران کی وادی میں ٹہلنے، برف سے کھیلنے، باتیں کرنے اور منظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد انہوں نے ریسٹ ہاؤس کے پاس ایک چھوٹے سے کیفے میں چائے پی۔ نصر ذہنی طور پر خود کو رات یہیں بسر کرنے کے لئے تیار کر چکا تھا۔ کیونکہ شدید برف باری میں رات کے وقت واپس جانا اور وہ بھی ڈھلوان کی طرف، خطرے سے خالی نہ تھا۔ خوش قسمتی سے چوکیدار کوہستان شاہ کے جاننے والا تھا اسے جب نصر نے بتایا تھا کہ وہ کوہستان کا مہمان ہے اور بیگم صاحبہ برف باری سے لطف اندوز ہو رہی ہیں اگر لوٹنا ممکن نہ ہو سکا تو وہ ان کے لئے شب بسری کا انتظام کر دے اور اتفاق سے اسی وقت اس کا بھائی خچر پر نیچے جا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے کوہستان کو پیغام بھی بھجوا دیا تھا۔ اس ویران موسم میں عام طور پر یہ ریسٹ ہاؤس خالی ہی رہتے ہیں۔ نئے نویلے جوڑے جو زندگی کی ابتدا کرتے ہیں وہی عام طور پر موسم کی پروا کئے بغیر ایسی جگہوں پر آتے ہیں کیونکہ ان کے لئے گرما، سرما، برسات۔ ہر موسم ہی پیار کا موسم ہوتا ہے۔

چائے پینے کے بعد جب بیرا برتن لے گیا تو نیلسن نے نصر سے کہا ''برف باری تو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی'' اس کے لہجے میں الجھن تھی۔ نصر نے کہا ''یہی تو میں نے کہا تھا۔''

''تو پھر برف باری ہی میں آہستہ آہستہ نکلیں۔''

''کہاں؟'' نصر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نائل انتظار کر رہی ہوگی۔ پریشان ہو رہی ہوگی۔''

''ہونے دو۔ اسی نے تو اس برف باری میں دھکیلا تھا۔'' نصر نے بے نیازی سے کہا۔ اس کے لہجے میں شرارت کا عنصر بھی شامل تھا۔

قدرت نے مرد کے مقابلے میں عورت کو نازکی، حجاب اور وہم کے اضافی اوصاف سے نوازا ہے۔ نازکی اور حجاب میں اس کا حسن اور کشش پوشیدہ ہے جبکہ وہم اس کی کمزوری ہے۔ اس کے خیال میں نصر ایک شریف النفس اور ہمدرد انسان تھا۔ مگر اس موسم میں اور اس ماحول میں اب وہم نے اس کے گرد اندیشوں کا جال بننا شروع کر دیا تھا۔ اس نے مشکوک -- کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ نصر نے کہا۔ ''اس برف باری میں لوٹنا خطرے سے خالی نہیں۔''

''اب کیا ہوگا؟'' نیلسن نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں روشن کمزور سے بلب
کی مدھم روشنی میں اس نے نیلسن کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے لہراتے سائے دیکھ لئے۔

''ریسٹ ہاؤس۔''

''کیا مطلب ہم رات..... '' نیلسن کے لہجے میں گھبراہٹ کا عنصر واضح ہو گیا۔

''اور کوئی راستہ نہیں۔'' نصر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہونے کے موڈ میں تھا۔ ''ابھی جب برف باری بند ہو گئی اور تیز ہوا چلنے لگی تو برآمدے میں قلفی جم جائے گی۔''

اعتماد انسان کی مجبوری ہے اسے جلد یا بدیر کسی پر اعتماد کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ نیلسن کو بھی دریں حالات اس پر اعتماد کرنا ہی پڑا۔ نصر نے ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کو جیپ سے دونوں کے بیگ لانے کے لئے چابی دے دی، چوکیدار نے بتایا کہ اس نے اوپر کونے والا کمرہ کھول دیا ہے۔ نصر نے نیلسن کو اوپر جانے کا اشارہ کیا اور خود ریسٹ ہاؤس
سے چند قدم کے فاصلے پر بنی ہوئی چھوٹی سی مسجد کی طرف بڑھ گیا جہاں سے تھوڑی دیر پہلے مغرب کی اذان کی صدا بلند ہوئی تھی۔

نیلسن نے اوپر جا کر کمرے میں داخل ہو کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں دو الگ الگ پلنگ بچھے ہوئے تھے ان کے درمیان آتش دان اور اس کے سامنے دو کرسیاں بڑے سلیقے سے آمنے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں اٹیچڈ باتھ روم تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ اسی اثنا میں چوکیدار بغیر دستک دیئے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور دونوں بیگ رکھ کر بولا ''ابھی ہم آگ جلائے گا پروا نہیں کرو۔'' اسے، چوکیدار کا اس طرح بغیر اجازت اندر آنا بہت برا لگا مگر اس وقت وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

بیگ سے رات کا لباس نکال کر وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ اس کا بیگ جیپ میں تھا مگر منہ دھونے کے لئے جب اس نے ٹونٹی کھول کر پانی میں ہاتھ ڈالا تو اس کا ہاتھ سن ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اس نے منہ ہاتھ دھونے کا ارادہ ترک کر دیا اور کپڑے بدل کر باہر نکل آئی۔ تھوڑی دیر بعد نصر بھی آ گیا۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ نصر بھی رات اسی کمرے میں ٹھہرے گا تو وہ ایک دفعہ پھر لرز گئی۔ جبکہ نصر نارمل تھا۔ اس نے غصے میں نصر سے کہا ''آپ زیادتی کر رہے ہیں۔''

اس نے پہلی مرتبہ نصر کے ساتھ اس لہجے میں بات کی تھی۔ ''میں تم سے اسی رویے کی توقع کر رہا تھا لیکن میں تمہارے اس رویے کا حقدار نہیں ہوں۔'' نصر کے لہجے میں دبا دبا سا گلہ تھا۔

''آپ اپنے لئے الگ کمرے کا بھی کہہ سکتے تھے۔'' نیلسن کو اپنے رویے پر ندامت ہوئی مگر اس نے صفائی پیش کی۔

''محترمہ یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ لندن یا پیرس نہیں کہ آزاد گھومتے پھرو۔ میں نے تو اسے رات یہاں بسر کرنے کے لئے کہا تھا اور پھر یہ کہ وہ کوہستان کا جاننے والا ہے تمہارا مطلب ہے کہ وہ لوگوں کو بتاتا پھرتا کہ کوہستان شاہ کا دوست کسی لڑکی کو لے کر گھومتا پھر رہا تھا۔ تم نہیں جانتی اس علاقے کے ماحول کو۔ اور پھر میں نے تو اس سے کچھ نہیں کہا۔ اس نے خود ہی فرض کر لیا کہ ہم دونوں......''

''مگر آپ اسے کہہ تو سکتے تھے کہ ہم دونوں......'' نیلسن نے روہانسے لہجے میں کہا۔ اور نصر نے الجھے ہوئے لہجے میں اسے ڈانٹتے ہوئے کہا ''تم ابھی تک سمجھی نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کیا کہتا میں اسے؟''

پھر نیلسن کسی خوفزدہ بچے کی طرح چپ ہو گئی۔

جب چوکیدار نے آتش دان میں آگ جلا دی تو کمرے میں نگھاس کی لہر نے فضا کو یکسر تبدیل کر دیا۔ باہر پھر بے آہٹ برف باری شروع تھی۔ نیلسن نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈال کر وقت شام کا تعین کیا۔

ساحل سمندر ہو یا دریا کا کنارا' پہاڑ کی چوٹی ہو یا کوئی اداس جزیرہ' شام کا تاثر ہر جگہ افسردہ اور رومان پرور ہوتا ہے۔ اور اگر ایسے میں کوئی دل کی دھڑکنیں سننے والا ساتھی موجود ہو تو یہ تاثر دوچند ہو جاتا ہے۔

دونوں اپنی اپنی جگہ چپ چسکیوں سے چائے پینے میں مصروف تھے۔ اسے نوازش کے تصور نے آن گھیرا' کاش وہ آج ہم نشین ہوتا۔ نصر اس سے کسی طور کم ہے! خیال وسوال کے بگولے اس کی سوچوں سے لپٹ گئے۔

پھر ایک دم وہ سوچوں کے بھنور سے نکلی اور بولی "نائل پریشان ہو رہی ہو گی۔"

نصر نے چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں بتایا نا چوکیدار کوہستان کا جاننے والا ہے جب تم برف باری سے لطف اندوز ہو رہی تھی اس وقت اس کا بھائی خچر پر کوائی جا رہا تھا میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کوہستان کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ اگر برف باری شدید ہو گئی تو ہم رات یہیں رک جائیں گے۔"

اب برف باری تھم چکی تھی اور آسمان سے بادل سرکتے سرکتے سامنے کے بلند و بالا پہاڑوں کے پیچھے استراحت کی غرض سے اتر گئے تھے۔ اب چودھویں کا چاند نیلے آسمان کے ماتھے پر جھومر کی طرح چمک رہا تھا۔ برف کے قرطاس پر خاموشیوں اور سکوت کا مضمون رقم تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ گم صم تھی مگر ہواؤں کا سفر جاری تھا۔ کھڑکی سے باہر کارگہ فطرت کے کرشموں نے ماحول پر کامنائی کیف کا جال بن رکھا تھا۔ وسیع و عریض میدان کے پرے پہاڑوں پر درخت مراقبے میں کھڑے جذب و کیف کے خزانے لٹا رہے تھے

مقام ذکر ہے پیمائش زمان و مکاں
مقام فکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ!

وہ سوچ رہی تھی کہ آسمان کی پہنائیوں اور زمین کی گہرائیوں میں نجانے کیا کچھ چھپا ہوا ہے کہ جس کا پرتو ہی اس قدر روح نواز ہے۔ کمرے میں خنکی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ جس کا احساس نصر کو آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے بھی ہو رہا تھا۔ مگر نیلسن کی روح اس خنکی سے بے نیاز وادی کی سندرتا سمیٹنے میں مصروف تھی۔

"مجھے خطرہ ہے کہیں تم نظارہ کرتے کرتے خود نظارہ بن کر فضا میں تحلیل نہ ہو جاؤ۔" اس نے اٹھ کر کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا "معافی چاہتا ہوں سردی--" اس نے بچوں کی طرح کانپ کر نامکمل فقرے کا مفہوم ادا کیا۔ نیلسن کسی خواب سے رفتہ رفتہ بیدار ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آتش دان کے سامنے بچھی کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ ابھی تک اس پر بیرونی ماحول کا سحر طاری تھا۔ اسی اثنا میں چوکیدار کھانا لے کر آ گیا۔ اور وہ دونوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

آدھی رات کا عمل تھا اس نے سر اٹھا کر نیلسن کی طرف دیکھا جو اس کے اندر جذبوں کی مار دھاڑ سے بے خبر اور بے نیاز نیند سے ہم آغوش تھی۔ ایک احساس نصر کو بتائے بغیر اس کے رگ وپے میں دوڑ گیا

آج رات
میرا دل چاہتا ہے
تو بھی میرے پاس آ
اور سوئیں ساتھ ساتھ

آتشدان میں آگ جلتی رہی' بلب کی دھیمی اور آگ کی تیز روشنی کی امتزاج نے ایک نئے رنگ کو جنم دے دیا تھا جو جبلی تقاضوں کی تکمیل کا داعی تھا اور اسے لذت جاوید سے آشنا کر رہا تھا۔
کروٹوں کی بہتات سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں پر عنابی رنگ کے ملمعے اس کی حس نظارہ کو تروتازہ کئے ہوئے تھے۔ وہ سونا چاہتا تھا مگر کیسے؟ کیسے سو سکتا تھا وہ جبکہ

دو بستر
ایک ہی کمرے
ایک ہی چھت کے سائے میں
ایک پہ بہتا نیند کا ساگر
ایک پہ بے خوابی کا صحرا

وہ بدستور اسکے جسم اور سلگتے گالوں پر نظر جمائے محو نظارہ رہا۔ نفسانی خواہشیں چیونٹیاں بن کر اس کے بدن پر رینگتی رہیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے نیلسن کے سانسوں کی مہک اس کے سانسوں میں رچ بس گئی ہو۔
قربتوں کا احساس کچھ اور بڑھ گیا مگر ان تمام تر کیفیات اور نفسانی خواہشات کے احساس کے باوجود مثبت سوچوں کا ایک خانہ کھلا رہ گیا تھا جس کے اندر بحث وتمحیص کے دفتر رواں تھے۔

اب کوئی پارۂ ابر آئے کہیں سایہ ہو
اے خداوند عظیم
باد تسکیں کہ نفس آگ بنا جاتا ہے

قطرۂ آب کہ جاں لب پہ چلی جاتی ہے

دماغ کو دل کی پاسبانی اسی لئے ودیعت کی گئی ہے کہ وہ دل سے اٹھنے والی خواہشات کی تطہیر کرے مگر جذبات جب دل کے ساتھ ساتھ دماغ پر بھی قابض ہو جاتے ہیں تو تطہیر کا یہ عمل رک جاتا ہے اور مثبت سوچوں کا پہیہ جام ہو جاتا ہے۔ اس لمحے انسان اخلاقی انحطاط کا شکار ہو کر اپنا وہ تشخص کھو دیتا ہے جو کہ اسے فرشتوں سے ارفع اور ممتاز کرتا ہے۔

ذہنی تشکیل و تعمیر میں لاشعور اہم رول ادا کرتا ہے کیونکہ لاشعور انسانی زندگی کے تین چوتھائی حصہ پر قدرت رکھتا ہے۔ لاشعور میں انسانی زندگی کے وقتاً فوقتاً پیش آنے والے غیر معمولی واقعات' کیفیات اور تجربات و تجزیات جمع رہتے ہیں جو کہ انسانی زندگی کی تزئین و ترتیب میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ پاکیزہ ماحول اور

تربیت صالحہ صاف ستھرے اور صحت مند خیالات کو جنم دیتے ہیں۔ جن کا پرتو انسان کی ساری زندگی پر رہتا ہے۔ ہر چند کہ عارضی طور پر یہ خیالات یا تربیت صالحہ کسی وقتی کیفیت سے پراگندہ ہو کر پس منظر میں چلی جاتی ہے مگر جب کوئی کٹھن مرحلہ پیش آتا ہے تو یہی تربیت اور اس کے زیر اثر پرورش پانے والے خیالات پیر کامل بن کر انسان کی راہنمائی کرتے ہیں اور ضبط نفس کا درس دیتے ہیں۔ اس نے آخری دفعہ اس کی طرف دیکھا وہ ذرا ہاتھ بڑھا کر اس کا دامن پکڑ سکتا تھا۔ وہ بغیر کوئی آہٹ پیدا کئے بستر سے اٹھا' اپنے کندھوں سے گرم چادر اتار کر فرش پر بچھائی اور وضو کر کے خدا کے حضور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

ان الصلوة تنها عن الفحشاء والمنكر والبغيه

نیلسن عقل و شعور اور اندیشہ ہائے شب تنہائی سے بے خطر و بے نیاز نیند سے ہم آغوش تھی۔ اس رات خدا نے نصر کو سجدے کی لذتوں کا ادراک بخشا۔ قیام و سجود کا عمل جاری رہا اور ساری رات نزول الطاف ہوتا رہا حتیٰ کہ بلالؓ کے وارث نے وقت کے چہرے سے رات کی سیاہ چادر کھینچنا شروع کر دی

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

جب نیلسن کی آنکھ کھلی اس وقت الصلوۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) کی منادی ہو رہی تھی۔ مگر نصر تو اس سے قبل ہی طویل سجدوں کے مزے لوٹ چکا تھا۔ رات-تنہائی-اورلڑکی۔ وہ اس ابتلاء سے کامیاب وکامران گزر گیا تھا۔ اس نے نیلسن پر ثابت کر دیا تھا کہ جو چیز انسان کو حیوان سے ارفع اور ممتاز کرتی ہے اس کے پاس بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ اسے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی جن میں دور تک اپنائیت ہی اپنائیت کے سمندر موجزن تھے۔ آج کی رات اسے زندگی کی بارے میں ایک نیا نظریہ دے گئی تھی۔ جذبوں کا استقلال-کردار کی بلندی-نصر کے ساتھ گزرا اس رات کا لمحہ لمحہ مکرم تھا۔ یہ بڑی واجب الاحترام رات تھی۔ اس نے زندگی کا یہ رخ پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ نصر کو اپنے روبرو کھڑا کر کے اس کے آگے تعظیم سے اپنا سر جھکا دے مگر حجاب مانع رہا اور گردن زیر بار رہی اس احسان کے بوجھ سے جو رات کی تنہائی اور تاریکی میں نصر نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ وہ اس رات کے پل پل کا امین تھا۔ اس قدر مضبوط قوت ارادی کا حامل ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اس غیر معمولی شخصیت کے وجود کو سلام کیا۔

مشرق کی جنم گاہوں سے نوزائیدہ سورج کی ننھی ننھی معصوم کرنیں اس کے چہرے پر غازہ بکھیر رہی تھیں۔ وہ جیپ کی فرنٹ سیٹ پر نصر کے برابر بیٹھی بدستور نصر کو دیکھے جا رہی تھی جو بڑے انہماک کے ساتھ سڑک پر نظریں جمائے جیپ ڈرائیور کرنے میں مصروف تھا۔

☆ ☆ ☆

اس ناول کے مطالعے کے بعد آپ کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات کے لئے ملاحظہ کیجئے:

محمد ظہیر بدر کا دوسرا ناول

محبتیں
ادھوری سی

(حصہ دوم)

زیرِ طبع

مقامِ دوست، مصطفےٰ ٹاؤن۔لاہور

مصنف کی دیگر کتب:

واصف علی واصف۔۔احوال و آثار
مردان کہسار۔۔صحرائے عرب میں

سرشت آدم ادھورے پن کی کہانی سناتی ہے۔ یہی زندگی کا تلذذ ہے۔ یہی وہ کشش ہے جو اسے جینے کا جواز فراہم کرتی ہے، یہی تجسس اسے پیش دیوار دیکھنے کے بجائے پس دیوار دیکھنے پر اکساتا ہے۔ اسے معلوم سے نامعلوم کے سفر پر روانہ کرتا ہے۔ وہ لمحۂ موجود کے بجائے لمحۂ آئندہ میں رعنائیاں تلاش کرتا ہے۔۔۔ وہ حسن رسا کے بجائے کرب نارسائی میں آسودگی تلاش کرتا ہے۔۔۔ انسان کی ہر سوچ اور ہر رشتہ۔۔۔ ہر جذبہ ادھورا ہے۔ کیونکہ وہ جزو ہے، کل نہیں

کہانی انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ آدم سے لے کر ظہیر بدر تک سب نے آپ بیتی اور جگ بیتی کے راستے پر چل کر اس فن کو بہتر سے بہترین کرنے کی کوشش کی۔ کچھ لکھنے والے کامیاب رہے کچھ سے بات نہ بنی لیکن کہانی کا فن نکھرتا رہا اور لکھنے والوں کے مشاہدات اسلوب کے ذریعے دلوں میں گھر کرتے رہے۔ ظہیر بدر کا ناول۔۔۔ محبتیں ادھوری سی۔۔۔ کہانی کہنے والے کا ایک ایسا شہر ہے۔ جس کا ہر مکین اپنے تجربے کے مکان کی چھت پر اپنے تجربے کا پرچم لیے کھڑا ہے۔ تجربہ مختلف ہے مگر نتیجہ ایک۔۔۔ ہر پرچم پر لکھا ہے۔ محبتیں ادھوری سی!!۔۔۔ ظہیر بدر کہانی کہنے کے فن سے واقف ہے۔ زبان و بیان پر اس کی گرفت مضبوط ہے۔ اسلوب سنجیدہ ہے۔ کرداروں کی سائیکی جانتا ہے۔ واقعات کی بنت ہنرمندی سے کرتا ہے۔ کسی سے متاثر نہیں۔ اس نے اپنا راستہ خود تلاش کیا ہے۔ اعتماد سے چل رہا ہے۔ راستہ طے کر رہا ہے۔ نہ تھکا ہے نہ سانس پھولی ہے۔۔۔ ایک اچھے اور کامیاب لکھاری کے لئے اور کیا خواص ہو سکتے ہیں۔ (احمد عقیل روبی)

یہ ادھوری محبتوں کی کہانی ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری قومی زندگی کے زوال کا نوحہ بھی ہے۔ ایسے اسلوب میں لکھا گیا نوحہ، جس میں متعین مطالب کہیں بھی سطروں سے [illegible] زمانی ترتیب آخر تک اپنی متعین درجے پر رہتی ہے۔ ہماری زندگیوں میں اہم حیثیت رکھنے والی محبت اور سیاست کو اس ناول میں بڑی ہوشیاری سے برتا گیا ہے۔ مجھے اپنا یہ [illegible] کر لینے دیجیے کہ صاحب ظہیر بدر کے اس ناول کو بہت قاری میسر آئیں گے۔ ([illegible])